مذاھب عالم
www.KitaboSunnat.com
احمد عبداللہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

# محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

## تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔


KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

# ترتیب

# مذہب کی حقیقت
# اور مذہبی تصورات کا ارتقاء

# مذہب کی حقیقت اور مذہبی تصورات کا ارتقاء

## مذہب کی تعریف

مذہب کی کوئی جامع و مانع تعریف مشکل ہے کیونکہ اس معاملے میں صرف یہی دِقت پیش نہیں کہ مذہب کے لازمی وظیفہ سے متعلق زندہ اور مردہ مذاہب عالم کا تصور مختلف رہا ہے جس میں کسی قدر مشترک کو وجود نہیں بلکہ اصلی دقت یہ ہے کہ مذہب کی کوئی آسان ترین تعریف بھی قبول کی جائے تو بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ چنانچہ (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS) کا مقالہ نگار اس کتھی کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:۔

اگر اے۔ بی ٹائلر (A.B.Tylor) کی مختصر ترین تعریف کو قبول کیا جائے جس کے مطابق:

''مذہب روحانی موجودات پر عقیدہ کا نام ہے''۔ تب بھی یہ تعریف ان موجودات کی ماہیت اور ہر ایک فرقہ کیلئے اس عقیدہ کی اصل اور جواز کے سوال کو پیدا کرتی ہے۔ (جلد اول ص ۶۶۳)

لیکن اس دقت کا ہرگز یہ نتیجہ نہیں ہونا چاہئے کہ مختلف مذاہب کی اصل حقیقت کی تلاش اور ان کے باہمی فرق و امتیاز کے مسئلہ سے دست برداری کر لی جائے۔

مذہب کی ایک یا متعدد تعریفوں کی دریافت میں اس حقیقت کے اعتراف سے کافی مدد ملے گی کہ مذاہب عالم نسلِ انسانی کی ارتقائی تاریخ کے نمائندہ ہیں اور وہ تمدنی اور سیاسی تاریخ کے مختلف مدارج کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے قدرتاً مذاہب کے

منصب کے بارے میں ان کا دائرہ عمل مختلف رہا ہے نتیجتاً معاشرہ پر ان کا اثر واقتدار بھی کم وبیش رہا ہے۔ اس واضح تاریخی صداقت کو پیش نظر رکھا جائے تو ہم ایک کے بجائے مذہب کی متعدد تعریفوں سے دو چار ہوتے ہیں، لیکن اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ مذاہب کے تعلق سے انسانی تاریخ کے مختلف فکری وتہذیبی ادوار کا واضح تصور قائم کر سکتے ہیں۔

'مذہبی زندگی کو عام طور تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، جن کو ہم ''عقیدہ'' ''خیال'' اور ''انکشاف'' کے دور کہہ سکتے ہیں (علم الیقین، حق الیقین، عین الیقین) پہلے دور میں مذہبی زندگی ایک نظم وضبط کے صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس کو فرد یا پوری قوم ایک غیر مشروط حکم کے طور پر بغیر اس کی آخری غایت کو پورے طور پر سمجھے ہوئے ماننے پر مجبور ہوتی ہے، طرز عمل کسی قوم کی معاشرتی اور سیاسی تاریخ میں زبردست اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے، لیکن جہاں تک فرد کے داخلی نشو ونما اور توسیع کا تعلق ہے یہ کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں، نظم وضبط کی مکمل پابندی کے بعد اس نظم وضبط کو معقول طور پر سمجھنے اور اس کے اقدار کو انتہائی ماخذ کو سمجھنے کا وقت آتا ہے۔ اس دور میں مذہبی زندگی اپنی بنیاد کو مابعد الطبیعات میں تلاش کرتی ہے یعنی عالم کے بارے میں ایک ایسا عقیدہ جو منطقی حیثیت سے ہم آہنگ ہو اور خدا کی ذات جس کا ایک جزو ہو، تیسرے دور میں مابعد الطبیعات کی جگہ نفسیات لے لیتی ہے اور مذہبی زندگی اس کی آرزومند ہو جاتی ہے کہ حقیقت ازلی وابدی سے بالراست دو چار ہو، اس نوبت پر مذہب زندگی اور طاقت کے شخصی انجذاب کا مسئلہ اور فرد ایک آزاد شخصیت کا مالک بن جاتا ہے جو قانون کی حدود اور جکڑ بندیوں سے آزادی کے نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ اپنے شعور کی انتہائی گہرائیوں میں قانون کے آخری ماخذ کے انکشاف کا نتیجہ ہوتا ہے جیسا کہ ایک صوفی کے الفاظ ہیں ''قرآن مجید کی یافت ممکن نہیں جب تک کہ وہ مومن پر اسی طرح منکشف نہ ہو جس طرح رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا تھا'' بنا بر آن مذہبی زندگی کی ترقی کے اس آخری

مرحلے کے معنوں میں مذہب کے لفظ کو میں اس سوال کے سلسلے میں استعمال کرتا ہوں جس کو اب پیش کرنا مقصود ہے''۔

## مذہب کا پہلا تصور

دنیا کے موجودہ اور سابقہ قدیم و ابتدائی مذاہب جن کو بت پرستی (PAGANISM) کہا جاتا ہے ان کے مذہبی عقائد و اعمال کے تجزیہ و تحلیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب دراصل مافوق الفطرت موجودات اور قوتوں کی پرستش کا دوسرا نام ہے۔ بت پرستی کا دور انسانی تاریخ میں سب سے (Reconstruction of Religions thought in Islam P-171) پہلا تمدنی دور ہے۔ جب کہ انسانی زندگی نہایت سادہ کے احتیاجات برائے نام اور اس کی ضروریات وافر اور بآسانی قابل حصول تھیں' اس لئے ان مادی احتیاجات کی بسہولت تکمیل کے بعد انسان کیلئے قلب و ذہن کی آسودگی کی خاطر کسی اعلیٰ تر ہستی کا فطری تخیل کافی تھا' جس کو وہ کائنات کے مختلف مظاہر میں دیکھتا یا ان کے پس پردہ محسوس کرتا تھا۔ یہ احساس انسانی فطرت کے تقاضے کے طور پر ایک اعلیٰ تر اور ازلی و ابدی ذات کے الٰہی تصور کا سرچشمہ بنا لیکن فکرِ انسانی کی ناپختگی اور خام کاری نے مظاہرِ قدرت کی کثرت کو بت پرستی کیلئے حجاب بنا دیا۔ چونکہ یہ دور اجتماعی و معاشی حیثیت سے جیسا کہ بیان ہوا ابتدائی دور تھا' اس لئے انسان عائلی اور خاندانی زندگی کے تنگ دائرہ میں محدود تھا۔ چنانچہ اس دور کے مذہبی تصور کا ایک ضروری اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ مذہب کا دائرۂ عمل اجتماعی زندگی کے حقوق و فرائض سے زیادہ مذہبی رسوم و عوائد (عبادات) تک محدود رہا' یہی وہ راز ہے کہ تمام ابتدائی مذاہب بت پرستی میں چند ایسے مذہبی عقائد و اعمال کی پابندی کافی سمجھی جاتی ہے جن کا کوئی گہرا اور راست تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس نقطۂ نظر سے مذہب کا یہ سب سے زیادہ محدود تصور ہے کیونکہ اس کا کوئی اثر انسان کے

ان اجتماعی اعمال وفرائض پر نہیں پڑ سکتا جو کسی معاشرے کے افراد کے باہمی برتاؤ کو نشان زد کرتے ہیں۔ اس دور میں بلا روک ٹوک جنگل کے قانون کا دور دورہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس دور میں ہر شخص اپنی ضروریات وخواہشات کی تشفی کیلئے حسبِ منشاء جبر وطاقت کے آزادانہ استعمال میں مختارِ کل تھا جس پر کسی ضابطے کی کوئی بندش نہ تھی' قدرتی قوانین یا اخلاقی قوانین کے ضابطے جو کبھی کبھی برتے جاتے تھے ان کی حیثیت حکمی قوانین سے زیادہ مصلحت بنی (EXPEDIENCY) کے ان اصولوں کی رعایت کی تھی جن کی خلاف ورزی کو انسان تحفظ ذات و جائیداد کیلئے صرف ایک خطرہ خیال کرتا تھا۔

## مذہب کا دوسرا تصور

بُت پرستی کی دوسری ترقی یافتہ صورت وہ ہے جب کہ اجتماعی حیثیت سے نسل انسانی نے کافی ترقی کی' عائلی زندگی نے آگے بڑھ کر قبائلی زندگی اور قبائلی زندگی نے مملکتوں کی صورت اختیار کی۔ اس دور میں انسان کی انفرادی زندگی نے پہلی دفعہ اجتماعی زندگی کے ایک جزو ترکیبی کی حیثیت اختیار کر لی' یعنی افراد اور قبائل نے معاشرہ کے ارکان کی حیثیت سے اپنے آپ کو اجتماعی فرائض و واجبات کا پابند دیکھا' اس متبدلہ اور ترقی یافتہ صورت حال کا مذہبی تصور پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ وہی بُت پرستی جو سابقہ دور میں صرف مذہبی رسومات وعوائد میں محدود تھی' اب منظّم معاشرہ کے نئے تقاضوں میں اجتماعی فرائض وحقوق کے بعض نظریات کو اپنانے پر مجبور ہوئی' اس طرح اس دور میں جو مذہب بنا وہ رسوم وعوائدِ مذہبی کے ساتھ مادی زندگی کی بعض ضروریات اور اجتماعی زندگی کے بعض حقوق وفرائض کے ساتھ مصالحت پر مجبور ہوا۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ان دو جداگانہ شعبوں میں یہ نیا تعلق متبدلہ حالات کا جبری نتیجہ تھا جس کو تاریخی ارتقاء کی پیداوار سمجھنا چاہیئے' نہ کہ کسی سوچی سمجھی ہوئی کوشش یا آسمانی ہدایت کا

نتیجۃً یہ انسان کی مذہبی اور اجتماعی زندگی کا بھی ایک غیر اختیاری امتزاج تھا' اس طرح اب مذہب کا جو تصور دنیا کے سامنے آیا وہ ابتدائی بت پرستی کی ایک ترقی یافتہ صورت تھی۔ مشرق کے تمام غیر الہامی مذاہب اسی کے نمائندہ ہیں۔ چاہے شنٹو مذہب ہو' اسلاف پرستی ہو' تاؤ مت ہو' کنفیوشی مت ہو' بدھ مت ہو یا ہندو مذہب۔ ان کے منجملہ تین مذاہب (ہندو مذہب' اسلاف پرست اور شنٹو مذہب) میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کے آغاز یا کسی ایک بانی' مذہب کا پتہ نہیں ملتا' نیز ان مذاہب کی تعلیمات کا مجموعہ دراصل ابتدائی بُت پرستی کی وہ ترقی یافتہ صورت ہے جو عہد بعہد کے تغیرات اور تقاضوں سے مل جل کر بنی ہے۔

دیگر منگولی مذاہب' تاؤ مت' کنفیوشی مت' اور بدھ مت کا حال دوسرے غیر الہامی مذاہب سے بے شک اس حد تک مختلف ہے کہ ان کے بانیوں کا پتہ چلتا ہے جو ایک ہی صدی میں ہوئے ہیں' لیکن ان کی تعلیمات پر غور کرنے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اپنے اپنے مذاہب کی مکمل و جامع ہدایت نہیں پیش کیں بلکہ انفرادی و اجتماعی شعبوں سے متعلق کچھ مخصوص نظریات پیش کئے جن کو وہ اپنے دور کر مروجہ مذہب بُت پرستی کا تکملہ سمجھتے تھے چنانچہ تاؤ مت کو مروجہ مذہب کے صرف اخلاقی پہلو سے بحث تھی اس لئے چند اخلاقی اصولوں پر زور دیکر مروجہ مذہب کو مکمل کر لیا گیا۔ کنفیوشی مذہب کو صرف نظم مملکت سے تعلق تھا' اس لئے حکیم کنفیوشس کی تعلیمات کا سارا زور اچھی حکومت اور نظم مملکت کے دائرہ میں محدود رہا اور اس شعبے کی اصلاح کے ذریعے انہوں نے بُت پرستی کو اپنے نئے اور مثالی معاشری کیلئے کافی سمجھا' جہاں تک شنٹو مذہب کی تعلیمات کا تعلق ہے اس کے بارے میں تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ کنفیوشی مت کی طرح جس سے وہ گہرے طور پر متاثر ہوا دراصل نظم مملکت اور سیاسی مرکزیت کے ان اصولوں کے ساتھ (جو شہنشاہ پرستی کی صورت میں نمایاں ہیں) بت پرستی کی

ایک متبدلہ اور انتہائی صورت ہے۔ چنانچہ جاپان کی ترقی یافتہ مملکت کے بارے میں (GORG ALLEN UNWIN LTD) نے ۱۹۳۹ء میں جو کتاب شائع کی اس کا نام ہی ''بُت پرست مملکت کا عروج'' (Rise of Pagan State) ہے۔

اب ہم ذیل میں چند اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے یہ بخوبی واضح ہو سکے گا کہ کس طرح یہ مذاہب بت پرستی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

ا۔ شنٹو مذہب کے بارے میں ٹوکیو کی شاہی یونیورسٹی کے ڈاکٹر کرنجی کاٹو جو برسوں تک شنٹو مذہب کے پروفیسر اور مستند ماہر رہے ہیں' کہتے ہیں:

''اگر ہم تاریخ کے وسیع ترین دور کو پیش نظر رکھیں تو شنٹو مذہب کے ارتقاء میں تین بڑے تہذیبی دوروں سے دوچار ہوتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جو فطرت پرستی یا ارواح پرستی کا ابتدائی دور ہے' دوسرا دور اعلیٰ فطرت پرستی کا دور ہے جس کو ہم متعدد دیوتاؤں کی پرستش کہہ سکتے ہیں' اور تیسرا دور شنٹو مذہب کا ترقی یافتہ دور ہے جس میں ''مظاہر کامی'' (KAMID BJEDTS) کے بارے میں عقیدہ اور عمل اوّل درجہ کے اخلاقی فکری اثرات کے تابع ہو گئے THE GREAT RELIGIONS OF THE MODERN WORLD (صفحہ ۱۵۴)۔

۲۔ ہندو مذہب کے بارے میں جان کلارک آرکر لکھتا ہے:

(ا) ہندو مذہب اپنے ابہام کے لحاظ سے عہد حجر کی ایک نشانی ہے' یہ اتنا قدیم ہے۔ (ص ۵۴)

(ب) ہندو مذہب کا کوئی بانی نہیں جو اس کو ایک بنیادی پیغام دے اس کا کوئی ابتدائی رہنما بھی نہیں جو زرتشت' حضرت مسیح یا حضرت محمد ﷺ کے

مقابلے میں پیش ہو سکے۔ THE GREAT RELIGIONS OF THE MODERN WORLD(صفحہ ۵۵)۔

۳۔ کنفیوشی مت کے بارے میں مقالہ نگار مذکورہ بالا کتاب کے صفحہ ۱۹ پر لکھتا ہے:

"کنفیوشی مذہب زبردست انہضامی اور انجذابی صلاحیت رکھتا ہے۔
اس ابتدائی مذہب سے ارتقاء ہوا اور اس نے خدا سے برتر و اعلیٰ شانگٹی اور قدرت، وطن بحیثیت خدا اور اسلاف پرستی کو قبول کر لیا"۔

۴۔ ٹاؤ مت کے بارے میں اسی کتاب کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

(ا) بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ٹاؤ مت کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ یہ پہلے سے چلا آرہا ہے جس میں لاؤتی نے ایک تنظیم پیدا کر کے مکمل کیا۔

(ب) "یہ مذہب دراصل اوہام اور جادو ٹونوں کا ایک انبار ہے" کہا جاتا ہے کہ لاؤتی خود عالم ارواح سے چیانگ ٹاؤلنگ کے پاس آیا اور اس کو ایک تلوار اور دیگر ہتھیار دیئے تاکہ وہ لوگوں سے جنوں کے اوپر قابو حاصل کر کے ٹاؤلنگ کے اسلاف پر نسلاً بعد نسل ان کے اسلاف کی روحیں منتقل ہوتی رہیں اور وہ اس کے اختیارات کے وارث ہیں"۔

یہی حال بدھ مذہب کا ہے جس کی تعلیمات بھی ٹاؤ مت کی طرح اخلاقی پہلو کی حد تک محدود اور بُت پرستی کا تتمہ ہے البتہ بدھ کی تعلیمات میں ٹاؤ مت کی اخلاقی تعلیمات کے مقابلے میں یہ فرق پایا جاتا ہے کہ ٹاؤ مت نظم مملکت یا سیاسی تنظیم کے اصول و مقاصد سے موافق یا مخالف کوئی بحث نہیں کرتا اور دلچسپی ظاہر نہیں کرتا، لیکن بدھ مذہب عملاً اس سے بیزاری اور بے تعلقی کا اظہار کرتا ہے اس پہلو میں وہ کنفیوشی مت اور شنٹو مت کا عین ضد ہے جن کا ہدف (TARGET) حکومت اور سیاست

ہے۔ اس طرح بدھ مت کی تعلیمات کا سارا زور اس پر رہا ہے کہ انسان خواہشات کو فنا کر کے اور وجود کو مٹا کر زندگی کے آلام و مصائب سے نجات حاصل کرے۔ اس لئے اصلاً بدھ مذہب بھی بت پرستی کے عقائد اور اعمال مذہبی کے قدیم چکر میں مبتلا رہا۔ اس نے کہیں بھی بت پرستی کے قدیم تصور کو باطل کہہ کر ٹھکرا نہیں دیا ہے۔

## مذہب کا تیسرا تصور

مذہب کا تیسرا تصور دراصل مذہب کا آریائی تصور ہے جس کا سب سے بڑا اور مکمل ترجمان ہندو مذہب ہے۔ یہ بھی ابتدائی بت پرستی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن اس میں دیگر مذاہب بت پرستی کے برخلاف ایک خاص پہلو پر غیر معمولی زور دیا گیا ہے اور یہ پہلو آریائی نسل پرستی ہے' اس معاملہ میں وہ اگرچہ موجودہ یہودی مذہب کے مماثل ہے جس میں بنی اسرائیل کے پسندیدہ امت ہونے کا تصور ہے' لیکن یہودیت کی بنیاد الہامی مذہب پر ہے' البتہ شنتو مذہب اس معاملہ میں ہندو مذہب کے مماثل ہے۔ بہر حال آریائی نسل کی برتری کا تصور ہندو مذہب کے عقیدہ کا مخصوص پہلو ہے جو اسکو دیگر منگولی مذاہب سے ممتاز بناتا ہے ورنہ ہندو مذہب تو کوئی معین مذہب بھی نہیں ہے۔ بلکہ ہر طرح کے افکار و عقائد کی بھول بھلیاں ہے۔ بہت سے لوگ ہندو عقیدے کی اس رنگا رنگی کی بناء پر جلد بازی سے یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ یہ ہندو مذہب کی منفرد خصوصیت ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے' یہ تمام غیر الہامی مذاہب کی ایک عام خصوصیت ہے چنانچہ چین کے مذاہب کے بارے میں سابقہ حکومت چین کی وزارت معلومات کا بیان یہ ہے:

> "چینی قوم کا بہت بڑا حصہ مذہب کے بارے میں مرنجاں مرنج اور رواداری واقع ہوا ہے چنانچہ ایک اوسط چینی اسلاف پرستی بھی کرے گا۔ بدھ مت کے رسوم میں بھی حصہ لے گا اور عیسائی عوائد کی بھی

پیروی کرے گا اور ایسا کرتے ہوئے اسے کوئی تضاد اور منافقت کا احساس نہ ہو گا"۔ (CHINA HAND BOOK صفحہ ۲۶)

یہی حال جاپان کے مذہب یعنی شنٹو مذہب کا ہے۔ جس کے بارے میں سر راس مسعود صاحب اپنی کتاب "جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق" میں لکھتے ہیں:

"کنفیوشس کے پند و نصائح اور بدھ مت کے عقائد غرض ان سب کے مخلوط ہو جانے سے مذہب میں وہ خلطِ مبحث پیدا ہو گیا ہے جو اس وقت جاپان میں جاری ہے رسوم عامہ میں شنٹو مذہب کے قاعدے برتے جاتے ہیں' مذہبی عقائد بدھ مت کے ہیں اور قوم کی اخلاقی زندگیاں تمام تر کنفیوشس کی تعلیم کی پابند ہے' اس حالت میں آج کل کے جاپانی قدیم کامی کی بھی عزت کرتے چلے آتے ہیں اور گوتم بدھ کی بھی مگر اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ یہ کون ہے اور وہ کون ہے"۔

اصل یہ ہے کہ ہندو قوم اپنے مغربی حریف یونانیوں کی طرح ایک عقلی قوم ہے جس نے فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی نظریات کو مذہب کا جامہ پہنا دیا ہے اور اس پردے میں اپنے نسلی اقتدار کا بندوبست کیا ہے۔

## مذہب کا چوتھا تصور

آریائی اور منگولی اقوام کے دائرے سے باہر مذاہب کا چوتھا گہوارہ مشرق وسطیٰ کا علاقہ رہا ہے' جو سامی اقوام کا مرزبوم اور تاریخی دائرہ اثر ہے۔ اس خطہ میں جو مذاہب (یہودیت' عیسائیت اور اسلام) پیدا ہوئے انہوں نے بت پرستی سے جداگانہ تصور مذہب پیش کیا جو سراسر انقلابی تھا کیونکہ یہ وحی والہام پر مبنی تھا' اس کے مضمرات پر ہم آگے مناسب مقام پر بحث کریں گے' لیکن یہاں اجمالاً اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ان

تینوں الہامی مذاہب کی تعلیمات میں انسان کی مادّی اور روحانی نیز انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بڑی حد تک ایک چوکھٹے میں بٹھایا گیا ہے اور اس طرح زندگی کے ضروری اور لازمی پہلوؤں کو پورے طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے' چنانچہ سب سے قدیم (یہودیت) میں حکمتِ کلیسی کی بنیاد نہ صرف توحید خالص پر ہے بلکہ تعلق باللہ اور تزکیہء اخلاق کے ان اصولوں کے علاوہ جو شریعت موسوی کا طرۂ امتیاز ہیں مساوی طور پر آزادی اور سیاست پر بھی زور دیا گیا ہے۔ مذہب کا یہی تصور بنیادی طور پر صرف اس فرق کے ساتھ عیسائیت میں بھی پایا جاتا ہے کہ اس میں انسان کی مذہبی اور سیاسی زندگی کو دو علیحدہ شعبوں میں تقسیم کر کے ان کو جداگانہ اقتدار اعلیٰ (پوپ و سیزر' یا حکومت و کلیسا) میں مرکوز کر دیا گیا۔ علیحدگی اختیارات کا یہ نظریہ جو عیسائیت میں داخل ہو گیا' کس حد تک انجیل کی تعلیمات میں تحریف کا نتیجہ ہے اور کس حد تک حضرت عیسیٰ کے زمانے یا بعد کے دور کے سیاسی اسباب کا نتیجہ ہے یا موجود الوقت بت پرست مذاہب سے اختلاط کا نتیجہ ہے اس پر بحث کا یہ موقع نہیں' اور اسی طرح اس بحث کا کوئی محل نہیں ہے کہ کس حد تک یہ نظریہ بالآخر جمہوریت کے اس نظریہ تفریق اختیارات (SEPARATION OF POWER) کی بنیاد بنا جو موجودہ مغربی نظریہ جمہوریت کی نمایاں علامت ہے۔ لیکن اتنی صراحت یہاں مناسب اور مفید ہو گی کہ عیسائیت کا اصلی نظریہ بھی بنیادی طور پر کسی طرح مذہب کے ایک ہمہ گیر اور جامع تصو کے خلاف نہ تھا کیونکہ وہ تفریق اختیارات کا حامی ہونے کے باوجود انسان کی دینی و دنیوی' انفرادی و اجتماعی زندگی کے ایک ہونے کا قائل ہے اور اسی طرح تثلیث کے باوجود ایک اعلیٰ تر ہستی کی برتر ہدایت سے انکار نہ کر سکا۔ الغرض عیسائیت کے بنیادی عقائد (تثلیث اور علیحدگی اختیارات) الہامی مذہب کے اس طاقتور اور ہمہ گیر تصور سے دبے ہوئے اور سہمے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو توحید کا تصور ہے۔

# مذہب کا پانچواں تصور

جہاں تک اسلام کے نظریہ دین کا تعلق ہے یہ بات سب پر روشن ہے کہ وہ مذہب کی جامع تر تعریف پیش کرتا ہے اس کے نزدیک دین ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو خدائے وحدہ لاشریک لہ کی طرف سے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ خدا کی کتاب (قرآن کریم) کی صورت میں دیا گیا ہے۔ جس میں زندگی کے مادی اور روحانی دونوں شعبوں سے متعلق مکمل اور واضح احکامات دیئے گئے ہیں۔ مذہب کے اس مکمل اور جامع نظریہ نے جس طرح مذاہبِ عالم کو متاثر کیا جس طرح انسانی قلوب میں جگہ پیدا کی اور جس طرح اس نے اپنے پیروؤں کو کشمکش حیات میں قوت عطا کی اس کا حال آپ اسلام کے باب میں پڑیں گے' لیکن یہاں ایک اہم نکتہ کی طرف اشارہ ضروری ہے تاکہ مذہب کے اس جامع عقیدہ کے قریبی پس منظر کو سمجھا جا سکے۔

# اسلام کا پس منظر

اسلام کا آغاز جس دور میں ہوا وہ نوع انسانی کے اجتماعی دور کا وہ نقطہ عروج ہے جس کو فکری اور عملی یا مذہبی یا سیاسی حیثیت سے عالم کا عہدِ شباب کہا جا سکتا ہے۔ مذہبی حیثیت سے دنیا کے تمام موجودہ بڑے مذاہب نہ صرف دنیا میں پیش ہو چکے تھے بلکہ وہ ربع مسکون کے بڑے حصے میں شائع اور مستحکم ہو گئے تھے۔ دنیا کی قدیم شاندار تہذیبوں کی صورت میں اپنے درجہ کمال کو پہنچ چکی تھیں۔ نیز اجتماعی زندگی کی عملداریوں سے آگے بڑھ کر بڑی بڑی شہنشاہیتوں' چالوکیہ' گپتا' رومی اور ایرانی شہنشاہیتوں کی صورت میں دنیا کے سامنے آ چکی تھیں' الغرض عظیم الشان مذاہب' زبردست تہذیبیں اور ان کی نمائندہ بڑی بڑی اور جہانگیر سلطنتیں حیات انسانی کے تمام ممکنہ پہلوؤں اور تقاضوں کے ساتھ برسرپیکار تھیں۔ ان عوامل سے جو ماحول پیدا ہو گیا

تھا ان سے دنیا میں وہ تمام طاقتور نظریات اور قوتیں برسرِ پیکار آ گئیں تھیں جو نسلِ انسانی کی قسمت کو سنوارنے یا بگاڑنے کا سامان کر رہی تھیں ان متضاد نظریات اور عوامل کی باہمی چپقلش بمصداق ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقان کا

نوعِ انسانی کی کامیابی اور ناکامی کے امکانات پیدا کر رہی تھی' اس عالم میں اسلام دنیا میں آیا۔

جب اپنی پوری جوانی پہ آ گئی دنیا    تو زندگی کیلئے آخری پیام آیا    (جوہر)

لیکن یہ آخری پیام صورتِ حال کا صرف فوری ردِعمل یا منفی علاج نہ تھا' بلکہ ایک فطری اور مثبت عقیدہ تھا جو صدیوں سے انقلابات عالم کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا۔

نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندہ کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا    اقبالؔ

## ایک نیا عنصر

عیسائیت کے نظریہ علیحدگی اختیارات کے بعد بھی اگرچہ سامی مذاہب کا جامع تر نظریہ دین بحیثیت مجموعی اپنی جگہ پر باقی رہا' لیکن اس نے آگے بڑھ کر حالیہ صدیوں میں ایسے تصورات کو طاقت بخشی جس نے اسلام کے جامع ترین نظریہ دین کی افادیت کو اجاگر کر دیا ہے۔

سترہویں صدی کے بعد عیسائی اقوام سیاسی و معاشی حیثیت سے دنیا پر غالب آ گئیں اور کلیسا کو (اسکی تنگ نظری اور رجعت پسندی کے باعث سہی) بالکل بے طاقت کر کے گوشہ نشین کر دیا گیا اور عملی و اجتماعی زندگی میں لادینیت (SECULARISM) کے فلسفہ کو حکمراں بنا دیا گیا اس سے گو مغرب کی عیسائی اقوام کو

اپنے متصادم مفادات کو ہم آہنگ بنانے اور کلیسا کی ارتجاعی طاقتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں مدد ملی اور اس کیلئے عالمی غلبہ اور استحصال کا راستہ صاف ہوا لیکن اس نے اور خصوصاً صنعتی ترقی نے ملک کی معیشت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالا جس نے طبقاتی مسئلہ کو پیدا کیا جس پر بے طاقت مذہب کو کوئی موثر قابو نہ ہو سکتا تھا۔ اس طبقاتی کشمکش نے بالآخر ایک نئے فلسفے اور مذہب (اشتراکیت) کو جنم دیا جو اب ہمارے زمانہ کی ایک عالمگیر اور قابل لحاظ قوت ہے' اگر ہم مذہب کی محدود اور روایاتی تعریف کے پابند نہ ہوں تو پھر یہ قرار دینا مشکل ہے کہ اشتراکیت بھی ایک مذہب نہیں ہے اگر بت پرستی اور اسلاف پرستی مذاہب ہیں' تاؤ مت' کنفیوشی مت اور شنٹو مت مذاہب ہیں؟ ہندو مذہب اور بدھ مت مذاہب ہیں اور اسی طرح الہامی مذاہب ہیں؟ تو ان کا قدر مشترک کیا ہے؟ خدا کا تصور یا مذاہب عالم کا کوئی مشترک تصور نہیں۔ مذہبی مراسم اور اعمال بھی مشترک کسوٹی نہیں' البتہ ان سب میں جو چیز مشترک ہے وہ صرف ایک ایسا غیر متزلزل اور ہمہ گیر اور مرکزی ایقان (ایمان) ہے جو انسان کے تمام میلانات اور رجحانات اور وظائف و اعمال کا سرچشمہ ہو۔ اگر یہ تعریف صحیح ہے تو جس طرح وہ ایک خدا کا تصور ہو سکتا ہے' متعدد خداؤں کا بھی ہو سکتا ہے اور سرے سے انکار خدا بھی۔ یہ اور بات ہے کہ خدا کا تصور ہی دراصل انسان کے انفرادی و اجتماعی مفادات کے باہمی تضاد کو دور کرتا ہے اور ان کے تصادم کو روک کر ان میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ لیکن ان میں عملی اور سائنٹفک حیثیت سے اس امر سے انکار مشکل ہے کہ مذہب سے مراد وہ عقیدہ اور ایقان نہیں جو انسانی اعمال کا سرچشمہ اور محرک ہو' بنا برآن اشتراکیت بھی کم از کم دہریت۔ بت پرستی' یا ہندو مذہب کی سطح پر ایک مذہب ہے۔ اس لئے کہ کمیونزم کا عقیدہ بھی اپنے پیرووں کو اسی طرح متحرک کرتا ہے جس طرح کوئی اور مذہب اپنے پیرووں کو اور جس طرح دیگر مذاہب کے پیرو اپنی زندگی کے ہر گونہ

معاملات کو اپنے مذہبی اصولوں کے تحت طے کرتے ہیں' اسی طرح ایک اشتراکی بھی اپنی زندگی کے مسائل کو حل کرتا ہے۔ ایک اشتراکی کا معیار حق و باطل بھی بنیادی طور پر کمیونزم کے مسلمات اور اقدار سے متعین ہوتا ہے۔ اس کے اندر بھی اپنے عقیدے کیلئے قربانی کا وہی جذبہ پایا جاتا ہے جو دوسرے مذاہب کے پیروؤں میں پایا جاتا ہے۔ یہ بالکل جداگانہ بحث ہے کہ کمیونزم کا عقیدہ اور فلسفہ غلط ہے' وہ باطل مذہب ہے' لیکن یہ تو ایک زندہ حقیقت ہے کہ اشتراکیت وسیع ترین اور لچکدار معنی میں اسی طرح ایک مذہب ہے جس طرح دنیا کے وہ دیگر مذاہب جو الہامی نہیں ہیں' چنانچہ مبصرین کی ایک جماعت کا خیال ہے: ''کمیونزم عقیدہ کو چھوڑ کر کچھ نہیں'' ہم نے کہیں اور بیان کیا ہے کہ فاسطیت اور نازیت کی خصوصیت فلسفہ کا فقدان ہے لیکن اب ہم یہ کہتے ہیں کہ کمیونزم کی خصوصیت فلسفہ سے معمور ہوتا ہے۔ ان تاریخی افکار و عقائد میں جنہوں نے نوع انسانی کو متاثر کیا ہے اشتراکیت اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ وہ ایسی حالت میں وجود میں آئی کہ وہ ایک معین عقیدہ سے مسلح ہے عقلی حیثیت سے قابل حجت ہے اور سرکاری طور پر سائع ہوا ہے۔(1)

## اشتراکیت لادینی فلسفہ کی پیداوار ہے

اشتراکیت جس سے مغرب لرزاں ہے اور مشرق کو ڈرایا جاتا ہے وہ لادینی فلسفہ اور علیحدگی اختیارات کے نظریہ کا منطقی نتیجہ ہے' اسلام کے سوا دنیا کے تمام مذاہب کم و بیش اس کے حامی و داعی رہے ہیں کہ حیات انسانی میں مذہب کا مقام اور اثر محدود ہو چنانچہ کنفیوشی مت اور شنٹو مت کو چھوڑ کر بقیہ مذاہب اس کو ایک نجی معاملہ سمجھتے رہے جو صرف تربیت نفس اور روحانی تسکین کا ذریعہ ہو۔ لیکن سیاسی طاقت کے در و بست سے اس طرح مذہب کو نکال باہر کرنے کے بعد مذہب کی افادیت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ موجودہ دور کی سب سے زیادہ نمایاں اور امتیازی صفت یہی ہے کہ انسانی

---

مذہب کی حقیقت

زندگی کا سب سے بڑا عامل اور موثر طاقت مملکت بن گئی ہے جس کا کلّیت پسندانہ اقتدار اس کے خلوت خانے اور باروچی خانہ تک میں داخل ہوگیا ہے۔ ان عام اور کلّیت پسند طاقت کے مقابلے میں مذہب کو بے دست و پا بنا دینا اس کے بچے کھچے اثر کو بھی ختم کر دیتا ہے اس لئے مذاہب عالم کی تعلیمات میں (باستثنائے اسلام) زندگی کو بانٹنے کے رجحان نے زندگی کو ہمہ جہتی اور صحت مند ارتقاء سے محروم اور مسلسل کشاکش کا شکار بنا دیا۔ اس کا عروجی نقطہ اشتراکیت ہے جس کے بعد سے مذہب اور سیاست کی دوعملی غیر معمولی طور پر نمایاں ہوگئی ہے جبکہ مشینی دور کے برکات نے خود انسان کو ایک مشین کی صورت میں بدل دیا ہے اور اس معاشی کشمکش کے تقاضے مذہب کے اس فرسودہ تخیل کو برداشت نہیں کر سکتے جو زندگی کے مادّی احتیاجات سے نہ صرف آنکھیں بند کر لیتا ہے بلکہ رجعت پسند اور استحصالی قوتوں کا معین و مددگار بن جاتا ہے۔ چنانچہ موجودہ صدی کے آغاز سے پہلے بھی اسی نوع کے حالات میں عیسائیت کے مروجہ نقطۂ نظر کے خلاف پروٹسٹنٹ مصلحین نے بغاوت کی اور قدیم مذہب کو پیچھے دھکیل کر اسکی جگہ لینی شروع کی۔ لیکن اس مستحسن اقدام میں جب انھوں نے علیحدگی کے اصول کو اپنایا تو رضا کارانہ طور پر زندگی کے مادّی احتیاجات کے دنیوی مسائل کو ایک متوازی طاقت (مملکت) کے حوالہ کرنے کی فاش غلطی کی جس کے بعد پھر عوام کی وابستگی کو غیر متزلزل طور پر وابستہ رکھنے میں ناکامی مقدر تھی۔ چنانچہ ٹائن بی اشتراکیت کے بارے میں لکھتا ہے۔

> ''روسیوں نے مغرب کے لادینی فلسفہ کو لیا اور مارکسیت بنا دیا' مارکسیت کو اگر آپ عیسائی بدعت کہیں تو صحیح ہوگا کیونکہ وہ عیسائیت کی کتاب سے پھاڑ کر لیا ہوا ایک ورق ہے جس کو پوری انجیل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ روسیوں نے اس مغربی مذہبی بدعت کو لیا اور اس کو اپنے نئے ڈھنگ سے نئے مذہب کے قالب میں ڈھال لیا

اور اس کو الٹا اب ہم پر تھوپ رہے ہیں۔ یہ مغرب کے خلاف جوابی
حملہ کی پہلی گولی ہے"۔(2)

اسی طرح اشتراکیت کے ردِ عمل میں جرمنی میں جو نازی تحریک پیدا ہوئی
اس کے بارے میں ایک مبصر کی رائے سنئے :-

"اگرچہ یہ الزام غلط ہے کہ رولف ہٹلر اور جرمن نازیت کیلئے اصلی
ذمہ داری لوتھر کے سر عائد ہوتی ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ جرمنی میں لوتھر
کے عقیدے کے مطابق سرکاری معاملات روایاتی بے تعلقی نے اس
ملک کے معاشرہ اور حکومت کیلئے یہ آسان کر دیا تھا کہ وہ عیسائیت کی
ہدایت و رہنمائی سے اپنے آپ کو آزاد کرے"۔(3)

بہر حال انسانی ترقی کے موجودہ دور میں صرف وہی مذہب کامیاب ہو سکتا
ہے جو انسان کی روحانی تسکین اور تربیت اخلاق کے ساتھ ساتھ اس کی اجتماعی زندگی
کے اصلی شعبے یعنی معاشی و سیاسی تنظیم کے منصب کو بھی درخور اعتنا سمجھ کر اس کا کافی اور
مناسب بندوبست کرے اور جب مذہب یہ کردار ادا نہ کر سکے تو اس کی ناکامی اور
اشتراکی کی نظریہ کا غلبہ یقینی ہے۔ مستقبل میں مذہب کی بقا کا دارومدار اس امر پر ہے کہ
وہ کس حد تک انسان کی متبدلہ زندگی کے تمام طبعی تقاضوں کو پیش نظر رکھتا اور ان کا
قابل عمل اور کارگر حل پیش کرتا ہے۔ ان میں باہمی اوّلیت اور ترجیح کا سوال تو صرف
ایک موقع شناسی (EXPENDENCY) مسئلہ ہے لیکن یہ بہر حال مقدم اور
ضروری ہے کہ انسانی زندگی کے مادی تقاضوں اور اجتماعی مسائل کو بھی مساوی طور پر
پیش نظر رکھا جائے ورنہ مستقبل کے تعلق سے دو متبادل صورتوں میں سے رہبانیت
خارج از بحث اور دین سے جدا سیاست (چنگیزی) یقینی ہے۔

مذاہب عالم کے مستقبل کو اسی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

# مذہب کی دیگر تقسیمیں

مذاہبِ عالم کی اس طرح بھی تقسیم کی جاسکتی ہے۔

(الف) الہامی اور غیر الہامی مذاہب

(ب) تبلیغی اور غیر تبلیغی مذاہب

(ج) جغرافی اور نسلی مذاہب

## (الف) الہامی اور غیر الہامی مذاہب

الہامی سے مراد وہ ادیان ہیں' جو خدا' اس کے رسولوں اور ان کے لائے ہوئے پیغامات اور کتابوں (صحف آسمانی) پر یقین رکھتے ہیں اس کے برخلاف غیر الہامی سے مراد وہ ہیں جو اپنی تعلیمات اور عقائد کو خدائے وحدہ لاشریک لہٗ کی معین ہدایت کے تابع نہیں سمجھتے' الہامی مذاہب میں یہودیت عیسائیت اور اسلام اور غیر الہامی میں بقیہ مذاہب داخل ہیں' الہامی مذاہب سامی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور غیر الہامی مذاہب کا (سوائے ابتدائی بت پرستی کے) جو الہامی مذاہب کے دائرہ اثر میں باقی نہیں رہی' سامی نسل سے کوئی تعلق نہیں۔ بہرحال ان دونوں کی بنیادی خصوصیات مختلف ہیں جو ذیل میں درج ہیں۔

### الہامی اور غیر الہامی مذاہب کی امتیازی خصوصیات

ا۔ الہامی مذاہب اصلاً ایک خدا کے تصور پر مبنی ہیں لیکن غیر الہامی اس کے پابند

نہیں، یہاں تک کہ بعض سرے سے خدا کے تصور سے بھی عاری ہیں۔

۲۔ الہامی مذاہب پیغمبروں کے قائل ہیں، غیر الہامی نہیں۔

۳۔ الہامی مذاہب کا اصل منبع و سرچشمہ کتب سماوی ہیں، غیر الہامی مذاہب میں یہ ضروری نہیں۔

۴۔ الہامی مذاہب سبھی مشرق وسطیٰ کے ایک محدود خطے میں پیدا ہوئے لیکن غیر الہامی اس کے باہر پیدا ہوئے۔

۵۔ الہامی مذاہب سامی اقوام کے تاریخی حلقہ اثر میں پیدا ہوئے لیکن باہر بھی پھیلے دیگر غیر الہامی اس کے باہر پیدا ہوئے اور کبھی الہامی مذاہب کے دائرہ اثر میں شائع نہیں ہوئے۔

۶۔ الہامی مذاہب اپنی تعلیمات یا عملی تاریخ کے باعث تبلیغی ہیں اور غیر الہامی اپنی اصلی تعلیمات کے مطابق تبلیغی نہیں۔

۷۔ الہامی مذہب کی تعلیمات معین اور واضح ہیں، لیکن غیر الہامی مذاہب کی تعلیمات غیر معین اور لچکدار ہیں۔

۸۔ الہامی مذاہب کی تعلیمات کلّی اور اپنی اصل کی بنا پر دینی اور دنیوی زندگی پر کم وبیش حاوی ہیں لیکن غیر الہامی مذاہب کی تعلیمات جزوی ہیں یعنی یا تو صرف روحانی زندگی سے متعلق ہیں مثلاً تاؤ مت، یا دنیوی زندگی سے متعلق مثلاً کنفیوشی مت۔

## مذہبی تعلیمات کی لچک اور اس کے مضمرات

الہامی مذاہب کے برخلاف غیر الہامی مذاہب کی تعلیمات میں لچک ایک ایسی مشترک خصوصیت ہے جس کے بکثرت شواہد آپ کو اگلے صفحات میں ملیں گے۔

ان کی یہ واضح موجودگی ان کی کسی مشترکہ علت کی تلاش پر مجبور کرتی ہے۔ غیر الہامی مذاہب کی لچک اور دیگر عقائد و نظریات کو اپنانے کے معاملے میں ان کے فیاضانہ نقطۂ نظر کی علت یہ ہے کہ ایک حکیم مطلق ذات کے بہتر اور صحیح تر انداز ے کے تحت عطا کئے ہوئے کسی جامع اور ہمہ گیر نظام زندگی سے محرومی کے باعث غیر الہامی مذاہب کے پیرو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کیلئے اپنے انفرادی تجربے اور شعور پر تکیہ کرنے پر مجبور ہیں اور یہ امر بدیہی طور پر ثابت ہے کہ افراد اور اقوام کا تجربہ اور شعور موقتی اور مقامی حالات کا تابع ہوتا ہے اس لئے جب کبھی ماحول تغیرات کا شکار ہوتا ہے تو تجربہ اور شعور بھی اس کی زد میں آ جاتے ہیں۔ ان تاریخی موثرات میں نئے اور طاقتور نظریات کا اہم مقام ہے اس لئے ان مذاہب کو ان کے سامنے جھک جانا یا ان سے مصالحت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے ان کا یہ عام رویہ فطری اور قابل فہم ہے کہ وہ اپنے قدیم اصولوں کے نقص یا کمی کو نئے اور بہتر اصولوں سے دور کریں۔ اس طرح ہمیشہ ان میں نئے اصول و نظریات دخل پاتے رہتے ہیں اور ان کے مزاج کو لچکدار و مصالحت پسند بناتے رہتے ہیں' اس خصوصیت کے باعث گو انہیں اپنے ماضی کے ورثہ سے کسی حد تک وابستہ رہنے اور نئے حالات کا ساتھ دینے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے' لیکن دو بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں' پہلی یہ کہ وہ سب بلا استثناء ابتدائی بت پرستی سے چمٹے رہے جو عزتِ نفس اور انسانی ارتقاء کے نقطۂ نظر سے بے حد ذلت آمیز اور رجعت پسند ہے۔ دوسری یہ کہ موقتی مصلحت کے رجحان کے تحت وہ کبھی بھی مذہب کو مستقل اور خود مکتفی نہ بنا سکے یہی دو بنیادی نقائص وہ ہیں جو غیر الہامی مذاہب کو نام نہاد رواداری بخشتے ہیں جو سیاسیات کی ایک خوبی سہی لیکن مذہب کی ایک مہلک کمزوری ہے۔ یہ جہاز کو بے لنگر کر دیتی ہے اور مسافروں کو موجوں کی بے رحم طغیانیوں کے حوالے کر دیتی

ہے لیکن عجیب تر بات یہ ہے کہ اس نام نہاد رواداری سے ایک دوسری نوعیت کا شدید تر تعصب پیدا ہوتا اور تنگ نظری پیدا ہوتی ہے کیونکہ زندگی کسی مضبوط چٹان کے بغیر جب ڈانوا ڈول ہو جاتی ہے تو مذہب کی محکم اساس سے محرومی کے باعث متبادل طور پر وہ کسی اور اساس کا سہارا لیتی اور اس سے اپنی وابستگی کو متعصبانہ طور پر ظاہر کرنے لگتی ہے۔ اس کی وضاحت کیلئے ہمیں فلسفی مورخ ٹائن بی کے حسب ذیل اقتباس سے بہتر اور کوئی سند نظر نہیں آتی۔

رواداری کا مفہوم "رواداری کا ادنیٰ ترین منفی محرک و غایت یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کی کوئی عملی اہمیت نہیں اس لئے اس سے کوئی بحث نہیں کہ ہمارے ہمسائے کس مذہب کے پیرو ہیں لیکن اس سے زیادہ منفی محرک و غایت یہ عقیدہ ہے کہ مذہب ایک فریب اور دھوکہ ہے یہ سوال ایک حماقت ہے کہ یہ مذہب صحیح ہے اور یہ غلط اور یہ سچا ہے اور وہ جھوٹا لیکن اس سے بھی زیادہ منفی محرک و غایت یہ خیال ہے جو زیادہ دانش مندانہ اور اس اصول کی پیداوار ہے کہ طاقت کا استعمال لازماً مقاومت کو اُبھارتا ہے اور خود حملہ آور پر الٹا اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ میری بلا اشتعال پہنچائی ہوئی پہلی ضرب کتنی ہی کارگر کیوں نہ ہو مجھے یہ یقین نہیں ہو سکتا کہ میرے ہمسائے سے مجھے اس کا ترکی بہ ترکی جواب نہ ملے گا جس کو بلا وجہ حملہ کر کے میں نے اپنا جانی دشمن بنا لیا ہے۔ ایک اور ادنیٰ ترین محرک و غایت اس اصول سے پیدا ہوتی ہے کہ مذہبی تنازعہ ایک امر باعث تکلیف عامہ (NUISANCE) ہے جو بآسانی ایک اجتماعی خطرہ بن جاتا ہے' اس لئے متحارب مذہبی جماعتوں کیلئے یہ بہتر ہوگا کہ وہ ایک دوسرے کو فنا کرنے کی کوشش کے ذریعہ امن شکنی کے بجائے مل جل کر بسر کریں اور دوسروں کو بھی زندہ رہنے دیں اور رواداری کے بارے میں یہ منفی محرکات اور غایات مغربی دنیا کے وہ مقبول محرکات و

غایات رہے ہیں جن کو مغربی دنیا نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی مذہبی لڑائیوں کی برائیوں کے خلاف رواداری کی صورت میں اختیار کیا۔ لیکن ہمارا مغربی تجربہ اس کا شاہد ہے کہ جو رواداری ایسے منفی محرکات کی پیداوار ہے وہ خطرناک ہے۔ جب تک ہم ان کے مقابلے میں اعلیٰ تر اور ایجابی محرکات و غایات اختیار نہ کریں گے اس امر کی کوئی ضمانت نہیں کہ عدم رواداری اپنا دوبارہ سر نہ اٹھا سکے گی۔ اگر عدم رواداری خود مذہب میں ظاہر نہ ہو تو پھر وہ مذہب کے بجائے کسی اور متبادل نفسیاتی شکل یعنی لادینی نظریہ حیات مثلاً قومیت' فاسطیت اور اشتراکیت میں دوبارہ ظاہر ہوگی۔(۱)

یہ تجزیہ پوری طور پر غیر الہامی مذاہب کی مجموعی تاریخ کی ترجمانی کرتا ہے۔ چنانچہ ماضی میں جو کچھ ہندو مذہب نے بدھ مذہب کے ساتھ اور حالیہ سالوں میں عیسائیت' سکھ مذہب' قبائلی مذاہب اور اسلام کے پیروؤں کے ساتھ کیا ہے' چین میں کنفیوسی مت نے تاؤ مت اور بدھ مت کے ساتھ اور اپنی باری میں تاؤ مت اور بدھ مت دونوں نے کنفیوشی مت کے ساتھ اور جو کچھ اس صدی کے اندر چین و جاپان میں عیسائیت کے ساتھ کیا گیا ان کی اگر بنیادیں تلاش کی جائیں تو وہ خالص مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور قومیت پسندی کا نتیجہ تھیں جن کو نام نہاد مذہبی رواداری کے ماحول سے ضروری قوت ملی۔

اسی سلسلہ میں علامہ اقبال مرحوم فرماتے ہیں:

"گبن کہتا ہے "ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں' ایک رواداری مورخ کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری مدبر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں'

ــــ کی حقیقت

ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر قسم کے فکر و عمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے۔ ایک رواداری کمزور آدمی کی ہوتی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کے محبوب اشخاص کی کی جاتی ہے برداشت کر لیتا ہے۔ ایک بات یہ ہے کہ اس قسم کی رواداری اخلاقی قدر سے معرّا ہوتی ہے اس کے برعکس اس سے اُس شخص کے روحانی افلاس کا اظہار ہوتا ہے جو ایسی رواداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ حقیقی رواداری عقلی و روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے دوسرے مذہب کو روا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ ایک سچا مسلمان اس قسم کی رواداری کی صلاحیت رکھتا ہے خود اس کا مذہب ائتلافی ہے اس لئے وہ آسانی سے دوسرے مذاہب کے ساتھ ہمدردی رکھ سکتا ہے اور اُن کی قدر کر سکتا ہے"۔(5)

## (ب) تبلیغی اور غیر تبلیغی مذاہب

مذاہب کی اس اصولی تقسیم کے بارے میں سر تھامس آرنالڈ اپنی کتاب "دعوت اسلام" میں لکھتے ہیں:

"پروفیسر میکسملر نے مسیحی مشنوں کی دعا کے جلسے میں جو دسمبر ۱۸۷۳ء میں ویسٹ منسٹر ایبی میں منعقد ہوا تھا لیکچر دیا' جب سے یہ ایک معمولی

بات ہوگئی ہے کہ دنیا کے چھ بڑے مذاہب تبلیغی اور غیر تبلیغی مذہبوں میں تقسیم کیئے جا سکتے ہیں۔ قسم آخر میں یہودی' براہمنی اور زردتشتی مذاہب داخل ہیں اور قسم اوّل میں بدھ مت' عیسائی مذہب اور اسلام شامل ہیں''۔(6)

لیکن یہ تقسیم قابل قبول نہیں کیونکہ اگر اس تقسیم کی بنیاد متعلقہ مذاہب کی تعلیمات ہیں تو یہ غلط ہے۔ بدھ مذہب اور انجیل کی اصلی تعلیمات کے مطابق یہ دونوں مذاہب تبلیغی نہیں چنانچہ شواہد ذیل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

## عیسائیت

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں خود انجیل کی شہادت یہ ہے:

عیسیٰؑ فرماتے ہیں کہ ''میں صرف بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی تلاش کیلئے آیا ہوں' غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور نہ سامریوں کے شہر میں داخل ہونا بلکہ پہلے بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی طرف جانا'' کنعان سے ایک عورت اپنی قوم کیلئے ہدایت طلب کرتی ہوئی مسیحؑ کی خدمت میں حاضر ہوتی ہے تو آپ انکار کرتے اور فرماتے ہیں کہ یہ ٹھیک نہیں کہ بچوں کے آگے کی روٹی لے کر کتوں کے آگے ڈال دی جائے''۔

## بدھ مت

بدھ مت کی تعلیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی بدھ مت تبلیغی نہ تھا' البتہ تیسری کونسل کے بعد مہاراجہ اشوک کے عہد میں جب بیرونی ممالک میں مشنری بھیجے

گئے تو پھر اس نے عملاً تبلیغی مذہب کی حیثیت اختیار کر لی اور اسی لحاظ سے اس کو تبلیغی مذہب سمجھا جانے لگا۔

الغرض عیسائیت کی ابتدائی تعلیم اور بدھ مت کی ابتدائی تاریخ کی رو سے یہ مذاہب تبلیغی نہیں کہے جا سکتے' لیکن اگر اس تقسیم کی بنیاد و متعلقہ مذاہب کی تعلیم اور ابتدائی تاریخ نہیں بلکہ پیروان مذاہب کا عملی زمانہ کارنامہ ہے تو پھر دنیا کے تمام مذاہب آج کل کم و بیش تبلیغی ہو گئے ہیں یہاں تک کہ ہندو مذہب بھی جو سب سے زیادہ علیحدگی پسند اور ذات پات (ورن آشرم) پر مبنی ہونے کے باعث اعلیٰ ذاتوں اور آریہ ورت (بھارت) تک محدود تھا اس میں بھی آریہ سماجی فرقہ کے ذریعہ تبلیغی رنگ پیدا ہو گیا ہے حالانکہ اصلی ہندو مذہب کی تعلیم کا رنگ یہ تھا۔

"گوتم کی کتاب "ادارے" کے بارھویں باب میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شودر ویدوں کو سن لے تو اس کے کان میں سیسا پگھلا کر ڈالنا چاہئے اور اگر وہ وید پڑھے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنا چاہئے اور اگر وہ ویدوں کو اپنے پاس رکھے تو اس کے جسم کے دو ٹکڑے کرنا چاہئے" "منو کی کتاب "ادارے" کے نویں باب کے آٹھویں اشلوک میں لکھا ہے کہ عورتیں کسی ویدک رسم وعبادت میں حصہ نہ لیں ان کا ایسا کرنا یا وید کے ساتھ ان کی دلچسپی دھرم کے خلاف ہوگا' اس لئے عورتیں شودر متصور ہوں گی اور وہ مذہب کے دائرہ سے خارج ہوں گی۔(7)

## نسلی اور جغرافی مذہب

نسلی حیثیت سے موجودہ مذاہب عالم تین نسلی گروہوں میں منقسم ہیں (۱) سامی (۲) آریائی (۳) منگولی' اور ان نسلوں کی آبادی کے لحاظ سے وہ مختلف جغرافی

خطوں میں پائے جاتے ہیں ان دونوں (نسلی وجغرافی) حیثیتوں سے ہم ذیل میں ان کا مختصر جائزہ لیں گے۔

## (ا) سامی مذاہب

ان میں اسلام، عیسائیت اور یہودیت داخل ہیں، لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ ان مذاہب اور خصوصاً اسلام کا عقیدہ صرف سامی نسل کے لوگوں تک محدود رہا یا سامی نسل کی برتری پر مبنی ہے کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے:-

(ا) مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔ انما المومنون اخوة (الحجرات ع پ ۲۷)

(۲) عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر فضیلت حاصل نہیں تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ (لیس للعربی فضل" علی العجمی ولا للعجمی فضل علی العربی کلکم ابناء آدم وآدم من تراب (سیرۃ النبی مصنف شبلی جلد دوم ص ۱۵۴ بحوالہ عقد الفرید طبع دوم۔)

(۳) ایہا الناس اسمعوا قولی واعقلوہ۔ تعلمن ان کل مسلم اخ المسلم وان المسلمین اخوة فلا یحل لا مراة من اخیہ الا ما اعطاہ عن طیب نفس منہ فلا تظلمن انفسکم (ترجمہ:- لوگو! میری بات سنو اور اس کو سمجھو، معلوم ہو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی اور مسلمان آپس میں بھائی ہیں کسی مسلمان کیلئے اپنے بھائی کی دی ہوئی شئے کے سوا کوئی چیز حلال نہیں جو خوشی سے دے تم اپنے نفسوں پر ظلم نہ کرو۔ (حیات محمد ہیکل ص ۴۷۴ مطبوعہ مصر ۱۳۵۴ھ)

اسلام کی تعلیم سامی نسل کی تخصیص یا برتری کے بجائے اصول مساوات کی

آئینہ دار ہے۔ اس لئے ان مذاہب کے سامی النسل ہونے کا منشا صرف اس قدر ہے کہ اس کا آغاز سامی اقوام میں ہوا اور نہ یہ تینوں سامی مذاہب آج عالمگیر اور دنیا کے ہر براعظم میں پائے جاتے ہیں اور ان میں سے عیسائیت اور اسلام دنیا کے ہر حصے میں آج بھی زبردست سیاسی طاقت ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال سے دنیا پر حکمراں ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی سے لے کر سترہویں صدی عیسوی تک یعنی تقریباً ایک ہزار سال تک مسلمان اس زمانہ کی معلوم دنیا پر حکمران رہے اور پچھلی تین صدیوں میں یہ اقتدار اگرچہ مسلمانوں سے چھین لیا گیا لیکن پھر بھی وہ سامی نسل کے ایک نمائندہ مذہب (عیسائیت) کے قبضہ میں رہا۔ اس طرح نسل انسانی کی تاریخ کے اہم اور بنیادی دَور میں صرف سامی نسل ہی دنیا کی قیادت کرتی رہی ہے۔ اس عالمی قیادت سے نیچے اتر کر بھی یہ بات نمایاں ہے کہ غیر سامی اقوام، سامی اقوام کے بر خلاف کبھی اپنے مرز بوم سے باہر نمایاں اور بااثر نہیں رہیں، مشرق وسطیٰ کے علاقے یا افریقہ، یورپ اور نئی دنیا کے کسی علاقے میں کبھی ان کی عملداری نہیں رہی۔ یہ ایک نہایت دلچسپ سوال ہے کہ سامی اقوام کی برتر سیاسی طاقت، تبلیغی اثر اور غیر سامی اقوام کی سیاسی کمزوری اور مقامی نوعیت میں کس حد تک متعلقہ مذاہب کی نظریاتی روح کو دخل ہے۔

## (ب) آریائی مذاہب

ان مذاہب میں ہندومت، جین مت، زردتشتی اور سکھ داخل ہیں، بعض لوگ بدھ مت مذہب کو بھی آریائی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ امر نزاعی ہے کیونکہ ساکھیا منی (گوتم بدھ) جس علاقہ کے رہنے والے تھے وہ تاریخی طور پر کبھی آریہ ورت کا حصہ نہیں رہا اور نہ اس علاقے کے لوگ آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ وہ منگولی نسل سے تعلق

رکھتے ہیں کیونکہ نیپال اور اس کا زیریں علاقہ سرحدی ہے۔ اس لئے آریائی نسل اور تہذیب کے اثرات بھی اس سنگم میں پائے جاتے ہیں لیکن نسلی اور ثقافتی و مذہبی حیثیت سے منگولی نسل اور چینی تہذیب وثقافت کے اثرات بھی آریائی ہونے کی تردید ہوتی ہے' لیکن اور بھی دیگر قوی قرائن اس کی تائید کرتے ہیں کہ بدھ مت آریائی نہیں بلکہ منگولی ہے چنانچہ بدھ مت کے موجودہ پیروؤں کی تعداد کا بیشتر حصہ منگولی نسل اور وطن سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح یہ محض کوئی اتفاق نہیں کہ بدھ مت' اپنی توسیع کے دور میں شمال میں بھوٹان و نیپال وتبت وچین میں اور مشرق میں جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک' برما' سیام' جزیرہ نمائے ملایا اور انڈو چائنا میں پھیلا جو منگول نسل کا علاقہ ہے۔ مغرب میں ایران کے بجائے (جو آریائی تھا) ممالک عربیہ کے بجائے (جو سامی تھے) وسطی ایشیا کے منگولی دائرہ اثر میں پھیلا' بہرحال قرینہ غالب ہے کہ بدھ مت آریائی نہیں بلکہ منگولی ہے۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ آریائی مذہب کے پیروں کی تعداد نہ صرف سامی مذہب سے کم ہے بلکہ منگولی مذہب سے بھی کم ہے لیکن اگر بدھ مت کو بھی آریائی قرار دیا جائے تب بھی وہ سامی اور منگول خاندان سے چھوٹا قرار پاتا ہے۔

## (ج) منگولی مذاہب

ان مذاہب میں کنفیوشی مت' تاؤ مت' اسلاف پرستی' شنتو مت اور اغلباً بدھ مت بھی داخل ہے یہ سب کے سب مذاہب آریائی مذاہب ہی کی طرح بت پرستی کی ترقی یافتہ اشکال ہیں اور باہم ایک دوسرے کا تتمہ وضمیمہ ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جس کا مجموعہ عقائد موجودہ دور کے معاشرہ کی ہمہ جہتی اور مکمل ضروریات کا کفیل ہو سکے۔ دراصل یہ سارے منگول مذاہب ایک خاندان مشترکہ ہے جس کا ابوالعائلہ یا منتظم خاندان کنفوشی مت اور جس کا مرشد یا روحانی گرو تاؤ مت ہے۔ ذیل کا شجرہ مذاہب کی تقسیموں کو ظاہر کرتا ہے۔

# شجرہ

الہامی / سامی
- یہودیت
- عیسائیت (تبلیغی)
- اسلام (تبلیغی)

غیر الہامی / غیر سامی
- منگول
  - کنفیوشی
  - تاؤمت
  - شنٹو
- آریائی
  - ہندو
  - جین
  - سکھ
  - زرتشتی
- دیگر
  - پارسی
  - بدھ مت (تبلیغی)
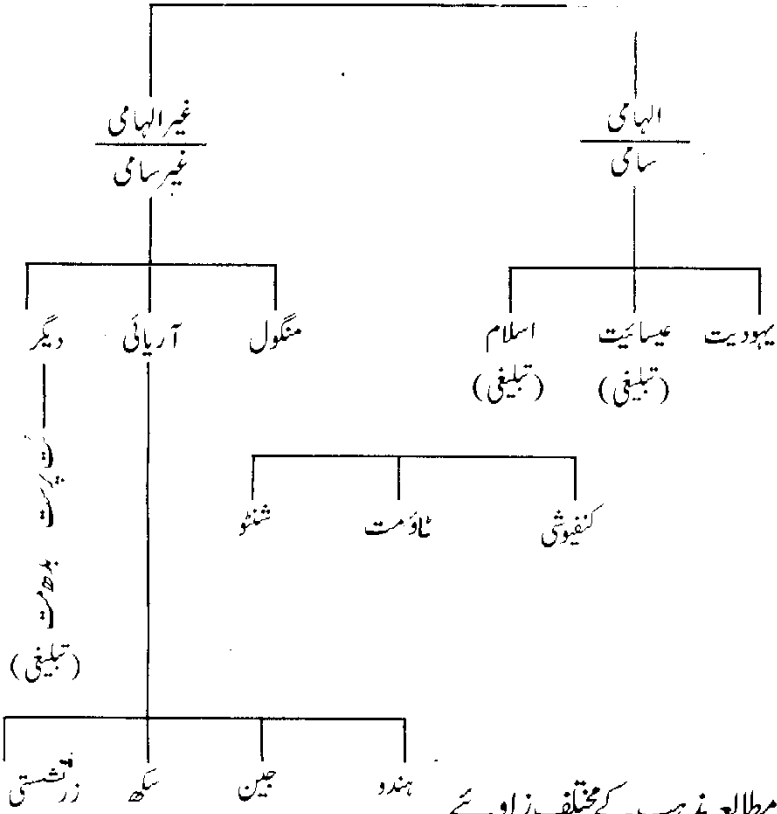
## مطالعہ مذہب کے مختلف زاویئے

مطالعہ مذہب کے مختلف طریقوں کے منجملہ چار اہم طریقوں کی نشاندہی کی جاتی ہے:

(۱) تقابلی (۲) تاریخی و معاشرتی (۳) نظریاتی (۴) اور نفسیاتی ۔ اور کہا جاتا ہے کہ

(۱) ”مذہب کا نتیجہ خیز طور پر اس طرح مطالعہ کیا جا سکتا ہے کہ اس مطالعہ میں ان

علاقوں کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، جغرافی، نیز دیگر خصوصیات کو پیشِ نظر رکھا جائے جہاں یہ مذاہب شائع ہوئے"۔(8)

یہ کتاب اسی نوع کے مطالعہ کی ترجمانی کرتی ہے اور اپنی نوعیت میں چاروں مقاصد کو فی الجملہ پورا کرتی ہے۔

## مذہب کی موجودہ طاقت

لادینی نظریہ اور لا خدائی فلسفہ کی اشاعت اور فروغ کے باوجود آج بھی مذہب دنیا میں ایک زبردست قوت ہے۔ اس کے خلاف زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب حیاتِ انسانی میں وہ آخری اور فیصلہ کن عنصر نہیں رہا، لیکن جماعتوں پر مذہب کی گرفت ہنوز اس حد تک باقی ہے کہ عہد حاضر کا سب سے بڑا فلسفی مورخ ٹائن بی کو اس کا اعتراف کرنا پڑا۔

وہ مشہور برطانوی مورّخ اور مصنف نے انسٹیٹیوٹ انٹرنیشنل افیرس کی زیر نگرانی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا کہ مذہب آج بھی (یعنی موجودہ جوہری دور میں) ایک نجات دہندہ ثابت ہو سکتا ہے جب کہ زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے علیحدہ شعبوں میں بانٹنے کی ساعی روز افزوں ہیں۔

ایک دوسرا مبصر کہتا ہے:

"اگر اقوام کے درمیان دوستی اور امن کو باقی رہنا ہے تو ضروری ہے کہ مذہب کا اقوام سے تعلق برقرار رکھا جائے، نہ صرف افراد سے اور نہ صرف ان کی شخصی نجات سے بلکہ بین الاقوامی قانون اور اخلاق سے بھی"۔

مذکورۂ بالا اقوال کی تائید مزید کے طور پر اتنا اضافہ کافی ہوگا کہ مشرق اور

مغرب میں بھارت' ترکی اور امریکہ کو لادینی نظریہ کا نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن ان ممالک کے موجودہ رجحانات کا حسبِ ذیل شواہد سے انداز ہو سکے گا۔

## بھارت

جمہوریہ بھارت کے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن ہندو مذہب اور فلسفہ کے نامی گرامی عالم ہیں اور اسی خصوصیت کے باعث ان کو قومی اسمبلی میں خاص طور پر منتخب کرایا گیا ہے ورنہ ملکی سیاسیات میں آزادی سے پہلے ان کا کوئی خاص مقام نہ تھا' اس چوٹی کے منصب پر فائز کر کے ان کو دنیا کے طول و عرض میں ہندو مذہب اور فلسفہ کی ترجمانی کے مشن پر بھیجا جاتا ہے۔ چنانچہ آج کل بھی وہ اسی نوع کے دورے پر ہیں جس کے دوران میں وہ ممالک متحدہ امریکہ میں ایک تقریر میں کہتے ہیں:

''ہندوستان میں مذہبی حکومت ہونی چاہیئے''۔

یادرفورتھ (دینی سلوڈانیا) یکم اپریل یہاں نائب صدر ہندوستان ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا ہے کہ موجودہ دنیا میں دو انتہائی باتیں باہم متضاد ہیں' ایک تو انسانی اتحاد کی خواہش اور دوسرے عدم رواداری اور خودغرضی کے رجحانات۔ فورڈ کالج میں گفتگو کے دوران انہوں نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ان کے ملک میں لادینی حکومت کا فقرہ استعمال کیا جائے کیونکہ مادی حکومت کا فلسفہ غیر درست ہے' اس سے بہتر ہے کہ اگر ہندوستانی حکومت مذہبی ہوتی تو اس میں ہمارے مذہب اور اعتقادات کو مادی حیثیت دی جاتی۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن تقریر کے بعد فوراً بولٹن روانہ ہوئے جہاں وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں تقریر کرنے والے ہیں انہوں نے کہا کہ جو صداقت سارے مذاہب میں موجود ہے وہ موجودہ تمدن کے مسائل کا کوئی نہ کوئی حل پیش کر سکتی ہے۔ انسان کا ذہن بلندتر سمت میں مائل کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ دنیا کا موجودہ تمدن سے بحران

نہ تو مادی ہے اور نہ خالص دینی ہے بلکہ روحانی ہے مذہبی زندگی کی حقیقت کو اصول پرستی کی سائنسی حماقتوں سے بالاتر بیان کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دراصل مذہب افراد کے تغیر ذات کا نام ہے اور اس طرح سارے سماجی۔ اور سیاسی نظاموں کے ساتھ رواداری اور مفاہمت حاصل کی جاتی ہے۔ (9)

## ترکی

جین پال روکس (Jean Paul Roux) ایک بیرونی عالم اپنے سفر ترکی کے تاثرات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"مذہبی روح ہر طرف نظر آتی ہے اور معقول طور پر اس کا یقین کیا جا سکتا ہے کہ آئندہ سالوں میں اسلام کی حالت میں اور زیادہ ترقی ہو گی"۔

جنگ کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نیا تغیر واقع ہو رہا ہے جو روز بروز قوی ہوتا جا رہا ہے۔ ڈیماکریٹک پارٹی کے مقابلے میں شکست کھا کر حکومت چھوڑنے سے پہلے بھی ریپبلکن پارٹی نے عوام کو مذہبی زندگی کی طرف واپس آنے کا راستہ دکھلا دیا تھا اور مذہب کی طرف واپسی ۱۹۵۱ء ہی میں ڈیماکریٹک پارٹی کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول بن گئی تھی۔ (صفحہ ۱۳ تا ۱۱۸ اسلامک ریویو۔ لندن)

The Islamic Review London September 1957.

## ممالک متحدہ امریکہ

دمشق کے مشہور ماہنامے "المسلمون" کے مدیر اپنے سفر امریکہ کے تاثرات کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''پادری صاحب نے بتایا کہ ماضی کے مقابلہ میں آج امریکہ زیادہ عیسائی ہے' گزشتہ جنگ کے بعد انجیل کے بیس لاکھ نسخے بکے ہیں' ہزاروں گرجا گھر بنے ہیں' واشنگٹن میں ہمارے گرجا گھر کی تنگی کے باعث دو وقت عبادت ہوتی ہے۔ چرچ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے صدر جمہوریہ پکے عیسائی ہیں جو پابندی عبادت ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے معتمد خارجہ مسٹر ڈلس بھی مذہبی آدمی ہیں چنانچہ دو ماہ قبل ان کی جو سوانح عمری چھپی ہے اس میں وہ کہتے ہیں۔ میں نے انجیل پڑھی ہے' اگر میں ژرف نگاہ سے اسکی تعلیم حاصل نہ کرتا تو میں طمانیت اور قوت کے اس چشمہ سے محروم رہتا۔ اسی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ مسٹر ڈلس ہر اتوار کو پاپیادہ تین میل چل کر گرجا جاتے ہیں اور جاتے ہوئے' نیز واپسی میں وہ دعائیں پڑھتے رہتے ہیں۔(10)

## موجودہ صدی کے مذہبی تغیرات

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے موجودہ صدی کے ان تغیرات پر طائرانہ نظر ڈالنا مفید ہوگا جو مذاہب عالم کی عام اجتماعی حالت میں پیش آئے ہیں:

پچھلی صدی کے اختتام اور موجودہ صدی کے آغاز پر یورپی مصنفین کے اندازے کے مطابق عیسائیت کے بعد اسلام کا درجہ تھا۔ اس کے بعد (بربنائے غلط فہمی) بدھ مت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد کی عددی ترتیب کا ٹھیک اندازہ نہیں ہو سکتا لیکن 1951ء کے مستند اعداد کی رو سے عیسائیت اور اسلام اپنے سابقہ مقام کو بچانے میں کامیاب رہے ہیں۔ تیسرے درجہ پر بدھ مت کے بجائے اب کنفیوشی مت' چوتھے درجے پر ہندو مذہب اور پانچویں درجہ پر بُت پرست' چھٹے درجہ پر بدھ مت' ساتویں درجہ پر شنتومت اور تاؤمت آٹھویں درجہ پر یہودیت' نویں درجہ پر سکھ مذہب' دسویں

درجہ پر جین مت اور گیارہویں اور آخری درجہ پر زرتشتی (پارسی) ہیں۔

## تبدیلی کے نتائج

اس تبدیلی کے نتائج اجمالاً حسب ذیل ہیں:

۱۔ ابتدائی اور قدیم مذہب بت پرستی میں مسلسل تنزل رونما ہے۔ یہ ان کی سیاسی محکومی اور نظریاتی کمزوری کا ملا جلا نتیجہ ہے۔ یہی حال ہندو مذہب کا ہے جس میں آزادی ہند سے پہلے کے زمانے کے ہر عشرہ (decade) میں مسلسل کمی ہوتی رہی ہے۔

۲۔ تاؤ مت اور یہودی مذہب کی آبادی میں تدریجی اضافے کے مدنظر کسی قابل لحاظ اضافے کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ ان مذاہب کی سیاسی محکومی کا اغلباً نتیجہ ہے اور یہودیوں کی حد تک تو ان کی شدید علیحدگی پسندی کا ردِعمل ہے جو وقتاً فوقتاً مغرب میں ظاہر ہوتا رہا اور جس کی جدید ترین مثال نازی جرمنی کا عہد ہے۔

## مذاہب کی سیاسی حیثیت میں تغیرات

جیسا کہ اوپر بیان ہوا اس تبدیلی کا ایک بڑا کارفرما عنصر مذاہب کی سیاسی حیثیت رہی ہے اس لئے مذاہب کی سیاسی حیثیت میں تبدیلیوں کا حال بھی دیکھتے چلیں۔

عیسائیت اس صدی کے آغاز کی طرح گو آج بھی ایک غالب قوت ہے لیکن اس کی سابقہ طاقت میں دو اہم تغیرات ہوئے ہیں جن میں سے پہلا تغیر یہ ہے کہ مغربی استعمار کے زوال کے نتیجے میں اب دیگر مذاہب کے پیروؤں پر سے عیسائی اقوام کا اقتدار تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ دوسرا تغیر کمیونزم کا سیاسی اقتدار ہے۔ ۱۹۱۷ء کے روسی

انقلاب کے نتیجے میں پورا روس جس کا پچھتر فیصد عیسائی تھا کمیونزم کے کلیت پسند اور آمرانہ نظام کے ماتحت ہو گیا اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد تو مشرقی یورپ کا پورا علاقہ پولینڈ، مشرقی جرمنی، ہنگری، چیکوسلواکیا، یوگوسلاویا، البانیہ، رومانیہ اور بلغاریہ کا ملاً اسکی گرفت میں آ گیا اور اس طرح تقریباً ۳۵ کروڑ کے قریب عیسائی تھے ایک لا خدائی فلسفہ اور اقتدار کے ماتحت ہے۔ اب اس کے نصف سے زائد حصے کو ان نظام کے تحت بسر کرتے ہوئے چالیس سال گزر چکے ہیں جب کہ ایک پوری نسل اس عقیدہ کے تحت پل کر جوان اور ادھیڑ ہو چکی ہے اس لئے یہ اگر بغایت مشتبہ اور غیر یقینی ہے کہ یہ اب آسمانی بادشاہت پر یقین رکھتی ہے، لیکن یہ یاد رہے کہ اشتراکیت کا یہ عروج ٹائن بی کے الفاظ میں عیسائیت کے خلاف جوابی حملے کی پہلی گولی ہے۔

ان دو تغیرات کے عملی نتائج یہ ہیں کہ مغربی استعمار کے انتہائی عروج (۱۹۲۰ء) کے مقابلے میں جبکہ غیر عیسائی کے پیروؤں کی تقریباً نوے کروڑ آبادی اس کے ماتحت تھی، اب تیرہ کروڑ کے قریب رہ گئی ہے جس کا نصف سے زائد حصہ بت پرستوں پر مشتمل ہے، دوسری طرف مغربی عیسائیوں کی بڑی تعداد جو عیسائی عالمی آبادی کا (۳۵) فیصد ہے اب کمیونزم کے قابو میں ہے۔ اس طرح اب عیسائیت کے اندر داخلی و خارجی کمزوریوں نے سر اٹھایا ہے۔

ہندو مذہب اب آزاد ہے، بدھ مت کے ممالک نیپال، سیلون، برما اور انڈو چائنا بھی آزاد ہیں لیکن اسکو نقصان بھی پہنچا ہے کیونکہ تبت اور شمالی ویت نام اب اشتراکی عمل دخل کے تابع ہیں۔ سکھ برطانوی اقتدار کے ختم ہونے کے باوجود (ہندوؤں اور مسلمانوں کے برخلاف) بہتر حالت میں ہیں کہے جا سکتے کیونکہ تقسیم کے بعد ان کی سیاسی اور فوجی حیثیت گھٹا دی گئی اور ان کو ہندو بنانے کی منظم کوششیں زور شور

سے جاری ہیں۔

یہودی اس صدی کے آغاز کے مقابلے میں بہتر نہیں کہے جا سکتے کیونکہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ان کی تعداد نازی دور میں کافی گھٹ گئی ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کا قیام بظاہر ان کی سیاسی کامیابی نظر آتی ہے لیکن اس کی بقا مشتبہ ہے جیسا کہ یہودیت کے باب میں آپ پڑھیں گے' اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی سیاسی حالت نسبتاً بہتر ہے۔

کنفیوشی مت اور تاؤ مت اب بالکلیہ کمیونسٹ اقتدار کے زیر نگین ہیں اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صدی کے سیاسی تغیر کا سب سے بڑا نشانہ یہی دو منگولی مذاہب ہیں۔ ان مذاہب کی تاریخ میں بدھ مذہب کے حملے کے بعد یہ دوسرا ابھرپور وار ہے جو ایک بیرونی فلسفہ اور تصور حیات نے ان پر کیا ہے۔

شنتو مذہب کی حالت اپنے ہمسایہ مذاہب (کنفیوشی مت' تاؤ مت' بدھ مت اور بُت پرستی) سے بہتر ہے لیکن سابقہ حالت سے بہتر نہیں' اس صدی کے آغاز پر عیسائیت کے بعد سیاسی حیثیت سے سب سے زیادہ با اثر شنتو تھا جو جاپان کے تجارتی' صنعتی اور سیاسی و فوجی عروج کا نتیجہ تھا' لیکن دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں شکست کے باعث اس کو زبردست دھکا لگا تھا لیکن بین الاقوامی سیاست کی رقابتوں اور پیچیدگیوں کے سہارے اب وہ جرمنی کی طرح دوبارہ سنبھالا لے کر اپنے سابقہ اثر اور سیاسی قوت کو بحال کرنے کی فکر میں ہے۔ ان وجوہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شنتو مت کے پیرو باوجود آزاد و خود مختار ہونے کے اس صدی کے آغاز کے مقابلے میں بہتر نہیں ہیں خصوصاً جبکہ اس کے پڑوس میں چین نے غیر معمولی طاقت و اہمیت حاصل کر لی ہے اور جو اس کا تاریخی حریف ہے۔ مسلمانوں کی حد تک ان کی موجودہ حالت اس صدی کے

آغاز کے مقابلے میں روشن ہے کیونکہ ان کے اکثریتی علاقوں کا اسی فیصد سے زائد حصہ اب آزاد ہو چکا ہے، لیکن یہ زیادہ تر مغربی استعمار کے زوال کا نتیجہ ہے لیکن جہاں تک اشتراکی یا مشرقی استعمار کا تعلق ہے ابھی تک تقریباً آٹھ کروڑ آبادی کے مسلم ممالک ان کے محکوم ہیں بقیہ نو آزاد ممالک بھی اس نئے استعمار کی ہوس سے محفوظ نہیں اس خطرے کے مد نظر یہ امر تسلی بخش ہے کہ دنیا کے تمام موجودہ بڑے مذاہب کے مقابلے میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کے پیرو ابھی تک رضا کارانہ طور پر اپنی پسند سے اشتراکیت کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوئے ہیں جو ان کی نظریاتی قوت کی کھلی اور ناقابل تردید نشانی ہے لیکن اس بارے میں مغربی مفکرین ایک دلچسپ اور انوکھی رائے کے حامل ہیں۔

"بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ اسلام کمیونزم کے خلاف ایک تحفظ کا حقیقی ذریعہ ہے لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ اسلام انسانی مساوات کا حامی ہے، سود کی ممانعت کرتا ہے اور عدل معاشرہ کا مطالبہ کرتا ہے بجز وجود باری تعالیٰ کے اقرار کے اسلام کا عقیدہ ایسا ہے کہ اس کا نظریہ کمیونسٹوں کے نظریہ سے زیادہ مختلف نہیں اگر اشتراکیت اپنے الحاد میں ترمیم کر لے تو پھر مسلمانوں کی اس سے بیزاری بڑی حد تک دور ہو جائے گی"۔(11)

# ISLAM

# اسلام

سامی النسل مذہب میں تیسرا اہم اور آخری مذہب اسلام ہے' بنیادی طور پر اسلام یہودیت اور عیسائیت کا ہی ایک سلسلہ ہے جس کی وجہ سے اسے دین ابراہیمی کہا گیا ہے ابتداء سے ہی اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے۔ مگر اس کی تبلیغ کسی خاص گروہ یا قبیلہ کیلئے محدود نہیں رہی بلکہ اس کی تعلیمات انسانیت کیلئے مشعل راہ ہیں جس سے ہر شخص مستفید ہوسکتا ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی ہی میں اسلام تمام عرب میں پھیل گیا تھا اور سو سال کے اندر اسلام کے اثرات عرب کے ہمسایہ ممالک میں افریقہ کی ساحلی ریاستوں اور اسپین تک میں قائم ہو گئے تھے مسلمان سیاسی اور تمدنی لحاظ سے دنیا کی سب سے اہم قوم بن گئے تھے اور صدیوں تک وہ ایشیا افریقہ اور یورپ میں تہذیب و تمدن کی قیادت کرتے رہے۔

## پیغمبرِ اسلام کی زندگی کے حالات

پیغمبرِ اسلام عرب کے مشہور قبیلہ بنو ہاشم میں ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے آپ کی پیدائش کے وقت ساری دنیا میں تاریکی اور جاہلیت کا دور دورہ تھا۔ خاص طور پر عرب کی سیاسی مذہبی' اقتصادی اور معاشرتی حالت بہت خراب تھی۔ سیاسی طور پر عرب مختلف قبائل میں منقسم تھے اور کوئی مرکزی حکومت موجود نہ تھی' ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد اور خود مختار تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر قبائلی جنگوں کا سلسلہ سالوں چلتا رہتا تھا۔ مذہبی اعتبار سے عرب زیادہ تر بُت پرست تھے' حالانکہ ستارہ پرستی' توہم پرستی اور عناصر قدرت کی پرستش

بھی عام تھی' مذہبی لحاظ سے مکہ کو مرکزیت حاصل تھی' کیونکہ یہیں حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کردہ خانہ کعبہ موجود تھا' مگر اب اس میں خدائے واحد کی عبادت کی جگہ تین سو ساٹھ بتوں کی عبادت کی جاتی تھی' جو عربوں کے سیاسی اور مذہبی اختلافات کا واحد ثبوت تھے' عربوں کی اقتصادی اور معاشرتی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی' وہ عام طور پر خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے' حالانکہ کچھ قبائل کا پیشہ تجارت بھی تھا مگر مجموعی طور پر عرب ایک مفلس اور نادار قوم تھے' معاشرے میں ہر طرح کی برائیاں پائی جاتی تھیں عورتوں کی کوئی عزت نہ تھی' بعض قبائل میں لڑکیوں کو زندہ ہوتے ہی دفن کر دیا جاتا تھا اور عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھنے پر فخر کیا جاتا تھا۔ شراب نوشی اور جواء کھیلنے کا رواج تھا۔ ان ہی سب خرابیوں کی وجہ سے اس زمانے کو قرآن شریف میں ''زمانہ جاہلیت'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام کی پیدائش سے پہلے ہی آپ کی والد کی وفات ہو گئی تھی اور چھ برس کی عمر میں ماں کا سایہ بھی اُٹھ گیا' چنانچہ آپ کی پرورش کی ذمہ داری آپ کے دادا اور بعد میں چچا ابو طالب کے سپرد ہوئی۔ آپ کی ایمانداری کی وجہ سے آپ کو ''امین'' کہا جاتا تھا۔ آپ کی ایمانداری کی وجہ سے مکہ کی ایک دولت مند بیوہ بی بی خدیجہ نے آپ کے ساتھ شادی کر لی جو آپ سے عمر میں پندرہ سال بڑی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا آپ کا زیادہ وقت عبادت میں گذرنے لگا یہاں تک کہ غار حرا میں کچھ دنوں کے لئے کھانے پینے کا سامان لیکر چلے جاتے اور وہاں غور و فکر میں مشغول رہتے آپ نے شروع ہی سے کبھی بتوں کو سجدہ نہ کیا تھا اب آپ اسی الجھن میں گرفتار رہتے کہ کائنات کا خالق کون ہے اور اس کی پرستش کس طرح صحیح طریقہ پر کی جا سکتی ہے ایک دن جب آپ اسی طرح غور و فکر میں مشغول تھے تو حضرت جبریلؑ آپ کے پاس خدا کا پیغام لے کر آئے اور آپ کو مژدہ سنایا کہ خدا نے آپ کو پیغمبر آخر الزماں مقرر کیا ہے

اور ساری دنیا کی رہبری کا کام آپ کے سپرد کیا ہے اس طرح آپ کو نبوت کا درجہ عطا ہوا اور ایک نئے مذہب جس کا نام اسلام (خدا کی مرضی کا پابند ہو جانا) رکھا گیا اور اس کی اشاعت کی ذمہ داری آپ کے سپرد ہوئی۔

مذہب اسلام عرب کے دیرینہ عقائد سے چونکہ بالکل مختلف تھا اس لئے ہر شخص نے اس کی مخالفت کو اپنا فرض سمجھا اور پیغمبر اسلام پر طرح طرح کے مظالم شروع کیے۔ ابتداء میں اس سے صرف چند ہی لوگ متاثر ہوئے مگر ان کے عقائد کی پختگی نے ہر مخالفت کا سامنا کیا جس نے دوسروں پر بھی اسلام کی حقانیت کو واضح کر دیا تھا قریش مکہ کی زیادتیوں سے تنگ آ کر آپ نے مکہ کے باہر بھی تبلیغ شروع کی۔ طائف کا سفر کیا جو ناکام رہا۔ مگر حج کے زمانہ میں جو تبلیغ مدینہ سے آئے ہوئے قبائل میں کی گئی وہ کامیاب ہوئی اور اسلام جلد ہی مدینہ کی سرزمین میں پھلنے پھولنے لگا۔ حالات سازگار دیکھ کر آپ بھی معہ مسلمانوں کے مدینہ ہجرت کر گئے۔ جہاں سے اسلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے' کیونکہ ہجرت کے بعد ہی اسلام کی ترقی نہایت تیزی سے ہوئی اور دس سال کے اندر اندر اسلام کو تمام عرب قبائل نے قبول کر لیا۔ اسلام کی یہ ترقی ایک حد تک مخالفت کا نتیجہ تھی کیونکہ ہر جنگ کے بعد اسلام مٹنے کے بجائے زیادہ پھیلتا تھا۔ قریش مکہ سے ۲ھ سے لیکر ۸ھ تک جنگوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ جس میں اہم جنگیں بدر' احد اور خندق ہیں' ان جنگوں نے اسلام کی طاقت کو بجائے ختم کرنے کے اور زیادہ ترقی کرنے کے مواقع فراہم کیے' کیونکہ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات اچھی طرح آ گئی کہ اگر خدا کی مدد مسلمانوں کے شامل حال نہ ہوتی تو وہ ہرگز اپنے سے کئی گنا زیادہ فوجوں کا مقابلہ نہ کر پاتے یہاں تک کہ ۸ھ ہجری میں خود مکہ فتح ہو گیا۔ جس کے بعد عرب قبائل کے علاوہ' تبلیغی خطوط آنخضرت ﷺ نے ایران روم مصر اور حبش وغیرہ کے بادشاہوں کے نام بھیجے جن سے کافی قومیں متاثر ہوئیں' رسول خدا کی بعثت کا کام اب ختم ہو چکا تھا چنانچہ آپ ۱۱ھ میں خدا سے جا ملے۔

---

اسلام

# اسلامی تعلیمات

پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی رو سے مندرجہ ذیل عقائد پر ہر مسلمان کیلئے ایمان رکھنا ضروری ہے۔ بغیر اس کے کوئی بھی شخص مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

۱۔ خدائے واحد پر ایمان لانا اور اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہ سمجھنا۔

۲۔ خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں پر ایمان لانا اور رسول خدا کو پیغمبر آخرالزماں سمجھنا۔

۳۔ آسمانی کتابوں پر ایمان لانا اور قرآن مجید کو خدا کا آخری کلام جاننا۔

۴۔ خدا کے فرشتوں کے وجود پر یقین رکھنا۔

۵۔ روز جزا اور آخرت پر ایمان لانا' جب ہر انسان کے اعمال کے مطابق اس کو سزا یا جزا دی جائے گی۔

یہ تھے وہ احکام خداوندی پر یقین رکھنے اور عمل پیرا ہونے سے کوئی بھی اسلام کے دائرے میں داخل ہو سکتا تھا۔ اسلام کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ نماز

خداوندکریم کی عبادت دن میں پانچ وقت ہر مسلمان پر فرض کی گئی۔

۲۔ روزہ

رمضان کے مہینے میں پورے ماہ کے روزے ہر صحت مند مسلمان پر فرض کئے گئے تاکہ صفائی قلب ہو سکے اور دولت مند غریبوں اور فاقہ زدوں کے صبر و سکون سے سبق حاصل کر سکیں اور ان کی مدد کریں۔

۳۔ زکوۃ

ہر ذی حیثیت مسلمان پر اس کی سال بھر کی بچت پر ڈھائی فیصدی کے حساب سے زکوۃ مقرر ہوئی تاکہ دولت کی تقسیم ہو سکے اور سرمایہ ایک جگہ جمع نہ ہو جائے۔

۴۔ حج

ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک مرتبہ حج بیت اللہ کرنا فرض ہے تاکہ وہ سنت ابراہیمی ادا کر سکے' اسلامی اخوت میں عملی طور پر شریک ہو سکے اور خدا کے گھر پہنچ کر خالق سے روحانی تعلق قائم کر سکے۔

۵۔ جہاد

خدا کی عظمت قائم کرنے کیلئے دشمنان اسلام سے جنگ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کرنا بھی ہر مسلمان پر فرض ہے۔

ان فرائض کے ادا کرنے کے علاوہ مسلمان کو قرآن مجید کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے جن کا خلاصہ یہ ہے۔ "اچھائی کو پھیلایا جائے اور برائی کو روکا جائے"۔ قرآن مجید میں ایسے بہت سے احکامات ہیں جن کی رو سے مسلمانوں کو بہت سے کاموں کو روکا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے کرنے سے معاشرے میں برائی پیدا ہوتی ہے جھوٹ بولنا' چوری کرنا' زنا کرنا' شراب پینا' سود لینا' دوسروں پر تہمت لگانا' غریبوں' مسکینوں اور یتیموں پر زیادتی کرنا اور معاشرے میں فتنہ پیدا کرنا ہے ان کاموں میں سے ہیں جن کو سختی سے منع کیا گیا ہے۔ جن افعال کو خدا نے پسند فرمایا ہے اور جن پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی ان میں پانچ فرائض کے علاوہ چند یہ ہیں معاشرے میں اپنے فرائض اور حقوق کو جاننا دوسروں کے عبرتناک انجام سے سبق حاصل کرنا' عورتوں اور زیردستوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرنا اور اپنی غلطیوں اور گناہوں کی معافی مانگنا۔ غرضیکہ قرآن مجید میں وہ اصول واضح طور پر بتائے گئے ہیں جن کی روشنی میں مسلمان اپنی انفرادی' سماجی' معاشی اور سیاسی زندگیوں کیلئے قوانین وضع کر سکتے ہیں اور جن پر عمل کر کے اپنی دنیا بھی بہتر بنا سکتے ہیں اور اپنی آخرت کو بھی ٹھیک کر سکتے ہیں۔ رسول خدا کی زندگی قرآنی تعلیمات کا عملی نمونہ تھی' اس لئے آپ نے حجتہ الوداع کے موقع پر

مسلمانوں سے فرمایا تھا کہ میں تمہارے لئے دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت جب تک تم انہیں پکڑے رہو گے کبھی گمراہ نہیں ہو گے' قرآن کے احکام کی وضاحت ارشادات نبوی (احادیث) کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں صرف زندگی گزارنے کے اصول ہی نہیں بتائے گئے ہیں بلکہ کائنات کی تخلیق' انسان کی پیدائش' دنیا میں اس کی اہمیت اور اس کے عروج وزوال کی داستانیں بھی بیان کی گئیں۔ پچھلی قوموں کے حالات اور ان پیغمبروں کے حالات جو رسول اللہ ﷺ سے پیشتر دنیا میں آئے تھے بڑی حد تک بیان کئے گئے ہیں۔ مسلمانوں نے تاریخ کا سبق سب سے پہلے قرآن مجید سے ہی سیکھا۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں فرشتوں' جنات اور شیاطین کا بھی ذکر ہے۔ فرشتے تو ہر وقت خدا کی عبادت میں مشغول ہیں' بُرائی کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جنات آگ سے پیدا کی ہوئی مخلوق ہے جو انسانوں کو نظر نہیں آتی شیاطین جنات ہی کی ایک نسل ہے جو نافرمان ہے اور ابلیس کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور ابلیس وہ شیطان ہے جو انسانوں کو بُرائی کی طرف راغب کرتا ہے۔ انسان کو بھی خداوند کریم نے تخلیق کیا ہے۔ لیکن انسان کی عقل وفراست کا امتحان لینے کیلئے ابلیس کو آزادی دیدی گئی ہے کہ وہ برائی کی طرف راغب کرے' اگر انسان شیطان کے بہکائے میں آجاتا ہے اور خداوند کریم کے صریح احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے تو پھر مرنے کے بعد اسے دوزخ کا ایندھن بننا ہوگا۔ لیکن اگر خدا کی عبادت کرتا ہے اور اس کے احکام کو بجالاتا ہے تو پھر آخرت میں اس کا مقام جنت میں ہوگا' جنت اور دوزخ کی تشریح قرآن مجید میں کی گئی ہے اور اس دن کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے' جس دن انسان کے اعمال کا حساب وکتاب ہوگا۔ اسلام کے اخلاقی نظام کی بنیاد اسی عقیدے پر رکھی گئی ہے' ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید کو الہامی کتاب سمجھے اور اس کی تعلیمات پر عمل کر کے خدا سے قرب حاصل کرلے

کیونکہ دنیاوی زندگی مختصر ہے اور جبکہ دنیا کے بعد کی زندگی لامتناہی ہے۔

اسلام کی تعلیمات کو عملی شکل میں رسول خدا ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ آپ کی سیرت اور آپ کی تعلیمات کا یہ نتیجہ تھا کہ حجتہ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ مسلمان جمع تھے' اور تمام عرب پر اسلام کی عظمت قائم ہو چکی تھی' حجتہ الوداع کے موقعہ پر آپؐ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ موجود ہے' وہ مندرجہ ذیل ہے:

ا۔ ہر وہ شخص جو اسلام قبول کر لیتا ہے' اس برادری کا فرد بن جاتا ہے جس میں برادری کے تمام افراد کو برابری کے حقوق ملے ہوئے ہیں۔

۲۔ زمانہ جاہلیت کی رسموں مثلاً انتقام اور سود کا تعلق اسلام سے ختم کر دیا گیا اور مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ وہ جاہلیت کی رسموں کو اختیار نہ کریں۔

۳۔ عورتوں کو خدائے تعالیٰ کی امانت بتایا گیا ہے۔ اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری مردوں پر عائد کی گئی اور ان سے نیک سلوک کرنے کی ہدایت کی گئی' غلاموں کے ساتھ برابری کا سلوک کرنے کی ہدایت ہے۔

۴۔ نسلی' جغرافیائی اور لسانی امتیازات کو اسلام میں ختم کر دیا گیا ہے کسی انسان کو دوسرے پر فوقیت نہیں ہے' بجز اس کے نیک اور متقی ہونے کے' اللہ کے نزدیک معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔

۵۔ مسلمانوں کے لئے جماعتی تنظیم ضروری قرار دی گئی اور ان پر ان کے امیر کی اطاعت فرض کی گئی۔ وہ امیر چاہے کسی نسل اور قوم سے کیوں نہ تعلق رکھے لیکن جب اسے امیر تسلیم کر لیا گیا تو پھر اس کی اطاعت لازمی ہو گئی۔

۶۔ تمام امت کیلئے اخوت' اتحاد اور اتفاق کو لازمی بتایا گیا اور مسلمانوں کو خانہ جنگی سے منع کیا گیا۔

۷۔ تفرقہ اندازی اور گمراہی سے بچنے کیلئے جو علاج تجویز گیا گیا' وہ یہ کہ مسلمان قرآن کی تعلیمات اور سنت رسول ﷺ پر عمل کرتے رہیں۔

# اسلام میں فرقے

اسلام کی بنیادی تعلیمات پر جب تک عمل ہوتا رہا مسلمان ایک متحد اور طاقتور قوم بنے رہے لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانہ [illegible] میں مسلمانوں میں سیاسی اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے اور شہادت عثمانؓ کے بعد سیاسی طور پر مسلمان کئی فرقوں میں بٹ گئے۔ شیعان عثمانؓ کہ جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کا قصاص چاہتے تھے' شیعان علیؓ جو حضرت علی اور ان کی اولاد کی خلافت کے حامی تھے' اور خارجی جو کہ پہلے حضرت علیؓ کے ساتھ تھے لیکن بعد میں ان کی فوج سے علیحدہ ہو کر ان کے مخالف ہو گئے تھے۔ فرقوں کی شکل اختیار کر گئے۔ شروع میں یہ اختلافات سیاسی نوعیت کے تھے لیکن بعد میں ان فرقوں میں علیحدہ علیحدہ مذہبی عقائد کی نشو نما ہونے لگی اور مستقل طور پر یہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے' شیعان عثمانؓ کی جگہ تو مرجیہ فرقے نے لے لی تھی' جس کا بنو امیہ کی حمایت کرنا تھا۔ لیکن بنو امیہ کے زمانے میں مرجیہ فرقے کو زیادہ فروغ مقصد نہیں ہوا کیونکہ بنو امیہ کی مخالفت شیعوں' خارجیوں اور بنو عباس نے کی تھی اور جب بنو امیہ کا زوال ہو گیا تو مرجیہ فرقہ بھی ختم ہو گیا۔

جن مسلمانوں نے قرآن مجید کی تفسیر کیلئے سنت رسول ﷺ کو ضروری سمجھا وہ اہل سنت والجماعت کہلائے اور اس وقت مسلمانوں میں سب سے بڑا فرقہ ان ہی کا ہے۔ اہل سنت والجماعت میں بعض علماء نے فقہی مسائل پر ایک دوسرے سے اختلاف کیا جس کے نتیجہ کے طور پر چار اہم فقہی مکتب خیال وجود میں آ گئے جو امام ابو حنیفہ' امام شافعی' امام حنبل اور امام مالک کے ناموں سے وابستہ ہیں۔

اہل سنت والجماعت کے بعد دوسرا بڑا فرقہ شیعوں کا ہے۔ پہلے یہ شیعان علی

(یعنی حضرت علیؓ کے ساتھی) کہلائے اور بعد میں صرف شیعہ کے نام سے مشہور ہوئے ان پر بنوامیہ کے زمانے میں سیاسی اختلافات کی وجہ سے کافی سختیاں ہوئیں' کیونکہ خلافت کو حضرت علیؓ کے خاندان میں دیکھنا چاہتے تھے' واقعہ کربلا کے بعد ان کی مخالفت بنوامیہ سے اور زیادہ بڑھ گئی' اور یہ خفیہ طور پر اپنی تنظیم کرنے لگے۔ چونکہ سیاسی اقتدار ان کے پاس نہیں تھا اس لئے مذہبی رہنمائی پر زیادہ زور دیا گیا اور حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی اولادوں میں سے اماموں کی بیعت کرتے رہے۔

بنوامیہ کی مخالفت میں شیعوں نے بنوعباس کا ساتھ دیا لیکن بنوعباس کے برسراقتدار آنے کے بعد بھی ان پر مظالم ہوتے رہے۔ اور ان کے اماموں کو ستایا جاتا رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ خود شیعوں میں بھی کئی فرقے ہو گئے۔ ایک فرقہ تو صرف سات اماموں پر یقین رکھتا ہے جسے اسمٰعیلیہ کہا جاتا ہے۔ اس فرقہ کا عقیدہ ہے کہ ساتویں امام اسمٰعیل جو غائب ہو گئے ہیں پھر ظاہر ہونگے اور پھر شیعوں کی رہبری کریں گے' دوسرا اہم فرقہ شیعوں میں وہ ہے جو بارہ اماموں پر یقین رکھتا ہے ان کے نزدیک بارہویں امام' امام مہدی دنیا میں ظاہر ہونگے اور دنیا کی رہبری فرمائیں گے۔ شیعوں میں اور بھی چھوٹے چھوٹے فرقے ہیں۔ اور ان کے اندر جزوی اختلافات ہیں۔ لیکن یہ سب دینوی اور دنیاوی رہبری کو حضرت علیؓ کی اولاد میں محدود سمجھتے ہیں شیعوں میں سے علیحدہ ہونے والا اہم فرقہ جس نے بنوامیہ کے زمانے میں کافی شورش برپا کر رکھی تھی خارجی فرقہ تھا یہ لوگ پہلے تو حضرت علیؓ کے ساتھ شامل تھے لیکن جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ اور امیر معاویہ ثالثوں کا فیصلہ ماننے پر راضی ہو گئے تھے تو بارہ ہزار آدمی حضرت علیؓ کی فوج سے علیحدہ ہو گئے' اور حضرت علیؓ اور امیر معاویہ دونوں کے مخالف ہو گئے۔ ان کے نزدیک دین کے معاملہ میں خدا کے سوا کسی کو حکم (ثالث) نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ خارجیوں کو حضرت علیؓ نے شکست دی تھی' جس کا بدلہ انہوں نے حضرت علیؓ کو شہید

کر کے لیا۔ بنو امیہ کے زمانے میں وہ مستقل بغاوتیں کرتے رہے اور مصیبت کا باعث بنے رہے۔ بنو عباس کے زمانے میں ان کا زور کم ہوا۔ ان کے اندر خود فرقے پیدا ہو گئے جو آپس میں لڑنے لگے' عراق اور شام سے منتقل ہو کر خارجی افریقہ کے بربری علاقوں میں پہنچے۔ لیکن یہاں بھی کچھ عرصہ بعد ان کا زور ختم ہو گیا اور اب بحیثیت فرقہ کے خارجیوں کا اسلام میں کوئی مقام نہیں ہے۔

بنو عباس کے زمانے میں ایک نیا فرقہ مسلمانوں میں پیدا ہو گیا تھا' یہ معتزلہ فرقہ تھا۔ یہ مذہب کو عقل کا پابند بنانا چاہتے تھے۔ اور مذہبی عقائد کو عقل کی روشنی میں پرکھتے تھے' مامون الرشید کے زمانے میں ان کا بہت زور رہا' کیونکہ مامون اور اس کے بعد معتصم کے زمانے میں معتزلہ فرقے کی طرف سے دوسرے فرقے کے لوگوں پر کافی مظالم کیے گئے لیکن متوکل کی سختی اور امام غزالی کے فلسفہ نے معتزلہ فرقہ کا خاتمہ کر دیا۔ عباسیوں کے زوال کے بعد مسلمانوں کے سیاسی انحطاط کے ساتھ ساتھ ان میں فرقے بھی بڑھتے رہے' مسلمانوں میں اگر اصلاح کی کوئی تحریک اٹھی تو بعد میں وہ بھی ایک فرقہ بن گئی۔

اس وقت دنیا کے عام مسلمانوں میں 96.5 فیصد اہل سنت والجماعت ہیں اور ساڑھے تین فی صدی تین شیعہ' خارجی' اور دیگر فرقے پائے جاتے ہیں' کیا اچھا ہوتا کہ ہمارے علماء آپس کے اختلافات کو ختم کر لیتے' کیونکہ ان فرقوں میں مشترک فیہ امور مختلف فیہ امور سے بہت زیادہ ہیں۔ صرف چند امور میں اختلافات کی بناء پر الگ فرقے بنائے رکھنا کسی کے مفید نہیں ہو سکتا۔

# مسلمانوں کے قوی پہلو

## ا۔ مسلمانوں کا مذہب تبلیغی ہے

پروفیسر میکس طر کی مشہور تقسیم کے لحاظ سے مذاہب عالم کے منجملہ عیسائیت'

اسلام

بدھ مت اور اسلام تبلیغی مذاہب ہیں۔ لیکن بدھ مت اور عیسائیت کے بارے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اپنی اصلی تعلیمات اور تاریخ کے مطابق یہ تبلیغی نہیں اس کے برخلاف اسلام قرآن و حدیث کی تعلیمات اور اپنی تاریخ کی بنا پر ایک تبلیغی مذہب ہے چنانچہ قرآن پیغمبر اسلام کے بارے میں کہتا ہے:

(۱) وما ارسلنٰک الّا رحمۃ لّلعلمین۔ ہم نے تم کو بھیجا مگر عالمین کیلئے رحمت بنا کر۔

(۲) وما ارسلنٰک الّا کآفّۃ" لّلنّاس۔ ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام بنی نوع انسان کیلئے۔

اسی طرح ملتِ اسلامیہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:-

انتم خیر اُمّۃٍ اُخرجت للنّاس یامُرُون بالمعروف و ینھون عن المُنکر۔ تم بہترین قوم ہو جو لوگوں کے پاس بھیجی گئی اچھی باتوں کا حکم دو اور بُری باتوں سے روکو۔

اسی طرح حدیث میں وارد ہے:-

بعثت الی الا حمر والاسود۔ میں گورے اور کالے دونوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

## ۲۔ مسلمان ایک عالمگیر قوم ہیں

تمام مذاہبِ عالم میں عیسائیوں کو چھوڑ کر صرف مسلمان ہی ایک عالمگیر قوم ہیں چنانچہ ایک عیسائی ایڈورڈ جر جی لکھتا ہے:-

"اسٹیج دنیا کا عمومی جغرافیہ ہے جس میں زمین کے تمام براعظم شامل ہیں۔ زمانہ ساتویں صدی عیسوی کے بعد کی تاریخ ہے۔ ڈرامے کے افراد اور شخصیتیں بنی نوع انسان کی مختلف و متعدد نسلیں ہیں۔ عرب

ایران، ترک، یورپی، منگولی، حبشی، ہندو، ملائی اور انڈونیشی ..... گندمی، سیہ فام، زرد اور گورے ہر رنگ و روغن والے، عنوان اگرچہ عربوں کا ہے لیکن اصلی کردار ہمیشہ خود اسلام نے ادا کیا ہے، مختلف زمانوں اور قوموں کی صورت میں یہ ولولہ انگیز کہانی پیش کی گئی ہے چنانچہ ان میں شامی، ایرانی، ہندوستانی، اردو، جاوی، ملائی، چینی، تاتاری، باؤسا، ترکی اور مقدس عربی زبان شامل ہے، اگر اسلام کی چہار گونہ (زمان مکان، نسل اور زبان کے) کوئی معنی ہیں تو وہ یہی ہیں کہ اللہ کے دین نے دنیا کی اجتماعی زندگی میں ایک زبردست کردار ادا کیا اور انسانیت نواز حصہ لیا ہے"۔(12)

چنانچہ آج وہ نہ صرف دنیا کے ہر براعظم میں پائے جاتے ہیں، بلکہ قدیم دنیا (ایشیاء یورپ اور افریقہ) کے تینوں براعظموں میں ایک سیاسی قوت بھی ہیں۔ براعظم ایشیا کے (۴۶) فیصد حصے پر ان کی آبادی کی اکثریت ہے اور ان کی تیرہ آزاد سلطنتیں ہیں جن کے منجملہ بارہ متحدہ اقوام کے رکن ہیں افریقہ میں اس کے رقبے کا اسی فیصد سے زائد وہ ہے جہاں وہ اقلیت میں نہیں اور یہاں بھی ان کی فی الوقت پانچ کامل آزاد مملکتیں ہیں جو متحدہ اقوام کی رکن ہیں، یورپ میں بھی گو ایک فیصد حصہ پر ان کا قبضہ ہے لیکن دو آزاد ممالک (ترکی و البانیہ) ہیں جو متحدہ اقوام کی رکن ہیں۔

## ۳۔ مسلمان نسل انسانی کے نمائندہ ہیں

قدیم دنیا کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ نسل انسانی کی تمام اصلی اور بڑی نسلوں کی نمائندہ ہے۔ چنانچہ جب ہم قدیم دنیا کے مذہبی فرقوں کی نسلی تقسیم پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اقوام میں سامی نسل، آریائی نسل اور منگولی نسل کے اکثریتی علاقے داخل ہیں اور ان کی آزاد سلطنتیں ان تینوں بنیادی

اسلام

نسلوں کی نمائندہ ہیں۔ مسلمانوں کی یہ خصوصیت ایسی ہے جو دنیا کے دیگر مذاہب کے پیروؤں کو حاصل نہیں، اس کی وجہ سے مسلمان ان تینوں نسلوں کی ممیّز خصوصیات کے جامع ہیں اور ان کی تہذیب و تاریخ کو ایسی رنگا رنگی ملی ہے جو انہیں زمان و مکان کے تغیرات میں باقی رہنے اور اسلامی تہذیب کی بنیادی یکسانیت کو برقرار رکھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

۴۔ مسلمانوں کی جغرافی (بین براعظم حیثیت) اہمیت

قرآن پاک نے مسلمانوں کو "امت" وسطی (یعنی بیچ کی قوم) کا خطاب دیا ہے۔ دنیا کے جغرافیہ کو دیکھنے سے اس کی بخوبی تائید ہوتی ہے، کیونکہ مورٹیبیا اور اسپینی صحرا کے ساحل (بحراوقیانوس) سے لے کر جزائر شرق الہند (بحرالکاہل) تک منطقہء حارّہ کے دونوں طرف کے علاقوں میں مسلمان مسلسل پھیلے ہوئے ہیں۔ دنیا کا یہ علاقہ تجارتی اور حربی حیثیت سے بے حد اہم ہے۔ جبل الطارق درہ دانیال، نہر سوئز، عدن، سیلون، اور سنگاپور میں سے سیلون کو چھوڑ کر بقیہ تمام بحری اڈے مسلم علاقوں میں پائے جاتے ہیں یا ان سے متصل ہیں، یہی حال ہوئی اڈوں اور بحری و بری راستوں کا ہے۔ چنانچہ امریکی رسالہ "لائف" کا نامہ نگار لکھتا ہے:۔

> "چونکہ مشرق اور مغرب کے درمیان ایک زبردست آفاقی کشمکش پیدا ہوگئی ہے جو کمیونزم اور جمہوریت کے درمیان برپا ہے اسلام نہ تو مشرق ہے اور نہ مغرب، بلکہ وہ دونوں سے ملتا ہے وہ ایک طرف یورپ اور ایشیا اور دوسری طرف یورپ اور افریقہ کے درمیان واقع ہے اس لئے اس کو زبردست حربی اہمیت حاصل ہے"۔(13)

مشہور مورّخ آرنالڈ ٹائن بی لکھتا ہے:۔

> "ہماری علاقی بہن تہذیب یعنی اسلام کے قدم یورپی براعظم میں

مضبوطی سے جم چکے ہیں اسلام کی عملداری مغربی چین کے قلب ایشیا سے لیکر ایشیا اور افریقہ کے مغربی ساحل تک پھیلی ہوئی ہے۔ ڈاکر کے مقام پر عالم اسلام ان آبناؤں پر قابو رکھتا ہے جو براعظموں کے راستے ہیں' اور جو ایشیا اور افریقہ کے براعظموں کو جنوبی امریکہ کے جزیرہ سے جدا کرتے ہیں۔ اسلام کے پیرو ایشیا کے ہندوستانی بر کوچک میں مضبوطی سے جم چکے ہیں۔" (14)

اسی طرح فرناؤ (Fernau) اپنی کتاب کے مقدمہ میں کہتا ہے:-

"اسلام نہ تو ایشیائی ہے اور نہ افریقی' وہ ایشیا اور افریقہ کے درمیان اتصالی کڑی ہے۔ نیز اس واقعہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ وہ یورپ اور افریقہ کے درمیان بھی ایک اتصالی کڑی ہونے کی حیثیت سے مسلم اقوام جو راہ بھی اختیار کریں گی وہ ساری دنیا کے مستقبل کی ترقی میں فیصلہ کن اہمیت رکھتی ہے۔ اگر وہ (مسلمان) دشمنی میں مغرب سے قطع تعلق کر لیں تو پھر یورپ کو ایشیا اور افریقہ سے ملانے والے جو پل ہیں وہ بند ہو جائیں گے"۔ (15)

آگے چل کر وہ اپنی کتاب کے صفحہ (۲۸۱) پر ایک اور بات کہتا ہے:۔

"اسلامی حلقہ یکتا جغرافی مقام پر واقع ہے جس طریقہ سے مسلمان تین براعظمی مملکتوں میں بستے ہیں' اس طرح نہ تو یورپ ہے اور نہ مغرب بعید۔ مسلمان سیاسی و حربی اہمیت رکھنے والی دنیا کی نوک پر واقع ہیں"۔

فرناؤ کے اس اندازہ اور تخمینہ میں ایک کمی ہے' افریقہ کے بڑے حصہ اور خصوصاً مشرقی اور مغربی ساحل پر مسلمانوں کی اکثریت کے باعث وہ اس براعظم کے

---

اسلا

کنٹرول میں کافی اثر کے مالک ہیں۔ افریقہ کے مشرقی ساحل پر زنجبار کی جنوبی سرحد تک وہ نوے فیصد ہیں اور جنوبی افریقہ کی سرحد تک برابر کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ بحر ہند کے ساحل کے نگراں ہیں چنانچہ اس بارے میں ایک مبصر یوں لکھتا ہے:

> ''مغرب کی کوئی طاقت جو مشرق میں اپنی شہنشاہت قائم کرنا چاہتی ہے مشرقی افریقہ کی ملکیت سے بے تعلق نہیں رہ سکتی۔ یہ ساحل مشرق کے بحری راستے کے بازو پر واقع ہے چاہے وہ بحر قلزم اور بحیرۂ سرخ کا ذریعہ ہو یا افریقہ کے انتہائی جنوبی کنارے سے ہو''۔(16)

اسی طرح مشرقی ساحل کی بندرگاہ ڈاکر کے متعلق جو سنگال کے مسلم اکثریتی علاقے میں واقع ہے گنتھر لکھتا ہے:۔

> ''ڈاکر کی اصلی اہمیت جس کی وجہ سے ممالک متحدہ امریکہ کو اس سے دلچسپی ہے یہ ہے کہ حربی وسیاسی اہمیت کے لحاظ سے یورپ اور جنوبی امریکہ کے درمیان تقریباً تمام بحری آمد و رفت ڈاکر کے راستے ہوتی ہے۔ اسی طرح ڈاکر بڑی حد تک اس ہوائی آمدورفت کا درمیانی واسطہ ہے جو جنوبی بحر اوقیانوس کو پار کرتی ہے۔ یہ نہ صرف یورپ اور برازیل اور ارجنٹائن کے درمیان راستوں کی صرف لازمی کڑی ہے بلکہ نیو یارک اور جنوبی افریقہ کا بھی واسطہ ہے۔ افریقہ اور برازیل کے درمیانی حلق پر ڈاکر قابو رکھتا ہے جس کا فاصلہ صرف ۱۶ سو میل ہے۔ جو نیو فاؤنڈ لینڈ اور آئر لینڈ سے بھی کم ہے۔ (Inside Africa, P-882)

اسی طرح مسلمان مغربی ساحل پر موریٹینا اور اسپینی صحرا کی جنوبی سرحد تک نوے فیصد

---

اسلام

سے زائد اور اس سے نیچے انگولا کی شمالی سرحد تک برابر ہیں' اس لئے وہ بحر اوقیانوس کے کناروں کی بھی نگہبانی کرتے ہیں' ان نگہبانی کی پوری اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ جب رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرس کی کتاب میں پڑھتے ہیں۔

''اپنے جغرافی موقف کے باعث افریقہ قلعہ ہے امریکی براعظم اور ایشیا اور اسٹریلیا کے ان حصوں کے درمیان ایک کڑی ہے جو مغربی بلاکوں کا جز ہیں''۔(17)

آگے چل کر مقدمہ میں لکھا ہے:۔

یورپی و ایشیائی (Eurosian) سرزمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اب مغربی نگرانی میں ہے اور جنگ کی صورت میں یہ چھوٹا سا ٹکڑا بھی قبضہ میں نہ رہ سکے گا۔ اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ شمالی افریقہ میں اگر متبادل اڈے قائم ہوں تو زیریں صحرا (افریقہ) کا زبردست اہمیت حاصل ہو جائے گی۔

افریقہ کی اسی اہمیت کا مزید ثبوت اس سے ملتا ہے کہ یورپ کی استعماری اقوام بجز روس کے افریقہ میں اپنی نو آبادیاں قائم کرنے پر مجبور ہوئیں۔ روس چونکہ مشرق سے جغرافی اتصال رکھتا تھا اور برفیلے سمندر میں واقع تھا اس لئے وہ افریقہ میں اُتر نہ سکا۔ دنیا کے موجودہ حالات میں جبکہ جوہری قوت نے فاصلہ کو بیکار کر دیا ہے اور جب کہ امن وتحفظ مقامی نہیں بلکہ آفاقی ہے' اس براعظم کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے' یہی وجہ ہے کہ امریکہ بھی جو اپنی تاریخ میں کبھی استعماری نہیں رہا افریقہ کو نظر انداز نہ کرنے پر یوں مجبور ہوا کہ اس کا امریکہ سے باہر سب سے بڑا ہوائی اڈا لیبیا میں ہے' اور امریکہ سے باہر اس کا سب سے بڑا نشریاتی مرکز ارٹیریا (حبش) میں قائم ہے۔(18)

## ۵۔ مسلمانوں کی نظریاتی قوت

مذاہب عالم میں اسلام اپنے مخصوص نظریہ کے باعث جدا گانہ حیثیت کا

اسلام

حامل ہے، جس کے امتیازی اور مخصوص پہلوؤں پر ہم اگلے صفحات میں بحث کریں گے۔ لیکن ابتداء میں اس کے دو پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے، جو اس کی مرکزیت اور استحکام کا اصلی ذریعہ رہے ہیں۔

دنیا کے دیگر مذاہب کے برخلاف اسلام کا مرزبوم محفوظ رہا اور اس پر کبھی دیگر مذاہب کا تسلّط نہ قائم ہو سکا۔ اسی طرح اس کی کتاب کی زبان (عربی) بھی ایک زندہ زبان کی حیثیت سے محفوظ ہے، اور حج کے فریضہ کے ذریعہ اس سرزمین اور اُس کی زبان سے مسلمانانِ عالم کے ربط کو باقی رکھا گیا ہے۔ اس طرح اسلام اپنے ماننے والوں کو نہ صرف ایک مکمل ضابطہء حیات عطا کرتا ہے بلکہ اس محفوظ ضابطہء حیات کے سیاسی تقاضے کی تقویت کیلئے انہیں ایک محفوظ مرکز بھی عطا کرتا ہے۔

## الف۔ اسلامی عقیدہ کی سادگی اور مطابق فطرت ہونا

اسلامی نظریہ حیات کی بڑی طاقت اس کی سادگی اور فطرت پسندی ہے۔ عقیدۂ توحید (جو اسلام کی اساس ہے) سے زیادہ سادہ اور فطری عقیدہ ناقابل تصور ہے یہ معمولی سمجھ بوجھ کے آدمی کیلئے بھی اسی طرح قابل فہم ہے جس طرح اعلیٰ دماغ مفکر اور فلسفی کیلئے اس عقیدہ کی صحت اور سچائی کے قائل کیلئے اس عقیدہ کے پیغامبر کی صداقت کا اقرار ایک طبعی نتیجہ ہے۔ اسلامی عقیدہ کے یہ دو اجزائے ترکیبی (توحید و رسالت) نہایت مختصر اور سادہ ہیں۔ عقیدہ سے آگے بڑھکر دوسرے درجہ پر اعمال مذہبی میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہیں جو اپنے معنی اور غایت میں کوئی ابہام اور پیچیدگی نہیں رکھتے، اور عقیدہ ہی کی طرح ایک عالم اور عامی دونوں کیلئے قابل فہم ہیں۔ بنیادی عقائد اور بنیادی اعمال و فرائض مذہبی کا یہ اختصار اور سادگی دیگر مذاہبِ عالم میں نہیں پائی جاتی، بلکہ ان کی دانش اور فہم کیلئے ایک خاص طریق فکر اور فلسفہ کی مشق کی ضرورت ہے اگر یہ کوئی خوبی ہے تو اس سے ہمیں کوئی انکار نہیں، ہمیں تو اس کے عملی نتائج سے

واسطہ ہے اور ان کی شہادت یہ ہے کہ عقائد و اعمال مذہبی کی کثرت' یا ان کا ابہام و پیچیدگی مذہب کی عام مقبولیت یا اس پر عمل کے راستے میں ایک سدِ سکندری ہے۔

اسلام کی اس سادگی کے بارے میں میں ایک عیسائی ایڈورڈ عطیہ کی شہادت یہ ہے:۔

> ''وہ چٹان جس پر اسلام کھڑا ہے' جنت کی وہ واحد کلید جو اسلام کے پیروؤں کے لئے ضروری ہے وہ قرآن ہے' یہ ایک سادہ اور عملی مذہب ہے جس کے اصولوں میں ناممکنات کو حاصل کرنا داخل نہیں' بلکہ ان چیزوں کا حصول کافی ہے جو کم سے کم تعلیم و تربیت یافتہ آدمی کے بھی بس میں ہوں''۔(19)

یہی سادگی اسلام کی وہ معجزانہ طاقت تھی جس نے نہ صرف دنیا کے جدید ترین مذہب (سکھ مذہب) کو متاثر کیا' جیسا کہ اس مذہب کے سلسلہ میں واضح ہوگا۔ بلکہ قدیم مذاہب کو بھی متاثر کیا ہے چنانچہ جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے خود عیسائی اور مغربی مصنفین بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ عہد اصلاح کی مساعی اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی معارف پروری اور حکمت نوازی کی شرمندۂ احسان ہیں۔ لیکن دوسرے مذاہب بھی اسلام کے اس فیضان سے محروم نہیں' جس کی ایک جھلک دیکھئے:۔

## یہودیت پر اسلام کا اثر

ایک یہودی عالم ابراہیم اے نیومن (Ibrahim A. Neuman) لکھتا ہے:۔

> ''عیسائی مدرسیت کے خلاف مسلم اثر کے تحت یہودیت اپنے نقطۂ نظر کو ایک مسلمہ نمونے کے مطابق مرتب کرنے پر مجبور ہوئی جو آسانی سے مقابل کے غالب اور حریف ادیان کے مقابلے میں اس کے اتفاق اور اختلاف کے نقاط کو بآسانی ظاہر کر سکے''۔(20)

## ہندو مذہب پر اسلام کا اثر

ایک عیسائی عالم ایڈ ورڈ جے۔ جرجی لکھتا ہے:-

''بہرحال ہندوستان اس اُصول کا کوئی استثنیٰ نہیں کہ ہر ایک قوم کا قومی کردار ایک نیا قالب اختیار کر لیتا ہے جبکہ ہلال اُفق پر نمودار ہوتا ہے' اسلام کی تشکیلی طاقت مختلف نسلوں اور ثقافتوں کے درمیان ایک صلح کار کا فریضہ ادا کرنے والی طاقت سے زیادہ اور کہیں درخشاں نہیں ہوتی جو انسانوں کے درمیان حائل ہونے والی سرحدوں اور رکاوٹوں کو دُور کرتی ہے''۔(21)

## ٹاؤ مت پر اسلام کا اثر

ٹاؤ مت کا مقالہ نگار لکھتا ہے:-

''ان ٹاؤ مت کی انجمنوں میں سے متعدد انجمنوں نے اپنے دیوتاؤں میں دیگر مذہب کے مصنوعی دیوتاؤں اور رہنماؤں کو بھی شریک کر لیا ہے' ان میں سے بعض نے اپنے قدیم معبودوں کے اوپر دیگر تمام مذاہب کے خداؤں کا درجہ دیا ہے' عیسائیت' اسلام' بدھ مت' کنفیوشی مت اور ٹاؤ مت کو ہدایتِ الٰہی کے مطابق نجات کے راستے سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً پیکنگ کے ایک مثالی جیل خانے (۱۹۱۲ء) میں ایک لکچر ہال تھا۔ صدر کی کرسی کے عقب میں پانچ تصویریں آویزاں تھیں۔ جو مسیح' لاوتی' حکیم کنفیوشس' جان ہورڈ (اٹھارویں صدی عیسوی کا ایک انسان دوست) اور حضرت محمد ﷺ کی تھیں''۔(22)

## سکھ مذہب پر اسلام کا اثر

سر گوکل چند نارنگ جیسے کٹر آریہ سماجی لکھتے ہیں:

''اس کا فوراً اقرار کرنا چاہیئے کہ سکھ مذہب کے وجود سے اسلام کا کسی نہ کسی قسم کا تعلق ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اگر اسلام ہندوستان کے حدود میں داخل نہ ہوتا تو یہاں سکھ مذہب نہ ہوتا' یا موجودہ صورت میں ظاہر نہ ہوتا''۔(23)

## (ب) دین و دنیا کی جامعّیت

مذاہبِ عالم میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو زندگی کو ناقابل تقسیم سمجھ کر اس کی دین اور دُنیا دونوں کیلیئے ایک مکمل ضابطہ مہیا کرتا ہے جس کے دونوں حصے باہم ایک دوسرے کا تکملہ کرتے ہیں' دین کا شعبہ اسلامی معاشرہ کے ہر فرد کے کردار کی تعمیر کی ان ضروری شرائط کو ظاہر کرتا ہے جو فرد کو معاشرہ میں اپنے لازمی فرائض کو بہتر طریقے سے انجام دینے کے قابل بناتا ہے۔ دین کا دوسرا حصہ ایسے تربیت شدہ افراد کو ملا کر ایک مثالی اور کامیاب معاشرہ کی تشکیل کو مکمل کرنے کیلیئے ان کو ایک سیاسی تنظیم میں منسلک کرتا ہے' اس لئے اسلام کے عقیدہ میں دین و دنیا کی تفریق یا سیزر و پوپ کے جداگانہ اختیار کے دائروں کی کوئی گنجائش نہیں' اس لئے دین و دنیا کی اس غیر فطری تقسیم کی وجہ سے اجتماعی زندگی میں جو کشمکش پیدا ہوتی ہے اس کے بُرے اثرات سے مسلمان محفوظ ہیں۔ اس صورتِ حال کے غیر معمولی اور مفید نتائج کی سب سے بڑی اور ناقابل تردید شہادت مسلمانوں کی موجودہ حالت ہے کہ باوجود ہمہ جہتی تنزل کے وہ اپنی جامعیت کے باعث تمام معاند قوتوں اور مخالف عوامل کے دباؤ کے درمیان اپنے جداگانہ وجود کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہ وہ نمایاں فائدہ ہے جس کی طرف میگل یونیورسٹی کے ''ادارۂ اسلامی مطالعہ'' کے ڈائریکٹر ویلفرڈ اسمتھ

اسلام

(Welferd Smith) یوں اشارہ کرتے ہیں:۔

''اسلام ایک مذہب اور تہذیب دونوں ہے' دنیا کی مسلم قوم اگر چہ مذہبی عقیدہ پر قائم ہے جس پر اس کی بقا کا دارومدار ہے تاہم یہ دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب مثلاً عیسائیت' ہندو مذہب' بدھ مذہب وغیرہ کے مقابلے میں ایک مذہبی جماعت سے بھی کچھ زیادہ حیثیت رکھتی ہے' اس کا دنیا کی تین یا چار قدیم تہذیبوں' مغربی ہندوستانی' چینی (ٹائن بی کی طرح ہم روسی تہذیب کو بھی کیوں نہ شمار کریں) سے بھی مقابلہ کرنا چاہیئے۔ اسلام جو مذہب اور تہذیب دونوں ہے اس درجہ تک ممتاز ہے جس حد تک اس نے ماضی میں ان دونوں چیزوں کو ہم آہنگ کر دیا تھا۔ مذہبی عقیدہ کی حیثیت سے اسلام کے ضروری مزاج و عقیدہ کیلئے یہ ضروری تھا کہ وہ دنیا میں ایک خاص قسم کا معاشرہ تشکیل دے۔ اس کے بعد سے مسلم معاشرہ کی ہمیشہ یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس کے ارکان ایک بے مثال اور نمایاں اجتماعی وفاداری اور سالمیت کے حامل رہے ہیں۔ مغربیوں کی دو وفاداریاں' ایک مذہب کے ساتھ دوسری اس کے دنیوی ورثہ کے ساتھ ادب کی مختلف شاخوں سے لے کر سیاسی اداروں تک منعکس رہی ہیں۔ لیکن اسلام نے ان دنوں کو مخلوط اور یکجا کر دیا ہے۔ یہی وہ مذہبی اور ثقافتی مشترکہ احساس ہے جو اسلامی دنیا کو ہم آہنگی و یکسانیت بخشتا ہے یہ اسلام کی نمایاں خصوصیت ہے' اقدار' روایات اور محسوسات کا یہی مربوط ڈھانچہ وہ شئے ہے جو اس کی پیروؤں اور

شرکاء کی اعلیٰ اور روایاتی وفاداری پر مبنی ہے''۔(24)

علامہ اقبالؔ مرحوم لکھتے ہیں:۔

''اسلام میں دینی اور دنیوی اُمور دو جداگانہ دائرہ میں منقسم نہیں کوئی فعل چاہے اپنی نوعیت میں کتنا ہی دنیوی کیوں نہ ہو اس کی اصلی نوعیت کی کسوٹی فاعل کے قلب و ذہن کی اصلی حالت ہے کسی فعل کا غیر مرئی ذہنی پس منظر ہی اس کی اصل نوعیت کا تعین کرتا ہے۔ فعل اس وقت دنیوی سمجھا جاتا ہے جبکہ وہ زندگی کی غیر محدود پیچیدگی سے بے تعلقی کے انداز میں کیا جائے۔ اسلام میں ایک ہی حقیقت ہے جس کو اگر ایک نقطۂ نظر سے دیکھیں تو وہ دین (کلیسا) نظر آتی ہے اور دوسرے نقطۂ نظر سے مملکت۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ دین اور مملکت ایک ہی شئے کے دو رخ ہیں' اسلام ایک ہی نا قابل تجزیہ حقیقت ہے جو آپ کے نقطۂ نظر کے مطابق کبھی ایک اور کبھی دوسری چیز نظر آتی ہے''۔(25)

لاہور میں بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ میں تقریر کرتے ہوئے یونیسکو (UNESCO) کے نمائندے کہتے ہیں:۔

''موجودہ مذاکرہ نے واضح طور پر اس امر کا مظاہرہ کیا ہے کہ مذہب کو سیاست سے بیگانہ قرار دینا ناممکن ہے' انہوں نے کہا کہ اسلام صرف ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے بلکہ ایک نظام اور ضابطۂ حیات ہے''۔(26)

اس جامعیت کا اصلی مظہر مسلمانوں کا قانون ہے جو مسلمانوں کی دینی اور دنیوی زندگی کو بے مثال اور کامل ہم آہنگی عطا کرتا ہے جس کے باعث وہ پچھلی تیرہ

---

صدیوں میں زمان و مکان کے تغیرات و اختلافات کے باوجود ایک متحد مگر تغیر پذیر و ترقی پسند اقدار کا حامل رہا ہے اسلامی فقہ کی اس انوکھی خصوصیت کے متعلق ہم چند آراء مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتے ہیں:-

(۱) پروفیسر ویلفرڈ اسمتھ کہتے ہیں:-

''اسلام کے مستند اور روشن صدی کے زمانہ عربی میں اسلام کا اصلی معاشری اظہار قانون (شریعت) میں ہوا۔ اسلام بڑی حد تک ایک مذہب قانون رہا ہے۔ اسلامی قانون ان تمام چیزوں کو ایک مربوط ڈھانچہ میں یکجا کر دیتا ہے جن کو مغرب میں اخلاقی قانون مذہبی قانون اور ملکی قانون کے ذیلی مسائل کے لئے (علوم اور شعبوں) میں تقسیم کیا گیا ہے جس دور میں اسلامی تہذیب عام طور پر مروج اور طاقتور تھی اس کا سہارا یہی نقطۂ نظر (آئیڈیل) تھا حالیہ صدیوں میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت اور عروج کو زوال سے دوچار ہونا پڑا اور مسلم ممالک بیرونی طاقتوں سے جس میں مغرب کا بڑا حصہ تھا' مغلوب ہو گئے اور ان کی اجتماعی (معاشرتی) زندگی پر اغیار کا تسلط ہو گیا اور اس طرح مخالف اصولوں کو نئے اغراض کیلئے ان پر آزمایا جانے لگا۔ گذشتہ چند سالوں میں اسلامی دنیا کے بڑے حصے نے دوبارہ سیاسی آزادی حاصل کر لی ہے' اور اپنی زندگی کی تشکیل کی پھر ایک مرتبہ ذمہ دار ہو گئی ہے۔ سابقہ قانون جو کسی زمانے میں ان کی اجتماعی زندگی کا حامل تھا متعدد جدید خیال مسلمانوں نیز تمام بیرونی مبصروں کی نظر میں موجودہ معاشرہ کی تنظیم کے کام کیلئے روایاتی شکل

اسلام

میں کافی نہیں لیکن یہ مطمع نظر اپنی جگہ پر اب بھی باقی ہے کہ معاشرہ کو کسی بامعنیٰ' منصفانہ اور مربوط طور پر منظم کیا جائے۔ بلاشبہ مسلمانوں کی اس کے سوا کوئی اور غایت نہیں ہو سکتی۔ مذہبی حیثیت سے وہ جس مسئلہ سے دوچار ہیں وہ یہی ہے کہ موجودہ حالت کے مدنظر اپنے اس عقیدہ کو معلوم کریں' بیان کریں اور عملی طور پر اس کے معنیٰ کا اطلاق کریں جس کیلئے صدیوں تک ان کی اجتماعی زندگی نے رہنمائی کی ہے''۔(27)

(۲) پروفیسر شاخت (Schact) لکھتا ہے:-

''اسلام کا مقدس قانون ایک نظامِ قانون سے زیادہ مذہبی فرائض کا ایک جامع و ہمہ گیر نظام ہے اس میں مساوی طور پر مذہبی عبادات و رسوم نیز سیاسیات (اور محدود معنیٰ میں) اور قانونی اُصولوں کے احکام (شرائع) داخل ہیں''۔(28)

(۳) وہ مرکزی اور لابدی خصوصیت جو مسلمانوں کے قانون کو اس کی موجودہ حیثیت بخشتی ہے اپنے تنوع کے اندر ایک یکسانیت عطا کرتی ہے جو تمام انسانی اعمال اور تعلقات کی روح ہے اور جن میں وہ تمام نقاط نظر شامل ہیں جن کو ہم قانون یا مذہبی اور اخلاقی کہتے ہیں۔(29)

(۴) لیکن یہ سب کے سب یکساں ہیں' چاہے وہ صحرا کے مسلمان ہوں یا مرغزاروں کے جن میں معاشی یا سیاسی ترقی کے مختلف مراحل کو کوئی اثر نہیں۔ وہ ہر وقت ایک ہی قسم کے اخلاق و عادات رکھتے ہیں' وہ حال حال تک ایک ہی قسم کا لباس پہنتے تھے' اور زندگی اور فرض کے بارے میں ایک ہی قسم کا نقطۂ نظر رکھتے تھے' اگرچہ

آخرالذکر ایک سراپا نفسیاتی نقطہ ہے لیکن وہ کاشفِ حال بھی ہے۔ مشرق کے عمر بھر کے تجربہ کے بعد ایک مشہور برطانوی عہدہ دار نے ایک مرتبہ رائے زنی کی تھی کہ ہیٹ (انگریزی ٹوپی) کے نیچے ایک طرح کا دماغ ہے، اور طربوش کے نیچے دوسری طرح کا۔ لیکن وہ یہ بھی اضافہ کرسکتا ہے کہ بدوؤں کے سر کے لباس کے نیچے بھی''۔ (30)

## (ج) سیاسی نظریہ

اسلام کے سیاسی نظریہ کی یہ منفرد خصوصیت بھی قابل لحاظ ہے کہ وہ بحیثیت مذہب اپنے پیروؤں کے معاشرہ کیلئے اجتماعی طاقت کے نمائندے کی حیثیت سے مملکت کے وجود کو لازمی اور بنیادی ضرورت قرار دیتا ہے دینا کے بڑے اور معلوم مذاہب میں سے کسی اور مذہب کی ابتدائی تاریخ میں اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ بانی مذہب نے عبادتِ آلہی اور تزکیہ نفس کے برابر قیام مملکت اور انصرام سلطنت کو اہمیت دی ہو۔ چنانچہ بدھ مذہب اور عیسائیت کے بانیوں کے متعلق تو یہ سب پر روشن ہے کہ وہ ترکِ دنیا کے مبلغ تھے، اور بدھ مذہب کے بانی ساکھیا منی کے بارے میں تمام مستند روایات یہ ہیں کہ سلطنت کو انہوں نے بُری شئے سمجھ کر ٹھکرا دیا تھا، اس لئے ان دونوں مذاہب کی ابتدائی تاریخ میں قیام مملکت یا حصول اقتدار کی مساعی جمیلہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ کنفیوشی مت دنیا کا ایسا مذہب ہے جو اصلاً نظم مملکت کے لئے قائم ہوا تھا لیکن اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ بانی مذہب حکیم کنفیوشس کو عہدۂ حکومت سے محروم ہونا پڑا۔ اور عرصہ دراز کی جدوجہد کے باوجود حصول اقتدار کی کوشش میں ناکام ہوکر دل شکستہ مرا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ آخری وقت اس کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:-

''کوئی سمجھدار حکمران ایسا پیدا نہیں ہوا جو مجھے اپنا معلّم بنائے''۔ لیکن تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ خود پیغمبر اسلام کی زندگی میں مسلمانوں کی ایک مثالی حکومت

قائم اور کامیابی سے برسرِ کار تھی۔ چنانچہ لاہور کے بین الاقوامی مذاکرہ میں ہیمبرگ یونیورسٹی جرمنی کے ڈاکٹر بریٹولڈ اسپو پیغمبرِ اسلام کے بارے میں کہتے ہیں:۔

''اس طرح آپ کو اپنی حیات ہی میں ایسی کامیابی حاصل ہو گئی جو اور کسی عالمی مذہب کے بانی کے حصے میں نہ آئی تھی' گوتم بدھ عمرِ طبعی کو پہونچنے کے بعد فوت ہوئے لیکن انہیں کوئی سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں یہ دونوں باتیں جمع نظر آتی ہیں۔ وہ اپنی قوم کے سیاسی عقائد بھی تھے اور پیغمبر بھی۔ لیکن دینِ موسیٰ کا ایسے مذاہب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جنہیں کوئی عالمگیر حیثیت حاصل ہوئی اور مختلف اقوام اس کی حلقہ بگوش ہوئیں''۔(31)

## (د) مساوات واخوت

اس مساوات کے دو نمایاں پہلو معاشی مساوات اور سیاسی مساوات ہیں۔ معاشی مساوات کا اثر یہ تھا کہ پوری اسلامی تاریخ میں معاشرتی انصاف (کبھی کم اور کبھی زیادہ ہی) لیکن باقی رہا اور معدوم نہ ہو سکا۔ زکوٰۃ اس مساوات کا ضامن ہے۔ سیاسی مساوات کا نتیجہ تھا کہ نسلی امتیازات اور ناقابلیتیں اسلام معاشرہ کے اندر سر نہ اٹھا سکیں۔ ہر نسل اور طبقے کے مسلمان اسلامی مملکت میں مساوی حقوق اور مراعات کے حصہ دار تھے۔ اس طرح نسل پرستی اور محدود قومیت کے خلاف اسلامی تصورِ سیاسی کی یہ قوت اتنی عظیم الشان ہے کہ موجودہ دور کے ایک بڑے مبصر اور مورخ ٹائن بی کو اس کا شدت سے احساس ہوا۔

دو باہم مسلمانوں کے درمیان نسلی غرور واحساس کا فقدان اسلام کی نمایاں' اخلاقی کامیابیوں میں سے ایک ہے اور ہم عصر دنیا میں اسلامی خوبی کی اشاعت کی

---

اسلام

ضرورت بے حد شدید ہے' کیونکہ اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود کہ تاریخی ریکارڈ سے بحیثیت مجموعی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نسلی احساس (صورت حال کی ہلاکت آفرینی یہ ہے کہ یہ نسلی احساس بڑی شدت سے محسوس کیا جاتا ہے) کی شکار وہ اقوام ہیں جو گذشتہ چار صدیوں میں باہمی مسابقت کرتی رہی ہیں' ان میں متعدد وہ مغربی اقوام ہیں جنہوں نے کم از کم عارضی طور پر ہی روئے زمین کی میراث میں اصلی حصہ حاصل کیا ہے۔(32)

اس طرح وہ اپنی کتاب میں اسلام پر اپنے پر مغز مقالہ میں لکھتا ہے کہ نسل انسانی کو تباہی سے بچانے میں اسلامی تعلیمات کی دو خصوصیات (منشیات اور قومیت پرستی کی ممانعت) ضامن ہو سکتی ہیں۔ اس کے حسب ذیل جملے کا سیاق و سباق یہی ہے۔

> "چنانچہ مستقبل کے پیش نظر ہم یہ رائے ظاہر کر سکتے ہیں کہ وہ دو گراں بہا موثرات جن کو اسلام اس مغربی معاشرہ کے مرنجاں مرنج پر دلوتار (عوامی نظام) پر عائد کر سکتا ہے جس نے سارے عالم کو اپنے جال میں گھیر رکھا اور ساری بنی نوع انسان کو محیط ہے۔ مستقبل بعید کے تعلق سے ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ مذہب کی ایک نئی تعبیر کے ذریعہ اسلام امکانی مدد کرے گا"۔

## (ھ) سیاسی وحدت و مرکزیت

جس طرح اسلام نسلی قومیت کا مخالف اور عام انسانی اخوات و وحدت و مساوات کا قائل ہے اسی طرح وہ اس زمانے سے اس کا قائل ہے جبکہ اقوام عالم کے لئے یہ تخیل انوکھا اور ناقابل عمل و لحاظ تھا۔ اسلام میں خلافت کا ادارہ اسی اصول کا ترجمان رہا ہے کہ تمام اسلامی اقوام اور ممالک ایک مرکزی اقتدار کے تابع رہیں۔

اسلام

تا کہ مختلف جماعتوں کے محدود مفادات اور نسلی تعصّبات سر نہ اُٹھا سکیں، اور باہمی جدال وقتال کے ذریعہ نوع انسانی کی ترقی میں رکاوٹ نہ بن سکیں چنانچہ اس کا احساس بعض بے تعصب اور حقیقت شناس مبصرین کو بھی ہے۔

''اس کے برخلاف ماضی قریب نے سیاسی اسلام کے حیرتناک احیاء کا نظارہ دیکھا ہے یہ امر ملحوظ خاطر رہے کہ اسلام بمقابلہ عیسائیت مملکت اور معاشرے سے گہرے طور پر وابستہ ہے'' کلیسا اور حکومت کی تفریق اسلام کے نزدیک ناقابل قبول ہے نتیجہ یہ ہے کہ تمام نئی مملکتیں کم یا زیادہ سلطنتوں کے مختلف عقائد کا شکار ہیں۔ اسلام مافوق القوم ہے وہ اپنی اصلی شکل میں اقوام کے اقتدار اعلیٰ کا منکر ہے جس کو وہ مادہ پرست مغرب کی اجنبی پیداوار خیال کرتا ہے' سلفی ملت اسلامیہ کے جدید اتحاد کو جوش رکھتے ہیں جو قومی مملکتوں کے حدود کو توڑ کر آگے نکل جائے۔ قومیت جہاں مسلم اقوام کو علیحدہ کرنے کا رجحان رکھتی ہے وہاں اسلام کی نشاۃ ثانیہ ایک دو پارہ ملانے اور عملاً کرنے والی عامل بن گئی ہے''۔(33)

سائنس کی غیر معمولی ترقی کے باعث جہاں ایک طرف فاصلے کم ہوتے جا رہے ہیں وہاں دوسری طرف ان غیر معمولی فطری اور مادّی طاقتوں کو قابو میں رکھنے کی ضرورت شدید تر ہوتی جا رہی ہے جو جغرافی اور نسلی قوم پرستی کے ظالم ہاتھوں میں ہلاکت کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اس خطرہ کو دور کرنے کیلئے جس مشترکہ طاقت اور اجتماعی نگرانی کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے مسلمانوں کا سیاسی نظریہ ایک موثر ضمانت ہے۔ اس لئے کہ مسلمان ایسی ہر مستحسن کوشش میں مذہبی عقیدہ کے طور پر سب سے بڑے حامی و معاون ثابت ہوتے ہیں کیونکہ مسلمان حربی اہمیت کے علاقوں میں نہایت اہم مقام رکھتے ہیں۔ یورپ کو چھوڑ کر (جہاں ترکی اور البانیہ کی وجہ سے ان کا کچھ نہ

اسلام

کچھ حصہ ضرور ہے) پرانی دنیا کے بقیہ تینوں اہم خطوں' افریقہ' مشرقی وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں وہ بے حد سیاسی اہمیت کے حامل ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے بارے میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ کیا بلحاظ رقبہ اور کیا بلحاظ آبادی وہ دیگر تمام مذاہب کے پیرووں کے مقابلے میں مکمل اکثریت رکھتے ہیں۔ افریقہ میں بھی انہیں بلحاظ رقبہ اور آبادی اکثریت حاصل ہے افریقہ اور مشرق وسطیٰ کے بارے میں اسپیسر (Speiser) کا یہ قول یاد رکھنے کے قابل ہے۔

''جہاں سب سے زیادہ آسانی سے امن میں خلل ڈالا جا سکتا ہے وہ ایسا مقام ہے جہاں بین الممالک نزاعات کا اندیشہ شدید ترین ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق قریب دنیا کے مرکزِ ثقل اور نئی نزاعات کی پرورش گاہ کی حیثیت سے یورپ کی جگہ لے رہا ہے''۔(34)

اب رہ گیا جنوب مشرقی ایشیا جو دنیا کے تمام بڑے مذاہب کا سنگم اور عالمی طاقتوں کا اکھاڑہ ہے۔ یہاں بھی مسلمان انفرادی طور پر اگر واحد قابل لحاظ سیاسی طاقت نہیں تو ایسی ایک طاقت ضرور ہیں' اس علاقے میں اگرچہ بلحاظ آبادی ہندو مسلمانوں سے کسی قدر بڑھے ہوئے ہیں لیکن دو وجوہ سے اس کی تلافی ہو جاتی' اور مسلمان ہندوؤں کے برابر طاقتور ہو جاتے ہیں' پہلی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں ایک ہندو ملک (بھارت) کے مقابلے میں کم از کم سات مسلم علاقے (ملایا' انڈونیشیا' بورنیو' سراواک' برونی' پاکستان اور کشمیر) ہیں جن میں سے اس وقت تین (انڈونیشیا' ملایا اور پاکستان) آزاد ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس علاقے سے متصل کئی کروڑ مسلمان پائے جاتے ہیں۔

## (د) مسلمانوں کی قوتِ مدافعت

مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ کے ریکارڈ سے یہ امر ثابت ہے کہ وہ ترقی

یافتہ آلات حرب سے محروم ہونے کے باوجود مخالف حالات کی کامیاب مقاومت کر سکتے ہیں۔ گذشتہ دوصدیاں اسلام کی تاریخ کا تاریک ترین دور ہے۔ ان کا سیاسی زوال انتہائی تھا لیکن تمام مخالف قوتوں کے نرغے میں گھر جانے اور دوسروں کے محکوم ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے مذاہب اور اپنے انفرادی وجود کو باقی رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ اپنے مرکز سے دور دراز کے ممالک میں بھی مخالف ومعاند طاقتوں سے صدیوں کی کشمکش کے باوجود آج بھی ان کی اکثریت اور مذہبی اسپرٹ باقی ہے' اس کی صرف ایک مستثنیٰ صورت اسپین کی ہے جو دراصل مرکز (خلافت عباسیہ) سے بغاوت کا نتیجہ ہے نہ کہ اسلام کی کمزوری ع

عذرائے چہرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اس ایک نقصان کے مقابلے میں اسلام کی اس توسیع کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا' جو ان کے گذشتہ دورِ تنزل ومحکومی میں بھی (خصوصاً براعظم افریقہ) عمل میں آئی ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسروں کا تو کیا ذکر' عیسائیت کی گذشتہ دوصد سالہ سہ صد سالہ تاریخ سے بھی جو اس کے انتہائی عروج اور سیاسی غلبہ کی تاریخ ہے صاف طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مذہبی اور نظریاتی میدانوں میں مسلمانوں کو ان کی اپنی عملداری یا حلقہ اثر میں شکست دینے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اس کی مذہبی اور سیاسی فتوحات کا دائرہ اسلام کے تاریخی دائرۂ اثر سے باہر یعنی یورپ اور نئی دنیا (امریکہ وآسٹریلیا) تک محدود رہا جس میں اس کو سرے سے اسلام کا مقابلہ نہیں کرنا پڑا۔[1] اس کے برخلاف اسلام کی اشاعت کی تاریخی کہانی کچھ اور ظاہر کرتی ہے۔

---

[1] اسلام

# BUDDHISM

# بدھ مذہب

چھٹی صدی ق م میں دنیا کے اکثر متمدن علاقوں میں بعض نئی مذہبی تحریکیں اُٹھیں جنہوں نے فرسودہ رسم و رواج اور قدیم مذاہب کی پیچیدگیوں کے خلاف موثر آواز بلند کی۔ ایران میں زردتشت نے قدیم ایرانی مذہب کے عقائد میں زبردست تبدیلیاں کر کے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ چین میں کنفیوشس نے اخلاق اور سیاست کو مذہب کا جزو بنا کر نئے خیالات کی اشاعت کی تھی۔ ہندوستان میں ذات پات کی کڑی تقسیم کے خلاف بے چینی کا ردِعمل یہ ہوا کہ جین مت اور بدھ مت کے اشاعت زوروں پر ہوئی اور برہمنوں کے ظلم و تشدد سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ گوتم بدھ نے انسان اور انسان کے درمیان تفریق کے خلاف بغاوت کی اور اونچ نیچ کے فرق کو ختم کرنے کی انتہاء کوشش کی۔ اس کے نزدیک برہمن اور شودر کا مساوی درجہ تھا۔ فرق صرف عمل کا تھا۔ ایک برہمن اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے شودر کے مقام تک پہنچ سکتا تھا اور ایک شودر اپنے نیک اعمال کی بناء پر برہمن کے رتبہ کو حاصل کر سکتا تھا۔ اس نے ذات پات کی تقسیم ختم کر کے لوگوں کو سچائی اور پاکیزگی کی تعلیم دی۔ گوتم بدھ کی زندگی میں ہی اس کی تعلیمات ہندوستان کے ہر کونے میں پہونچ گئیں اور تیسری صدی ق م میں بدھ مذہب کو ہندوستان کی اکثریت نے قبول کر لیا اور اسے اشوک اور کنشک جیسے راجاؤں کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ بدھ مذہب کی تعلیمات اس کی اشاعت

اور ہندوستان میں اس کے زوال کے اسباب کی تفصیلات جاننے سے پہلے گوتم بدھ کی سوانح حیات کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے کیونکہ بدھ مذہب کے بانی کی زندگی مذہب کی تعلیمات اور اشاعت پر بہت کافی اثر انداز ہوئی تھی۔

(بدھ مذہب کے بانی گوتم ہیں جن کا لقب ساکھیا منی تھا جو بعد میں بدھ کے نام سے موسوم ہوئے' یہ کپلا وستو کے مقام پر جو نیپال کے جنوب میں واقع ہے پانچویں صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ (تمدن ہند' مصنفہ لی بان' ترجمہ سید علی بلگرامی' مطبوعہ مطبع شمسی آگرہ)

## گوتم بدھ کا عہد

(مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی' تاریخ ہند جلد اول' نظر ثانی طبع دوم عبدالمجید صدیقی ایم۔اے۔ ایل ایل بی مطبوعہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ ۱۹۳۹ء میں لکھتے ہیں:

> "اس بناء پر گوتم بدھ کی پیدائش ۵۶۸ء قبل مسیح میں ہوئی۔ کیونکہ اس کی عمر کے متعلق یہ امر عام طور پر مسلّم ہے کہ وہ اسی سال تک زندہ رہا۔ لہذا مذکورہ بالا سن ولادت کو درست مان لیا جائے تو اُس کی وفات ۴۸۸ قبل مسیح میں ہوگی' اور متعدد قرائن سے یہی دونوں سن قریب قریب صحیح ثابت ہوتے ہیں"۔

کہا جاتا ہے کہ گوتم بدھ شاہی خاندان میں پیدا ہوئے ناز ونعم سے پلے' جوان ہوئے اور خوبصورت بیوی سے شادی بھی کی۔ لیکن ایک دن تین واقعات ایسے پیش آئے کہ جن کی وجہ سے ان کے خیالات کی رو یکسر مبدّل ہوگئی' پہلا واقعہ یہ تھا کہ انھوں نے ایک بوڑھے کو دیکھا جس کی کمر ضعیفی سے بالکل جھک گئی تھی اور وہ بمشکل چل پھر سکتا

تھا' دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ انہوں نے ایک طاعون کا مریض دیکھا جو مرض کی شدت سے اینٹھا جاتا تھا' پھر تیسرے واقعہ کے طور پر ایک مردہ کو دیکھا جس کی شکل بالکل بدل گئی تھی۔ ان تین واقعات سے انسانی زندگی کی بے حقیقتی و بے ثباتی گوتم بدھ پر واضح ہوگئی۔ اس لئے انہوں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اس انسانی زندگی کے مصائب و آلام اور مصیبت کے اسباب معلوم کریں جو دنیوی زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔

پنڈت رادھا کرشنن کا بیان یہ ہے کہ تین کے بجائے چار واقعات پیش آئے' چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

''چار مرتبہ جب وہ اپنے محل سے باہر نکلا تو عام کہانی کے مطابق وہ ایک بوڑھے آدمی سے ملاقی ہوا اور محسوس کیا کہ وہ خود بھی ضعیفی اور مجبوری کا شکار ہوسکتا ہے' ایک بیمار کو دیکھا تو محسوس کیا کہ وہ خود بھی بیمار ہوسکتا ہے' ایک مُردے کو دیکھا تو محسوس کیا کہ ایک دن ان کا بھی یہی حشر ہوگا۔ لیکن اس کے برخلاف اس نے ایک تارک الدنیا فقیر کو دیکھا جس کے چہرہ سے اطمینان اور مسرّت کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں' کیونکہ اس نے متلاشی حق کا روایتی مسلک اختیار کیا تھا۔ گوتم بدھ نے بنا برآں طے کر لیا کہ وہ بُڑھاپے' بیماری اور موت سے اس سادھو کے نقش قدم پر چل کر رہائی حاصل کر لے گا۔ سادھو گوتم بدھ سے کہتا ہے میں سارامنا ایک راہب ہوں' جس نے پیدائش اور پھر موت کے ڈر سے آزادی حاصل کرنے کیلئے عائلی زندگی کو تیاگ دیا ہے۔ اس مقدس آدمی کے دیدار نے جو باوجود زندگی کی ہر قسم کی لذت سے محروم رہنے کے جسمانی حیثیت سے مضبوط اور قلبی اعتبار سے مسرور و شاداں تھا' گوتم بدھ کو بے حد متاثر کیا اور اُس کے دل میں یہ اذعان پیدا ہوا کہ انسان کی شایان شان منزل مقصود مذہب (حق گوئی و صداقت پر مبنی اُصولوں) کی تلاش ہے۔ (35)

---

بدُھ مذہب

کہا جاتا ہے کہ یہ عرفان گوتم کو ایک درخت کے نیچے حاصل ہوا تھا' جہاں وہ مراقبہ میں بیٹھے تھے۔ اب وہ 'مقام بدھ گیا' کے نام سے مشہور ہے۔ اس لئے انہوں نے ترکِ دنیا کی ٹھانی اور مراقبہ کرنے لگے۔ اس میں بیان کیا جاتا ہے کہ انہیں تین آزمائشیں پیش آئیں:۔ (۱) جنگل کے اندر شیاطین نے انہیں گھیر لیا اور دل میں ہمہ اقسام کے وسوسے ڈالے۔ (۲) دوسرے حوروں کے جم غفیر نے انہیں گھیر لیا۔ تیسرے ملک الشیاطین خود آیا اور عالم کی حکومت اور شان کی پیشکش کی۔ لیکن گوتم نے اس کو ٹھکرا دیا اور شیطان کی فوج شکست کھا کر بھاگ گئی۔ اس پر ہاتف کی آواز آئی:۔

> ''دیوتا اسے موتیوں کے ہار اور نشان و پرچم دے رہے ہیں' وہ اس پر صندل کا برادہ اور پھول نچھاور کر رہے ہیں' وہ خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے جواں مرد دشمن کی فوج نے تیرے درخت کا محاصرہ کرنے کے بعد بالآخر تجھ سے شکست کھائی۔ اس مقام پر آج تجھے عرفان صداقت خالی از شہواتِ نفسانی حاصل ہو چکا اور تجھے بدھ کی ساری حکومت ملے گی' کیونکہ تو نے اپنی شیریں کلامی سے شیطان کی فوج پر فتح پالی''۔

## بدھ مذہب کی تعلیم کی غرض وغایت

''بدھ مذہب کی غایت یہ ہے کہ انسان اسی دنیاوی زندگی میں نروان حاصل کرے۔ نروان' نفس کی اُس حالت مطمئنہ کا نام ہے جس میں دنیوی افکار و آلام کا دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہی وہ شئے ہے جسے حاصل کرنے کے بعد آدمی بدھ مت کی اصطلاح میں ''ارہٹ'' کے مرتبہ پر فائز ہوتا ہے۔ یعنی اب وہ اخلاقی برائیوں کے جراثیم سے پاک ہے' اس کی ناپاکیاں دُھل گئیں' اس نے اپنا کام پُورا کر لیا۔ اپنا بوجھ

اتار لیا' بند جدا کر لئے اور آواگون (تناسخ) کے چکر سے نجات حاصل کر لی۔(36)

اصل میں بقول لی بان:-

"ابتدائی بدھ مذہب محض ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاق تھا' لیکن بتدریج بدھ مذہب باضابطہ مذہب بن گیا' اور اس میں بھی دیوتا اور رسوم و اعمال و عبادت و فلسفہ شامل ہو گئے' اور برہمنی مذہب کی طرح بدھ مذہب میں فرقے ہو گئے' اور بدھ کی مورت بن گئی۔(36)"

## بدھ مذہب کے چار اُصولی حقائق

لی بان کے الفاظ میں بدھ مذہب کے اصولی حقائق یہ ہیں:-

(۱) ("اے راہبو! یہ ہیں وہ چار محترم حقائق: اوّل دنیوی مصیبت' دوم' دنیوی مصیبت کی جڑ۔ سوم' دنیوی مصیبت کا معلوم ہو جانا' چہارم' دنیوی مصیبت کو معلوم کرنے کا طریقہ۔)

ان چار بنیادی حقائق پر غور کرنے سے یہ چیز پورے طور پر منکشف ہو جاتی ہے کہ اصل میں گوتم بدھ کی تعلیم تقدیر انسانی پر زوال یقین کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ سر رادھا کرشنن اپنی کتاب "انڈین فلاسفی" (Indian Philosiphy) کے صفحات ۳۶۲ اور ۳۶۳ پر لکھتے ہیں:-

"شاید افلاس و غربت کو غیر معمولی حد تک بڑھانے چڑھانے کے راہبانہ تخیلات اپنی ذات کی قربانی کو نمایاں کرنے کا جذبہ اور ترک دنیا کی آسودگی نے گوتم بدھ کے دل و دماغ کو بالکل مسخر کر لیا تھا۔ اس فانی دنیا سے نکل بھاگنے کی آرزو کا لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دینا اس دنیا کی تاریکی کو اس حد تک بڑھا چڑھا کر بیان کرنا کہ چاہے ہم

کتنا ہی مسرت اور خوشی کو پھیلانے' اور ہر قسم کی معاشرتی ناانصافی کو دبانے کی کوشش کریں لیکن انسان کو اطمینان قلب حاصل نہیں ہو سکتا''۔

کہا جاتا ہے کہ ان تجربات کے بعد گوتم بدھ نے اپنے مذہب کی اشاعت کیلئے ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کیا' اور اسی ضمن میں وہ بنارس بھی گئے' اور اپنے ان پانچ چیلوں سے مل کر ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جو غیر مطمئن بنارس چلے گئے تھے۔ اس طرح تبلیغ مذہب کے ذریعہ انہوں نے مختلف مقامات پر اپنے مراکز (وہارا) قائم کئے۔تا آنکہ وہ اپنی عمر طبعی (اسی سال) کو پہونچ گئے۔اور انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا آخری وقت آن پہونچا ہے۔

(۲) ''پاوا(38) کے مقام پر ایک لوہار کندا نے گوتم کی دعوت کی' اس دعوت میں (اختلافِ روایات کی رو سے) یا تو گوشت کے ریزہ یا کسی سبزی کے باعث جس کو وہ ہضم نہ کر سکے' پیچش میں مبتلا ہوئے اور حالت غیر ہو گئی تو انہوں نے اپنی چیلے سے کہا کہ زمین پر چادر بچھا کر ان کو لٹا دے (اس پر وہ ایک شیر کی طرح لیٹ گئے' اور ہزاروں راہبوں اور دیگر پیرووں کو پند و نصائح کئے۔ان کے آخری الفاظ یہ تھے:

''راہبو مجھ کو تم سے مزید کچھ کہنا نہیں سوائے اس کے کہ ہر ایک مرکب شئے فنا پذیر ہے۔نجات کیلئے کوشش کرو۔ ان کی باقیات کو شاہی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا''۔

## بدھ مت کی تعلیم کا گوتم کا مرکزی نقطہ

گوتم بدھ کی تعلیم کو دو حصوں (فلسفیانہ اور اخلاقی) میں تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔لیکن بدھ کے فلسفہ کا بنیادی عقیدہ ''نظریہ

علت'' ہے اس نظریہ کے مطابق انسان کا مسلسل وجود اور بقا علت اور معلول کے ایک چکر سے وابستہ ہے' اسی کو اصلاح میں ''دھرم کا چکر'' (دھر ما ککر) کہتے ہیں۔ گوتم بدھ کا دوسرا اہم نظریہ وہ چار اعلیٰ صداقتیں ہیں جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں' اور جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے دو اصول بالکلیہ قنوطی ہیں' اور آخری دو اصولوں میں کسی حد تک رجائی پہلو پایا جاتا ہے۔ (39) کہا جاتا ہے کہ حصول نجات (نروان) کیلئے اس نے درمیانی راستہ اختیار کیا جس کے ذریعہ راہی دونوں انتہائیوں سے بچتا ہے' نہ تو وہ فنائے ذات کا طریق اختیار کرتا ہے اور نہ خود پرستی کا اس طریق اعتدال کے متعلق بدھ کے حسب ذیل مقولہ کا حوالہ دیا جاتا ہے:

ہر ایک معصیت سے بچو
ہر ایک خوبی کو حاصل کرو
قلب ونظر کا تزکیہ کرو
یہ گوتم بدھ کی تعلیم ہے (صفحہ ۳۱)

بدھ کی تعلیم کا ایک دوسرا بڑا اصول کرم کا نظریہ ہے' جس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کے اعمال کی روشنی میں اس کے دوبارہ جنم کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ عقیدہ ہندو مذہب میں بھی پایا جاتا ہے لیکن گوتم بدھ اور ان کے متبعین نے اس کو بڑی ترقی دی۔ گوتم بدھ ذات پات کے قائل نہ تھے' چنانچہ وہ کہتے ہیں:۔

کوئی شخص پیدائش کی بناء پر برہمن نہیں ہو جاتا۔
کوئی شخص پیدائش کی بناء پر اچھوت نہیں ہو جاتا۔
برہمن اپنے عمل کی بناء پر برہمن ہوتا ہے۔
اچھوت اپنے عمل کی بناء پر اچھوت ہوتا ہے۔

---

بدھ مذہب

تاریخ اور بدھ مذہب کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بدھ کی تعلیم اخلاق زیادہ تر ان کے اقوال پر مبنی تھی، کسی وحی آسمانی کا پتہ نہیں چلتا۔

## بدھ مذہب کے پیرووں کے اقسام

بدھ مذہب کے پیرووں کے دو اقسام ہیں (۱) عام لوگ، (۲) راہب۔

## عام بدھ متی

ان دنیا دار لوگوں کی نجات یہ کہ وہ اونچے آسمان میں دوبارہ زندہ ہوں، اس کیلئے انہوں چاہیئے کہ وہ نیک اعمال کریں۔ راہبوں، برہمنوں اور پارسا لوگوں کو دان (خیرات) دیں، اپنے اسلاف کی پرستش کریں، اور ہر ماہ چار روزے رکھیں یہ لوگ تمام عمر احکام (یعنی سلاس) کی پیروی کا عہد کرتے ہیں، وہ کسی جاندار کی جان نہ لیں گے کوئی ایسی چیز نہ لیں گے جو عطا نہ ہو، جھوٹ نہ بولیں گے، زنا نہ کریں گے، اور منشیات استعمال نہ کریں گے، روزوں کے دنوں کیلئے تین اور ممنوعات (منکرات) ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف مردوں اور راہبہ عورتوں کے طریق زندگی کیلئے معین ومخصوص ہدایات ہیں جو کتاب ''ضبط وتزکیہ'' میں درج ہیں۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ بدھ مذہب دراصل ایک اخلاقی ضابطہ اور فلسفہ تھا جو زندگی سے غیر مطمئن اور ناکام آرزو لوگوں کیلئے بڑی دل کشی رکھتا تھا۔ اسی لئے رفتہ رفتہ اس نے ایک مستقل مذہب کی حیثیت حاصل کر لی۔ لیکن گیارھویں صدی عیسوی میں پھر وہ ایک فلسفہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ پنڈت جواہر لعل نہرو اپنی کتاب (The Discovery of India) کے صفحہ ۵۶-۵۷ پر لکھتے ہیں:-

''گیارھویں صدی عیسوی تک زمینی بدھ مت مذہب سے زیادہ

ایک فلسفہ تھا لیکن اس کو ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ اصلی اور ابتدائی بدھ مت' مذہب سے زیادہ کیا فلسفہ تھا؟''

## بدھ مذہب کی تعلیمات کی تاریخ

بدھ مذہب کی جو تعلیمات موجودہ صورت میں پائی جاتی ہیں' ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ چھٹی صدی قبل مسیح سے دوسری صدی عیسوی تک مرتب و مکمل ہوئیں۔ اس اثناء میں چار مجلسیں (کونسل) منعقد ہوئیں جن میں باہمی بحث و مباحثہ اور غور و خوض کے بعد ان کو مرتب کیا گیا۔ پہلی مجلس گوتم بدھ کی وفات کے فوراً بعد راج گڈھ کے مقام پر منعقد ہوئی' تاکہ بدھ کی تعلیمات اور عقائد کو من و عن منضبط کیا جائے۔ اسی کونسل میں انند کو (جو بدھ کا معتمد علیہ چیلہ تھا) مطعون کیا گیا۔ بہر حال تعلیمات و عقائد کا ایک مجموعہ تیار ہوا' لیکن پروفیسر اولڈ تیرک اس پہلی کونسل کی تاریخی حیثیت پر شبہ کا اظہار کرتا ہے اختلاف کے بارے میں اگسٹ کارل ریشاور (August Karl Reishawar) کہتا ہے:

> ''یہ بات تعجب خیز نہیں کہ گوتم بدھ کی وفات کے بعد اس کے پیرو باہم اپنے ہادی کی تعلیمات کے بارے میں مختلف الخیال ہو گئے۔ روایات کے مطابق ان امور کے طے کرنے کیلئے متعدد بڑی کونسلیں منعقد ہوئیں۔(40)

### دوسری کونسل

گوتم بدھ کی وفات سے ایک صدی بعد دیسائی کے مقام پر منعقد ہوئی تاکہ بدھوں کے مختلف فرقوں میں جو متضاد رسوم و عبادات رائج تھے ان کو دور کیا جائے چنانچہ

---

بدھ مذہب

دس نکات طے کئے گئے۔لیکن مقدس پاھاتے علی الاعلان ان کو ناجائز قرار دیا جس پر اس کو (ذات) برادری سے باہر کیا گیا لیکن اُس نے بدھ مت کے بعض بڑے راہبوں کے اتفاق رائے سے ان دس اصولوں کو غلط قرار دیا۔

## تیسری کونسل

پاٹلی پتر کے مقام پر بدھ متی شہنشاہ اشوک کی سرپرستی میں منعقد ہوئی اس کی ضرورت یوں پیش آئی تھی کہ بدھ مذہب دور دراز کی مختلف اقوام و قبائل میں پھیل گیا تھا۔ اور اس کی اصل روح کو برقرار رکھنا ضروری تھا۔ کیونکہ ان میں اختلافات اور رقابتیں بڑھ گئی تھیں اور باہم عقائد و تعلیمات میں فرق پیدا ہو گیا تھا۔

## چوتھی کونسل

راجہ کنشک کے زمانہ میں ان کی زیر سرپرستی (جو اشوک کی طرح بدھ مذہب کا ایک زبردست حامی اور حکمران تھا) منعقد ہوئی جس کو سن عیسوی کی پہلی صدی کے اختتام پر سندھ' کابل' کشمیر قندھار وغیرہ کا حکمران بتلایا جاتا ہے' کونسل کے مقام کے متعلق دو مختلف روایات ہیں۔ ایک کے لحاظ سے فیروز پور کے مقام پر' اور دوسری کے لحاظ سے یہ کونسل کشمیر کے مقام پر ہوئی۔ اس کونسل کا کام صرف شروع کی ترتیب و تکمیل تھا۔

نہ صرف ہندوستان کی تاریخ میں بلکہ دنیا کی تاریخ میں اشوک اپنی نیکی' رعایا پروری اور استبازی کے لئے ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ اس نے سچائی اور مذہب کے اصولوں پر بہت زیادہ زور دیا تھا اس نے اپنی رعایا کی تکلیف مٹانے کیلئے اور ملک میں خوشحالی اور امن قائم کرنے کیلئے جو کام کئے وہ آج بھی سنہری حروف سے لکھے جانے

کے قابل ہیں۔ بدھ مذہب کو اگر اشوک کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو وہ اتنی ترقی نہ کر پاتا جتنی کہ ترقی اس دور میں بدھ مذہب کو حاصل ہوگئی۔

## بدھ مذہب کی اشاعت

ہندوستان کے حکمرانوں خصوصاً مہاراجہ اشوک کے بعد مذہب اختیار کر لینے کی وجہ سے بدھ مذہب کو ہندوستان میں کافی عروج نصیب ہوا۔ اشوک اور اس کے جانشینوں کے جوش اور سعی سے بدھ مت ہندوستان سے باہر بھی پھیل گیا۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جنوب میں افغانستان اور وسطی ایشیا تک' شمال میں نیپال' تبت اور چین تک' جنوب میں سیلون تک' اور مشرق میں برما' سیام' ملایا' انڈو چائنا' انڈونیشیا ملحقہ جزائر اور جاپان تک پھیل گیا۔ لیکن یہ بدھ مت ان مختلف ممالک میں جا کر مقامی عقائد سے متاثر ہوا چنانچہ کہا جاتا ہے:۔

''اپنی توسیع کے دوران میں وہ (بدھ مت) بڑے تغیرات سے گزرا اور بعض اوقات تو اس میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ لیکن اس طرح بحیثیت مجموعی بدھ مت دراصل ایک مذہب کے بجائے مذاہب کا ایک خاندان ہے۔ عملاً اس نے مقامی مذاہب و عقائد کے ساتھ مصالحت کے ذریعہ اپنا راستہ پیدا کیا اکثر اوقات اس طرح مختلف عقائد میں امتزاج کا یہ نتیجہ پیدا ہو کہ اس میں بدھ مت کے خصوصی و امتیازی عنصر کا پتہ چلانا مشکل ہے۔ مزید برآں چین اور جاپان جیسے ممالک میں بدھ مت کے بیشتر پیرو ساتھ ساتھ اپنے اصلی قومی مذاہب کے بھی وفادار تھے جس کے باعث یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا تھا کہ بدھ مذہب کے معنی کیا ہیں۔ (۱۱)

اسی طرح چین کو قوم پرست حکومت کی وزارت اطلاعات کی رائے یہ ہے:۔

''چین کا بدھ مذہب جو ہندوستان سے پہلی صدی کے بعد داخل ہوا تھا اصل بدھ مذہب سے بہت کم مشابہت رکھتا ہے متعدد مقامی قصص، روایات، رسومات، اور فرائض کا بدھ مذہب میں اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ اس کو گہرا چینی رنگ دیا جا سکے''۔(42)

یہی حال کم و بیش جاپان، نیپال، و تبت اور جنوب مشرقی ایشیا کے بدھ ممالک جزیرہ نمائے ملایا کا حال سنیئے۔

''بدھ مذہب جزیرہ نمائے ملایا خصوصاً جزیرۂ جاوا میں بھی شائع ہو گیا، جہاں بدھ مذہب کی ایک عظیم ترین عمارتی یادگار باربوڈویر (Bordodoet) پائی جاتی ہے۔ اس عظیم الشان عمارت کے آثار دراصل پتھروں پر سوال و جواب کے ذریعہ مذہبی تلقین کا ایک نادر نمونہ ہے جس کی ہر جماعت میں بھگتوں کو ایک نئی چیز کی تعلیم ملتی تھی۔ ان جزائر میں بدھ مذہب ان ہندو نو آبادکاروں کے ذریعہ پہونچا جن کی بڑی تعداد ظاہر ہے کہ ان علاقوں سے آئی تھی جہاں بدھ مذہب مہایانا بدھ مت اور ہندو مذہب کا مخلوط مجموعہ تھا۔ گو مہایانہ بدھ مت کی خصوصیات بھی بالکل معدوم نہیں ہیں۔ اسلام کی آمد اور اشاعت نے بتدریج بدھ مت کو یہاں محو کر دیا''۔(43)

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہ جس طرح نیپال سے آیا تھا اسی طرح اب وہ نیپال اور اس کے اوپر کے ممالک تبت اور بھوٹان میں مقیم ہے۔ لیکن جس زمانے میں وہ ہندوستان میں رائج تھا اس کا حال سردار پانیکر کی زبانی سنیئے:-

''واقعہ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ناگر جونا اور اسنگا کے زمانے سے بدھ مت

کے عقیدہ میں زبردست احیاء ہوا تھا۔ اس کے بعد ہندو اور بدھ فلسفہ میں جو فرق تھا وہ بتدریج دھندلا ہو گیا''۔ (44)

ایک اور مصنف لکھتا ہے:۔

''بدھ مذہب نے بہر حال ایک آزاد مذہب کی حیثیت سے اپنے لئے مقام پیدا کر لیا اور کئی صدیوں تک ہندوستان کے بڑے حصہ کا غالب مذہب رہا، لیکن وہ بھی بالآخر ہندو مذہب سے گھل مل گیا''۔ (45)

## بدھ مذہب کے فرقے

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں گوتم کی وفات کے فوراً بعد جو کونسل منعقد ہوئی، اس کے نتیجے میں دو فرقے پیدا ہو گئے جن کے نام مہاسنگی کاس اور ستھاور وادنس تھا اور آخرالذکر فرقے سے ٹوٹ کر ایک اور فرقہ سرواستھوادنس پیدا ہو گیا۔ تیسری کونسل یعنی اشوک کے عہد تک بدھ مذہب اٹھارہ مختلف فرقوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ لیکن بدھ کی وفات کے تقریباً چار صدی بعد جو اہم تبدیلی پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ بدھ کو خدا سمجھ کر اس کی پرستش کی جانے لگی۔ حالانکہ بدھ کی تعلیم میں خدا کا کوئی تصور نہ تھا۔ اسی طرح جب بدھ مذہب ہندوستان میں کافی پھیل گیا تو وہ سرکاری مذہب بن کر طاقتور ہو گیا تو ہندو مذہب نے اس سے مصالحت کر لی جس کی علامت کے طور پر اس کو ہندو مذہب کا گیارھواں اوتار (خدا بصورت انسان) قرار دیا گیا۔ اس لئے بدھ مذہب کے بارے میں ہندو اہل قلم کی مبالغہ آرائی قابل فہم ہے۔ جس کا ایک نمونہ درج ذیل ہے:۔

''جہاں تک مستقبل قریب کا تعلق ہے، اس امر میں بہت کم شبہ ہے کہ ایشیا کے طول وعرض میں بدھ مت کے احیاء اور پوری غیر بدھ متی دنیا

میں اس کی رفتار اشاعت موجودہ صدی کے ہر ما بقی عشرہ میں تیز تر ہو جائے گی''۔(46)

## بدھ مذہب کی اقسام

بعض لوگ بدھ مذہب کی دو بڑی اقسام گناتے ہیں:۔(47)

### (۱) مہایانہ مذہب

یہ عالمگیر مذہب ہے جس کا بڑا اصول نظام عالم ہے جس کو بدھ مذہب نے دھرم یا قانون کا نام دیا ہے۔ دھرم خاص طور پر ایک ہمہ گیر نور کی صورت میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے جو ہر شئے کا خالق ہے اور یہی نور گوتم بدھ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو کامل سمجھ اور دانش کے مظہر کہلاتے ہیں۔

### (۲) ہنایانہ بدھ مت

سایا' نجات کا'' چھوٹا پھید'' یہ دراصل ہندوستان میں بدھ مت کے نظام کا نام تھا۔ یہ انسان کو'' ارہٹ'' کے درجہ سے اعلیٰ تر مقام پر نہیں پہنچاتا یہ مقام صرف ان لوگوں کو ملتا ہے جو ترکِ دنیا کرتے یعنی افلاس اور فقر اختیار کرتے ہیں۔

## الف۔ بدھ متیوں کے ساتھ عیسائیت کی مماثلت

عیسائیوں کو بدھ متیوں کے ساتھ ایک فطری ہمدردی تھی جس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ عیسائی گوتم بدھ اور مسیح کے حالات میں قریبی مشابہت دیکھتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ان دونوں مذاھب کی بنیادی تعلیمات میں مماثلت پاتے تھے۔ چنانچہ اس بارے میں لی بان لکھتا ہے:۔

(۱) اس کے حالات کی روایات جو ہم تک پہونچی ہیں وہ انجیل کی روایات

سے مشابہ ہیں مثلاً کہا جاتا ہے کہ مسیح کی طرح بدھ بھی کنواری کے بطن سے بن باپ کے پیدا ہوا' اور اس کی پیدائش کی بھی بشارتیں معجزہ کے طور پر ہو چکی تھیں' جس طرح مسیح شاہی خاندان داؤد سے تھے اسی طرح بدھ کا خاندان بھی شاہی تھا۔ (صفحہ ۲۷۴)

(۲) ان دونوں بانیانِ دین و مذاہب کے واقعاتِ زندگی کی مشابہتیں بہت کچھ پُر معنی ہو جاتی ہیں جس وقت ہم یہ خیال کریں کہ یہ دونوں مذاہب یعنی عیسائی مذہب اور بدھ مذہب اصل میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ دونوں میں دردمندی' مساوات اور زہد کی تعلیم کی گئی ہے' دونوں میں بدی کا خیال اسی قدر گناہ سمجھا گیا ہے جیسا کہ بدی کا فعل' دونوں میں درویشی طریقے اور خانقاہیں قائم ہوتی ہیں' دونوں نے ایک قسم کی تعلیم اور ایک ہی قسم کے ذرائع سے کروڑوں مخلوق پر اثر ڈالا ہے (صفحہ ۲۴۷)

اسی طرح پروفیسر ٹائن بی کہتا ہے:۔

"یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ مہایانہ بدھ مت اور عیسائیت میں دو ادارے مشترک ہیں تکلیف واذیت کی خلش کا مقابلہ کرنے کے بجائے یہ دونوں مذاہب مصیبت انگیزی کو محبت اور رحم کی تعلیمات پر عمل کرنے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں' دونوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ تصور انسان کے لئے قابل عمل ہے کیونکہ اسی ہستی عالی کی طرف سے انسان اس ابتلا کی آگ میں ڈالا گیا ہے جس نے اس اعلیٰ آئیڈیل کیلئے اپنے آپ کو مصائب میں مبتلا کر کے اس امر کا مظاہرہ کیا ہے کہ مصیبت انگیزی کی تعلیم پر عمل کرنے کی یہ ایک لازمی قیمت ہے"۔

---

بدھ مذہب

آگے چل کر ایک اور مماثلت کا ذکر کرتا ہے:۔

''عیسائیت اور بدھ مت میں سے ہر ایک کا اپنے قومی وطن سے ایک ایسے اور نئے مذہب نے دیس نکالا کیا جس نے اس قدیم مذہب سے اپنے لئے روحانی رہنمائی حاصل کی تھی۔ جس کی اب وہ مخالفت کر کے اس کو بیدخل کر رہا تھا۔ عیسائیت کو اسلام نے جنوب مغربی ایشیا سے بیدخل کیا اور بدھ مذہب کو اس ہندو مذہب نے بیدخل کیا جو بدھ مت کے بعد نیا تھا اور جس کا فلسفہ بدھ امتی اصل کی نا قابل محو نشانیاں رکھتا ہے۔(48)

The Historians approach to Religions. Geoffe Cumberlege, Oxford University Press, 195

# بدھ مذہب کا زوال

اشوک کی وفات (۲۳۱ ق م) کے بعد جب موریہ سلطنت زوال کے دور میں داخل ہوگئی تو بدھ مذہب کا زوال بھی شروع ہوگیا اور اس کے اندر ایسی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں جنہوں نے بدھ مذہب کی سادگی کو بالکل ختم کر دیا۔ مورخین نے بدھ مذہب کے زوال کے مندرجہ زیل اسباب بیان کئے ہیں۔

ا۔ بدھ مذہب کی دوسری کونسل کے بعد سے بدھ مذہب میں فرقے پیدا ہو گئے تھے۔ ان کی تعداد کم ہونے کے بجائے بڑھتی رہی۔ اشوک کے زمانے میں فرقوں کی آپس میں مخالفت میں کمی آ گئی تھی۔ لیکن اشوک کے بعد آپس کی مخالفت زور پکڑ گئی مختلف فرقوں میں مختلف رسومات داخل ہوگئیں اور وہ مذہب جو رسومات کو ختم کرنے آیا تھا خود رسومات کا شکار ہوگیا۔

۲۔ بدھ مذہب میں روح اور کائنات کے خالق (برہما یا خدا) کا تصور نہیں تھا اس کے مقابلے میں ہندو مذہب میں خدا کا تصور کسی نہ کسی صورت میں موجود تھا اور یہ بدھ مذہب کی بنیادی کمزوری تھی جو ہندو مت کے مقابلہ میں موجود تھی۔ جب تک خالق اور مخلوق کے تعلقات کی وضاحت نہ ہو کوئی مذہبی تحریک زیادہ عرصہ تک اپنا وقار قائم نہیں رکھ سکتی۔ بدھ مذہب کی اس بنیادی کمزوری سے برہمنوں نے فائدہ اٹھایا اور انہیں جب بھی موقع ملا انہوں نے پرآتما اور برہما کے تصور اور عبادت پر زور دیا۔

۳۔ ہندو مذہب کسی ایک عقیدہ کا نام نہیں تھا بلکہ اس کے اندر مختلف عقیدے شامل تھے۔ اس کے اندر دیگر مذاہب اور عقائد کو قبول کرنے اور انہیں اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ جب بدھ مذہب مختلف فرقوں میں بٹ گیا اور گوتم بدھ کی عبادت کی جانے لگی تو ہندو مذہب نے گوتم بدھ کو اپنے اوتاروں میں شامل کر لیا اور بدھ مت کو اپنے مذہب کا ایک حصہ بنا لیا۔ بدھ مذہب دراصل ہندو مذہب کے عقائد سے اختلاف کی صورت میں وجود میں آیا تھا۔ جب وہی عقائد بدھ مذہب میں داخل ہو گئے تو ہندو مت سے علیحدگی کی شکل بھی ختم ہو گئی اور ہندوستان میں بدھ مذہب بڑی حد تک ہندو مت میں جذب ہو گیا۔

۴۔ بدھ مذہب دنیا سے بیزاری' خواہشات سے انحراف اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے پر زور دیتا تھا جو قدرتی اصول نہیں تھے۔ اگر کسی ملک کی اکثریت بھکشو بن جائے تو اس ملک کی سیاست اور اقتصادیات کا دیوالیہ ہو جانا ضروری ہے بادشاہوں کی سرپرستی میں تو لوگ بھکشو بن سکتے تھے مگر جب بادشاہوں کی سرپرستی ختم ہو گئی تو غیر فطری مذہب پر بھی زوال آ گیا۔ ہندوستان میں اشوک اور اس کے جانشینوں کے بعد ایسے خاندان برسر اقتدار آئے جو بدھ مذہب کی بے عملی سے زیادہ ہندو مذہب کی عملی

صلاحیتوں سے متاثر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ برہمنوں کا اقتدار پھر سے قائم ہو گیا اور انہوں نے بدھ مذہب کے ساتھ وہ رواداری نہیں برتی جو اشوک نے ہندو مذہب کے ساتھ برتی تھی۔

۵۔ جب بھکشوؤں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہو گئی تو ان کی سادہ اور پارسا زندگیوں میں انقلاب آ گیا۔ جنہوں نے دنیا کو ترک کر دیا تھا وہ عیش وعشرت کے دلدادہ بن گئے اور ان کی بداخلاقی کے چرچے پھیلنے لگے۔ عوام میں ان کی قدر و منزلت کم ہو گئی' جو بھکشو مذہب کی اشاعت کا باعث بنے تھے وہ ہی اس کے زوال کے اسباب میں مزید اضافہ کے باعث ہوئے۔

ان اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے بدھ مذہب کے اثرات کم ہونے شروع ہوئے اور اس حد تک کم ہو گئے کہ یہ شبہ ہونے لگا کہ کیا بدھ مذہب نے واقعی ہندوستان ہی میں جنم لیا تھا؟ جس سرزمین پر گوتم بدھ اور اشوک نے بدھ مذہب کی اشاعت کی تھی وہیں سے اس مذہب کا نام ونشان مٹ گیا۔ لیکن اشوک کے زمانے میں بدھ مذہب کے پرچارک ہندوستان سے باہر جا چکے تھے اور ان کی کوششوں سے بدھ مذہب دیگر ممالک میں پھیل رہا تھا لنکا' برما' سیام' ملایا' انڈو چائنا' انڈونیشیا' جاپان' چین اور تبت میں بدھ مذہب کافی تیزی کے ساتھ پھیلا۔ لیکن اس کی یہ اشاعت دراصل اس وقت ہوئی جب اس نے مقامی مذاہب اور عقائد کے ساتھ مصالحت کر لی اور اپنی بعض خصوصیات کو ترک کر دیا۔ بعض ممالک مثلاً چین اور جاپان میں تو گوتم بدھ کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ فرضی قصوں' روایات اور رسومات کو بھی بدھ مذہب کا ضروری جزو قرار دے دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جن دیگر بیرونی ممالک میں بدھ مذہب کی اشاعت ہوئی تھی وہاں بھی بدھ مذہب اپنی اصلی شکل میں نہ رہ سکا اور اسے مقامی مذاہب اور عقائد کو بڑی حد تک قبول کرنا پڑا۔

# تاؤمت

# TAOISM

# ٹاؤمت

ٹاؤمت چین کے تین بڑے مقامی مذاہب کنفیوشی مت' بدھ مت اور ٹاؤمت میں سے ایک ہے۔ بدھ مت کے برخلاف کنفیوشی مت کی طرح ٹاؤمت بھی چین کا مقامی اور قدیم مذہب ہے۔ (49)

# ٹاؤمت کی تاریخ

ٹاؤمت سے متعلق معلومات کا ابتدائی ذریعہ کتاب ٹاؤتھی کن (TAO THI KIN) ' ہے جو ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ اس کے دو حصے ہیں جو ۲۱ ابواب پر مشتمل ہیں۔ پہلا حصہ ٹاؤمت سے متعلق اور دوسرا حصہ ٹھی (TEH) سے متعلق ہے۔ اس کتاب کا لحاظ کرتے لاوتے (LOATSE) جو اس مذہب کا بانی ہے ۶۰۴ ق۔م میں پیدا ہوا تھا۔ یہ حکیم کنفیوشس کا ہم عصر تھا اور چاؤ کے دربار کا ایک عہدہ دار تھا۔ کہا جاتا ہے کہ حکیم کنفیوشس اس سے ملا تھا اور وہ اس کی عظمت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ لاوتے اپنی سرکاری خدمت سے بیزار ہو کر مستعفی ہو گیا اور مغربی دروں کے پرے بڑے عرصہ کے لئے غائب ہو گیا۔ ان دروں کے محافظ نے اس کو ترغیب دے کر اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ اپنی تعلیمات کے ریکارڈ کے طور پر کتاب لکھے۔ یہ کتاب ٹاؤتھی کن کہلاتی ہے۔ ۸۵ عیسوی قبل مسیح میں جو کتاب سیماچین نے لکھی ہے اس میں اس کے بیٹے' پوتے' پڑپوتے اور ذیلی اخلاف کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح میں لاوتے کی کتاب ہان شہنشاہوں کی مقبول کتاب تھی۔ اس بناء پر ایک مصنف (Legge) لیگی کا بیان یہ ہے کہ

''اس کی دانست میں دنیا میں ایسی کوئی قدیم کتاب نہیں ہے جس کی تاریخ اور سند اتنی محفوظ ہو' لیکن لوگوں نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے''۔

اس مذہب کے بانی کے نام لاؤتے کے ایک معنی قدیم فلسفی کے بھی ہیں۔ یہ مذہب لفظ ٹاؤ سے نکال ہے جس کے معنی ''ایک طریقہ'' ہے۔ چاہے وہ اخلاقی طریق ہو جس کی لوگ پیروی کریں یا وہ طرزِ عمل ہو جس پر قدرت عمل کرتی ہے' یا وہ قدرت کا قانون ہے جس پر انسان چلتا ہے۔ اس نے خدا اور اُلوہیّت کے تصور کا کوئی صاف اظہار نہیں کیا ہے۔ صرف ایک لفظ (Tien) بمعنی قدرت ایسا استعمال کیا ہے۔ جس سے توحید کا شائبہ پیدا ہوتا ہے۔ ٹاؤ کی تعلیم کا ایک مشہور نظریہ (نظریہ علم) کہلاتا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ خواہشات سے آزاد ہو کر ہم قدرت کے اسرار و رُموز علم کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ قدرت تمام معجزات کی اصل ہے۔ اس لئے اس کی معرفت کے معنی یہ ہیں کہ ہم اصل علم کو حاصل کریں' عارف کیلئے ساری دنیا کی سیر ضروری نہیں' اپنے دروازہ سے باہر گئے بغیر بھی وہ تمام چیزوں سے واقف ہوتا ہے کیونکہ قدرت ایک عالمگیر (اصول) رکھتی ہے۔

لاؤتے کی عملی تعلیم لفظ تھی (Teh) سے ظاہر ہوتی ہے۔ ٹاؤ کی طرح اس لفظ کو بھی ایک نئے معنی پہنائے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ ٹاؤ کا نتیجہ ہے جہاں ٹاؤ ختم ہوتا ہے وہیں سے تھی (Teh) شروع ہوتا ہے یہ کوشش' جدوجہد اور احساس خودی کا نام ہے۔ ٹاؤ مذہب میں اس لفظ کو عام طور پر پُراسرار' عظیم الشان اور لافانی القاب سے مزین کیا جاتا ہے۔

لاؤتے کی عملی تعلیم کی تکمیل جسمانیات اور سیاسیات سے ہوتی ہے جہاں تک اوّل الذکر کا تعلق ہے' یہ ادّعا کیا جاتا ہے کہ ٹاؤ متی فانی نہیں ہے اس لئے اس کو موت آتی ہے اور نہ وہ مر سکتا ہے۔ وہ خطرات سے محفوظ رہ سکتا ہے اس لئے ظاہری موت کی تعبیر کی جاتی ہے۔ جہاں تک لاؤتے کی سیاسیات اور اخلاقیات کا تعلق ہے بڑے دلکش افکار و خیالات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً شاہی محلات کے ناز و نعم کے ساتھ ساتھ عوام کی زبوں حالی

ٹاؤ مت

اور درماندگی، جنگ و جدال سے نفرت، ٹاؤمتی طرز حکومت عدم مداخلت پر مبنی ہے۔ کیونکہ بادشاہ خود کچھ نہیں کرتا اور ہر چیز ٹھیک طور پر ہوتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ٹاؤ مذہب کوئی نیا مذہب نہیں ہے، بلکہ یہ پہلے سے چلا آ رہا ہے جس میں لاوتسے نے ایک تنظیم پیدا کر کے مکمل بنایا۔ لاوتسے کے بعد اس مذہب کی تاریخ پورے طور پر واضح نہیں ہے۔ پھر بھی حسب ذیل اہم ترقیوں کا پتہ چلتا ہے:۔

سب سے پہلے پانچویں صدی قبل مسیح میں (Liehtse) لارسی کا ذکر کرنا ضروری ہے جس کی طرف منسوب کتاب کی صداقت مشتبہ ہے، اس کا خیال یہ تھا کہ تمام اشیاء ایک مسلسل تناسخ کا شکار ہیں جن کی انتہائی اساس مبہم ہے جو اپنے آپ کو مختلف اشکال اور اجسام میں ڈھالتی رہتی ہے۔ دوسرا شخص چانگ سے (Changtse) ہے جو ٹاؤمت کا سب سے اعلیٰ مصنف ہے۔ جو ۳۳۰ ق م میں گذرا ہے۔ باوجود اپنی انتہائی قابلیت اور ذہانت کے اس کی تصنیف میں بھی ٹاؤ مذہب کی تعلیم کے اندر کوئی ترتیب اور انضباط نہیں پایا جاتا۔ اس نے اپنے خیالات کے اظہار کیلئے مختلف ادبی شعبے اختیار کئے۔ یعنی فسانہ تمثیلی کہانیاں اور خیالی مکالمے، انہیں میں ایک جگہ حکیم کنفیوشس کو بھی ٹاؤمت کے انداز میں گفتگو کرتے ہوئے دکھلایا گیا ہے۔ غرض اس نے ٹاؤ مذہب کی بنیادی تعلیمات کو نئے نئے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کا ایک مشہور فقرہ اکثر دہرایا جاتا ہے جس میں وہ اس امر کے تصفیئے میں حیرانی کا اظہار کرتا ہے کہ:

”آیا یہ چانگ سے (Changtse) ہے جو یہ خواب دیکھ رہا ہے کہ وہ ایک تتلی ہے یا وہ ایک تتلی ہے جو یہ خواب دیکھ رہی ہے کہ وہ

''چانگ سے'' ہے۔ ''دیگر مشہور مصنفین میں فائنیٹشے نانٹسی (Hwainantce) ہیں جو ۳۳۴ ق م اور ۱۲۳ ق م میں گذرے ہیں''۔

## متاخرین کی کتابیں

بعد کے زمانے میں تاؤمت پر بہت کثرت سے کتابیں لکھی گئیں جو ان تمام مضامین کا مجموعہ ہیں جن پر تاؤمت مشتمل ہے' مثلاً ابدیت اور بقا کی تلاش' جذبات پر فتح حاصل کرنا' روزے' قربانیاں' رسوم اور عوائد' جادو' منتر اور بے شمار معبود۔ تاؤ مذہب کی تمام کتابوں کے منجملہ ''افعال اور ان کی سزا'' نامی کتاب سب سے زیادہ مقبول ہے جو سُنگ بادشاہوں کے دور میں لکھی گئی ہے۔ موجودہ زمانے کے مقبول تاؤمت کا بانی چیانگ تاؤلنگ (Changtaoling) ہے جو ۳۴ء میں گذرا ہے۔

## تاؤمت اوہام کا مجموعہ

تاؤمت دراصل اوہام کا اور جادوؤں کا ایک انبار ہے کہا جاتا ہے کہ لاؤتسے خود عالم ارواح سے چیانگ تاؤلنگ کے پاس آیا اور اس کو ایک تلوار اور دیگر ہتھیار دیئے تاکہ وہاں کے ذریعہ جنوں کے اوپر قابو حاصل کر سکے تاؤلنگ کے اخلاف میں نسلاً بعد نسلٍ ان کے اسلاف کی روحیں منتقل ہوتی ہیں۔ اور وہ ان کے اختیارات کے وارث ہیں۔ اسی بناء پر ۷۴۸ء کے بعد سے یہ لوگ شاہی فرمان کے ذریعہ ''آسمان کے مالک'' کا موروثی اعزاز رکھتے ہیں۔ یہ گویا تاؤمت کے پوپ ہیں۔ چین میں بدھ مذہب کی اشاعت کے بعد تاؤمت پر اس کا نمایاں اثر پڑا ہے۔ علی الخصوص تیسری یا چھٹی صدی عیسوی میں کیونکہ یہ لوگ اپنی کتابوں اور اعمال میں بعد مذہب کے نمونے کی پیروی کرتے ہیں اور بدھ متیوں کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے علیحدہ منادر' پروہت اور خانقاہیں ہیں۔

قدیم ٹاؤمت اور جدید ٹاؤمت میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔لیکن بہت سی خفیہ جماعتوں میں اب بھی اعلیٰ اور قدیم ٹاؤمت کا اثر غالب ہے۔لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ٹاؤمت پر کنفیوشی مت کا بھی اثر پڑا ہے۔

ٹاؤمت کی دو ہزار سال سے زیادہ کی تاریخ میں حکومت سے اس کا رشتہ مختلف قسم کا رہا ہے۔کبھی وہ حکومت کا منظورِ نظر رہا تو کبھی معتوب سُنگ حکمرانوں کے زمانے میں جنھوں نے کنفیوشی مت کو دبانے کی کوشش کی تھی ٹاؤمت حکومت کا چہیتا تھا یہ حال ہان خانوادۂ شاہی کے ابتدائی دورِ حکومت تک رہا لیکن اس کے بعد اس کے سیاسی تعلقات نے پھر پلٹا کھایا۔چھٹی صدی عیسوی میں اس کو بدھ مذہب کے مقابلے میں دبایا گیا لیکن آٹھویں صدی عیسوی میں شہنشاہ سوان ونگ نے پھر اس کو بڑھایا بعد میں کچھ اُتار چڑھاؤ کے بعد منچو حکمرانوں نے اس کو بدھ مت اور عیسائیت ہی کی طرح کنفیوشس کی مقدس تعلیم کے مقابلے میں مردود قرار دیا۔

مذکورہ بالا تاریخ اور اس کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ:۔

''ٹاؤمت کا آغاز ایک فلسفے کی حیثیت سے ہوا لیکن بعد میں چل کر اس نے ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی''۔فلسفہ کی حیثیت سے اس کا سراغ لاوتے تک ملتا ہے۔جو ۶۰۴ق م میں جدید شہر 'کوئے ئی' کے قریب پیدا ہوا تھا۔جو مشرقی ہونان میں واقع ہے۔ وہ ایک اعلیٰ دماغ مفکر، زبردست بصیرت رکھنے والا فلسفی اور ایک عظیم الشان اخلاقی معلّم تھا۔صداقت اور طریقے نیز ''کچھ نہ کرو'' سے متعلق اس کے نظریات سے اس کے کسی جدید مذہب کی بنیاد رکھنے اور اپنے آپ کو ایک مقدس انسان ثابت کرنے کے خیال کی تردید ہوتی ہے کیونکہ یہ چیز اس کی تعلیمات کے خلاف ہے۔تاہم اس کی

وفات کے سات صدیوں بعد اس کی تعلیمات کا ایک مجموعہ پایا جاتا تھا جس میں ارواح خبیثہ اور جادوگر بھی شامل تھے اور کتاب موسومہ ''ٹاؤچی چن'' (نیک طریقوں کی کتاب) ٹاؤمتیوں کی مقدس انجیل قرار پا گئی۔(50)

## ٹاؤمت کے فرقے

موجودہ چین میں ٹاؤمتی دو مکاتیب میں منقسم تھی۔ شمالی اور جنوبی شمالی مکتب مراقبہ اور مابعد الطبیعاتی تفکر اور حبس دم کی مشق پر زور دیتا ہے۔ جنوبی مکتب لنگ ہوشیان (صوبہ کویکی کیانگسی) میں ۱۹۲۷ء میں پایا جاتا تھا۔ اس کے اعلیٰ سرپرست کو ٹاؤمتی پوپ کہا جاتا ہے۔ جوان ٹاؤمتی مذہبی رہنماؤں کے نگراں ہیں جو خاندان میں رہتے ہیں اور جادو ٹونے اور ٹوٹکے کرتے ہیں اور منتر جپتے ہیں۔(51)

## ٹاؤمت کی رواداری

ٹاؤمت اپنی تعلیم اور برتاؤ میں مرنجاں مرنج سمجھا جاتا ہے چنانچہ لیوس ہاوڈ اوس اپنے پُرمغز مضمون میں لکھتا ہے ''ان (ٹاؤمت کی انجمنوں) میں سے متعدد انجمنوں نے اپنے دیوتاؤں میں دیگر مذاہب کے خصوصی دیوتاؤں اور رہنماؤں کو بھی شریک کر لیا ہے ان میں سے بعض نے اپنے قدیم معبودوں کے اوپر دیگر تمام مذاہب کے خداؤں کو درجہ بخشا ہے۔ عیسایت' اسلام' بدھ مت' کنفیوشی مت اور ٹاؤمت کو ہدایتِ آلٰہی کے مطابق نجات کے راستے سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً پیکنگ کے ایک مقامی جیل خانے میں (۱۹۱۲ء) میں ایک لکچر ہال تھا۔ صدر کی کرسی کے عقب میں پانچ تصویریں آویزاں تھیں جو حضرت مسیح' لاؤتے' حکیم کنفیوشس' جان ہووارڈ (اٹھارویں صدی عیسوی کا ایک انسان دوست) اور حضرت محمد ﷺ کی تھیں۔

# SIKHISM

# سکھ مذہب

[1] سکھ مذہب ہندوستان کی پیداوار ہے اس کے بانی گرو نانک ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی وفات ۱۵۳۹ء (53) ہے۔ کہ گرو نانک کی پیدائش (52) Luthes کی تاریخ پیدائش سے چودہ سال قبل کی ہے۔ (54)

# خاندانی حالات

گرو نانک پنجاب کے ایک کھتری خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک مسلمان زمیندار کے یہاں ملازم تھے۔ اس لئے یہ امر بعید نہیں کہ وہ اسلام سے روشناس ہوئے ہوں۔ چنانچہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ مکہ معظّمہ گئے تھے۔ الغرض وہ عام کھتریوں کے مقابلہ میں اسلام سے متاثر تھے [1] سکھوں کے بارے میں ملینیکن متعدد حوالوں سے شہنشاہ اکبر کا یہ قول نقل کرتے ہے:۔

> ''کھتری کٹّر ہندو ہوتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انہوں نے سکھوں کو ایک مذہب اور بانی مذہب عطا کیا۔ حالانکہ وہ شاذ ہی سکھ مذہب کے پیرو ہیں''۔

# سکھ مذہب کی حقیقت

[1] ایک نومسلم ہندو شیخ محمد عبیداللہ (سابق نام اننت رام) اپنی کتاب تحفۃ الہندؔ مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی کے صفحات ۷۳ اور ۷۴ پر لکھتے ہیں: [1]

فائدہ: بعضے ہندو نانک پنتھی یہ گمان رکھتے ہیں کہ ہم شرک سے خالی ہیں اور ہمارے

---

[1] سکھ مذہب

بابا نانک اور دوسرے گروؤں نے شرک نہیں کیا۔ اور بابا نانک کے کلام میں توحید کا مضمون بہت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بقول تمہارے بابا نانک نے شرک نہیں کیا تو مشرکوں سے بیزار ہو کر علیحدہ کیوں نہ ہو گئے' اور پیغمبر ﷺ کا حکم کیوں نہ مانا' اور شرک سے بچنا بھی اللہ کے نزدیک جب قبول ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول کی متابعت کرے' اور اگر یہ کہو کہ بابا نانک نے پیغمبر ﷺ کو بھی اور حضرت کی تعریف اپنی تصنیفات میں کی ہے جیسے کہا ہے کہ (باجد محمد بھگت آ جائیں) یعنی بدون متابعت ﷺ کے عبادت ضائع ہے اور یہ بھی کہا ہے:

پہلا نام خدا دا دوجا نام رسول تیجا کلمہ پڑھ لے نانکا جو درگہ پویں قبول''۔ (تاکہ درگاہ میں پڑے قبول)۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ بات حقیقت میں بابا نانک نے کہی ہے تو تم کہ بابا نانک کے چیلے ہو' اپنے گرو کا حکم مانو جلد کلمہ شریف سے اعتقاد سے پڑھو۔ مسلمان بن جاؤ۔

ا گرو نانک کے سوانح نگار کہتے ہیں کہ کبیرؔ کی طرح جن سے ایک قول کے مطابق وہ ملے تھے سکھ مذہب ایک صلح کل مذہب تھا لیکن ایک اور قول کے مطابق گرو نانک کبیر کے چیلے تھے۔ (Modern Religions Movements in India, P-360) معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سکھ مذہب میں ہندو مذہب کو اسلام کی وحدانیت کی تعلیم سے ملانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن (Encyclopadia of Religions and Ethics) کے مقالہ نگار کی رائے میں وہ دراصل برہمنی مذہب (ہندو مذہب) کی مخالفت پر مبنی تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔ ا

''معاشرتی اور سیاسی حیثیت نیز مذہبی حیثیت سے سکھ مذہب برہمن کے اقتدار اور اس کے تلقین اور نمائندہ مذہب کے خلاف تھا........

۱ اسکی تعلیم خالص توحید کی تعلیم تھی اور مذہبی رہنماؤں کے دعووں کے خلاف تھی ............ گروؤں نے کچھ مذہبی دعائیں لکھیں جو گرنتھ (سکھوں کی مذہبی کتاب) کا حصہ ہیں لیکن ان کی تعلیم کے کوئی سیاسی مقاصد نہ تھے"۔ ۱

(۲) اسی طرح (Encyclopadia of Brittanica) کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

"یہ برہمن ہندو مذہب سے اختلاف کرنے والا ایک فرقہ ہے جو پنجاب میں پیدا ہوا جہاں ان کے سکھ پیروؤں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے"۔

(۳) سر نپیل گریفن اپنی کتاب "رولرس آف انڈیا" (رنجیت سنگھ) میں لکھتا ہے:

"ہندو مذہب کے قیود و شرائط کو وہ نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور جہاں کہیں انہیں اپنے قومی فوائد کے خلاف پاتے ان پر عمل کرنے سے قطعاً انکار کرتے"۔(55)

(۴) سکھ مذہب کی تاریخ اور تعلیمات پر مشہور آریہ سماجی سر گوگل چند نانک نے (Introduction to Sikhism) کتاب لکھی۔ اس کے صفحات ۳۳۹-۳۳۸ ۱۹۰۹ء پر ہندو مذہب اور سکھ مذہب میں حسب ذیل اختلافات گنوائے گئے ہیں:

(ا) نانک کی تعلیمات کا اصلی نقطہ جو اس کو تاریخ کے اجڈ ہندو مذہب سے ممیّز کرتا ہے وہ خدائے برتر کی وحدانیت ہے۔

(ب) دوسرا اہم نقطہ جس کے بارے میں ہم عام ہندو مذہب اور سکھ مذہب میں کچھ اختلاف پاتے ہیں جیسا کہ گروؤں کی تعلیم سے ظاہر ہوتا ہے وہ بت پرستی کا فقدان ہے۔

(ج) سکھ مذہب کی تیسری خصوصیت جس کی بنیاد گوبند سنگھ نے رکھی وہ

---

سکھ مذہب

ظاہری صورت پرستی کا انکار ہے۔

(د) سکھ مذہب کی چوتھی اور آخری مخصوص علامت وہ زور ہے جو ناموں پر دیا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ایک نام کو بار بار دہرایا جائے۔ ۱

(۵) جہاں تک گرونانک کے خیالات پر اسلام اور اسلام کے عقیدۂ توحید کا تعلق ہے وہ ان کی مناجاتوں اور نظموں سے بار بار ظاہر ہوتا ہے۔ ان عقائد کے بارے میں مذکورہ بالا مصنف کا بیان ہے کہ وہ دو مرتبہ پاک پٹن میں شیخ فرید کے ہاں حاضر ہوئے اور ان کے مرید خاص شیخ ابراہیم سے فیض حاصل کیا۔ چنانچہ حسب ذیل سوال و جواب نقل کیے گئے ہیں۔

"نانک تم کہتے ہو کہ صرف ایک خدا ہے اور دوسرا کیوں ہو؟ میں کہتا ہوں خدا صرف ایک ہے اور طریق دو ہیں، کس کو اختیار کروں اور کس کو ترک؟ گرو کا جواب ہے، خدا ایک ہے اور طریق بھی ایک، ایک کو اختیار کرو اور دوسرے کو ترک کر دو۔ ہم کیوں دوسرے کی عبادت کریں۔ جو پیدا ہوا ہے اور مر جائیگا۔ نانک تم صرف ایک خدا کو یاد کرو جو بحر و بر میں پایا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف نانک جن ہندو یوگیوں کے پاس جاتے ہیں ان کی تردید کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسی ایک گفتگو کے بعد لکھا ہے۔ یوگیوں سے اپنی کامیاب گفتگو کے بعد گرو نے مکہ معظمہ کی زیارت کا تصفیہ کیا جو مسلمانوں کے کعبہ ہے۔ انہوں نے مسلمان حاجیوں کا آسمانی لباس پہنا، فقر کا عصا اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی مناجاتوں کے مجموعے کو بغل میں دبایا۔ انہوں نے اپنے ساتھ مسلمان متقی کے انداز میں ایک لوٹا اور نماز کیلئے مصلّے لیا، جس پر نماز ادا کرسکیں اور جب وقت ہوا تو انہوں نے دیگر کٹر مسلمانوں کی طرح جو پیغمبر عربی کے پیرو ہیں نماز کیلئے اذان کہی"۔

توحید کی اس تعلیم کو گرونانک پر اتنا اثر تھا کہ ایک روایت کے لحاظ سے جب وہ سیلون جاتے ہیں تو وہاں کے راجہ کے سامنے بھی اس کی تلقین کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھا

---

سکھ مذہب

ہے:۔

''بادشاہ نے دوبارہ پوچھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان' تو گرو نے اپنے پُر معنی (معمّہ) جوابات جاری رکھے' سچے گرو نے دو طریقوں کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے۔ یہ وہی ہے جو ایک خدا پر توجہ مرکوز کرتا ہے اور اس کا قلب اس سے منحرف نہیں ہوتا اور اس کو سمجھتا ہے''۔

آریہ سماجیوں سے زیادہ کٹر فرقہ پرست ہندو کا پتہ چلانا مشکل ہے جو اسلام دشمنی میں ممتاز ہو اس کے باوجود گوکل چند نارنگ سکھ مذہب پر اسلام کے اثرات سے انکار نہ کر سکے' گو اس کو اپنے مخصوص رنگ میں ظاہر کرتے ہیں:۔

''اس کا فوراً اقرار کرنا چاہیئے کہ سکھ مذہب کے وجود سے اسلام کا کسی نہ کسی قسم کا تعلق ہے واقعہ تو یہ ہے کہ اگر اسلام ہندوستان کی حدود میں داخل نہ ہوتا تو یہاں سکھ مذہب نہ ہوتا' یا موجودہ صورت میں نہ ظاہر ہوتا''

(۲) ممتاز سکھ سیاسی لیڈر اور رہنما سر جوگندر سنگھ لکھتے ہیں:۔

''حیرتناک طور پر گرونانک کی آواز بغیر کسی تغیر و تبدّل کے تمام سکھ گروؤں کی زبان سے اور ہوتی ہے جو خدا کی وحدانیت نجات کے واحد راستے کے طور پر اس کی تنہا عبادات اور رحمدل' پُر عظمت' بے خوف اور روشن دماغ زندگی۔ (مقدمہ کتاب Introduction of Sikhism, New Book Society, Lahore)

## گرونانک کی وفات اور انکے جانشینوں کا سلسلہ

۱۶۳۸ء یا ۱۶۳۹ء میں ۶۴ سال کی عمر میں گرونانک کی وفات ہوئی' وفات سے پہلے انہوں نے اپنے ایک کھشتری چیلہ کو جس کا ان سے کوئی خونی رشتہ نہ تھا اپنا

جانشین بنایا' اس کا نام انگڑھ تھا۔ کبیر کی طرح نانک کے متعلق بھی یہ افسانہ مشہور ہے کہ جب وہ مرے تو ہندو اور مسلمانوں میں اس امر پر نزاع ہوئی کہ وہ مسلمان تھے یا ہندو۔ رفع نزاع کیلئے جب چادر اُٹھائی گئی تو صرف پھول نکلے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ وہ شہنشاہ اکبر سے ملے تھے۔

## سکھوں کی مذہبی کتاب (گرنتھ)

گرو نانک نے اپنے فرقہ کیلئے مذہبی نظمیں اور مناجاتیں چھوڑی تھیں جن کو سکھوں نے بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا۔ دوسرے گرو نے گورمکھی (پنجابی) رسم الخط ایجاد کیا۔ پانچویں گرو نے ان سب کی جمع کر کے ایک کتاب بنا دی' جس میں کبیر اور پندرہ دیگر رہنماؤں کے اقوال اور گیت شامل ہیں۔ یہ آدی گرنتھ یا اصلی گرنتھ کہلاتی ہے۔ دسویں گرو نے اس میں بہت سا نیا اضافہ کیا جس کا نتیجہ گرنتھ یا سکھوں کی مقدس کتاب ہے۔ مرنے سے پہلے دسویں گرو نے سکھوں سے کہا کہ اب وہ نیا گرو نہ مقرر کریں بلکہ "گرنتھ" کو اپنا گرو قرار دیں اس وقت سے یہ مقدس کتاب (گرنتھ صاحب) سکھ فرقہ کا مرکز اور روحانی سرچشمہ ہے۔ (56)

دوسرے گرو کا ۵۳ یا ۱۵۵۲ء میں انتقال ہوا انہوں نے مرتے وقت امرو اس کو گرو مقرر کیا اور اس نے گرنتھ میں کافی مذہبی دعاؤں کا اضافہ کیا۔ انہوں نے اپنے داماد رام داس کو چیلا مقرر کیا۔ جو ۱۵۷۴ء میں جانشین گرو ہوا۔ وہ شہنشاہ اکبر کے دربار میں بھی حاضر ہوا تھا اسی نے رام دس پور کی بنیاد رکھی جو بعد میں امرتسر مشہور ہوا جو سکھوں کا مشہور مقدس مقام ہے۔

۱۵۸۱ء میں اس کا سب سے چھوٹا بیٹا ارجن دیو گرو مقرر ہوا۔ اس نے سکھ مذہب کے اندر نئی خصوصیت پیدا کی۔ یعنی فقیروں کے لباس کو لباس فاخرہ سے تبدیل کیا

اور اپنے پیروں سے عشر (دسواں حصہ) وصول کرنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے سکھ مذہب کے مشنری' کابل اور قندھار روانہ کئے۔ اس کے تعلقات مسلمانوں (مثلاً میاں میر سے اچھے تھے) اس کی اصلی دشمن لاہور کے گورنر کا وزیر مالیات اور اس کا بھائی کرتھیر چند تھے۔ جس کو خود گرو ارجن سنگھ سے بغض و کینہ تھا۔ اس نے جہانگیر کے لڑکے خسرو کو غلط باور کرا کے ارجن دیو کو گرفتار کرایا۔ جس سے بالآخر اس کی جان گئی۔ (57)

۱۶۰۶ء میں رام داس کا اکلوتا فرزند ہرگوبند جانشین ہوا۔ اس نے بھی فقیری کو چھوڑ دیا اور دو تلواریں لٹکانے لگا' جس میں سے ایک کو فقیری کی نشانی اور دوسری کا امیری کی نشانی کہا جاتا ہے۔ اس نے مغل شہنشاہوں کے خلاف جنگ کی اور گرفتار ہو کر بارہ سال (مغل شہنشاہ کی وفات تک) گوالیار کے قلعے میں نظر بند رہا۔ بالآخر تاوان دیکر رہا ہوا' اور ۱۶۴۵ء میں وفات پا گیا۔ چونکہ اس کا بیٹا گردتا اُداسی فرقہ میں شریک ہو گیا تھا اس لئے پوتا ہر راج گرو بنا۔ یہ بھی باغی شہزادے دارا شکوہ کے ساتھ سازش میں شریک ہوا' دارا شکوہ کی شکست کے بعد شہنشاہ سے درخواستِ معافی کیلئے اپنے لڑکے رام رائے کو دہلی بلایا۔ ہر رائے کا دوسرا لڑکا ہر کشن اس کا جانشین مقرر ہوا جس کا دہلی میں انتقال ہوا' اس نے قصبہ بکھلا کے ایک شخص کو اپنا جانشیں مقرر کیا تھا۔ لیکن سکھوں کے ایک گروہ نے تیغ بہادر کو گرو مقرر کیا۔ اس (تیغ بہادر) کے زمانے میں اہم واقعات پیش آئے۔ رام رائے نے اپنا ایک علیحدہ فرقہ بنایا جو ڈیرہ دون میں پایا جاتا ہے۔ دھیرمل نے جو غالبًا (ہر رائے کا بڑا بھائی تھا) تیغ بہادر کی جانشینی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ گرنتھ پر قبضہ کر لیا اور رام رائے کی جانشینی کی تائید کی۔ اپنے ہی ہم مذہبوں کی اس مخالفت نے تیغ بہادر کو پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کیا اور وہ مالو جنوبی پنجاب' کرک شیتر اور جنوبی ہند میں مارا مارا پھرتا رہا۔ بالآخر شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں گرفتار ہو کر ۱۶۷۵ء میں دہلی میں قتل ہوا۔

دسویں اور آخری گرو گوبند سنگھ ہیں جو جنگجو سکھ مذہبی حکومت کے بانی ہیں یہ ۱۶۶۶ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ انت پور میں گدی نشین ہوئے۔ ان کی پالیسی یہ تھی کہ سکھوں کو ایک اعلیٰ ذات (خالصہ) بنا دیا جائے۔ اپنے پیرووں کو انہوں نے رائے کی بجائے سنگھ کا خطاب دیا۔ ان کو کافی تعلیم ملی تھی اور وہ فوجی قائد بن گئے تھے۔ انہوں نے اپنے علاقوں کے حکمرانوں (ہندو راجاؤں) کو محصول دینے سے انکار کیا۔ جس کے نتیجہ میں ان کی ہندو راجاؤں سے لڑائی ہوئی۔ ان راجاؤں کی درخواست پر مغل شہنشاہوں کی فوج سے مقابلہ ہوا جس سے شکست پا کر وہ اور ان کے بچے گرفتار ہوئے۔ لیکن کسی طرح گرو گوبند سنگھ بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات پر گرو گوبند سنگھ نے ان کے لڑکے کا ساتھ دیا جس سے گلو خلاصی ہوئی لیکن ۱۷۰۸ء میں ایک پٹھان کے خنجر نے ان کا کام تمام کر دیا۔

## سکھوں کے طرزِ عمل میں تبدیلی کا سبب

جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ سکھ مذہب اپنے بانی کی تعلیمات کے مطابق ایک غیر سیاسی مذہب تھا چونکہ اس کے بانی اسلام سے متاثر تھے اس لئے ان کی تعلیمات میں توحید کے اثرات نمایاں تھے اس لئے مسلمانوں سے ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے لیکن ان کی وفات کے بعد ان کے بعض جانشیں گرووں نے ہندوستان کی مرکزی حکومت (مغلیہ سلطنت) کے مختلف حریف دعوے داروں کی باہمی کشمکش میں حصہ لینا شروع کیا' اسی لئے وہ بھی اس کے سیاسی نتائج کا شکار ہوئے اور مرکزی حکومت نے بقائے امن کیلئے ان سے سخت برتاؤ کیا لیکن بعض گرووں کے ساتھ مغلیہ سلطنت کے طرز عمل کی بڑی ذمہ داری خود سکھوں اور ہندوؤں پر عائد ہوتی ہے کیونکہ تاریخی شواہد سے یہ امر غیر مشتبہ طور پر ثابت ہوتا ہے باوجود ان کی سرکشی اور حکومت کے خلاف سازشوں کے حکومت نے ہمیشہ ان کے ساتھ درگذر نہیں کیا' بلکہ ان کی مذہبی حیثیت اور حکومت مغلیہ کے روایاتی طرزِ عمل کی پیروی میں ان کو بار بار معاف کیا یہاں تک کہ

مورخین اس کو خلاف سیاست کہہ سکتے ہیں لیکن جہاں خود سکھوں اور ہندوؤں نے اس کی شکایت کی تو پھر اس کے صحیح ثابت ہونے کی صورت میں انصافاً اس کا تدارک کرنا پڑا۔ جہاں تک گرو ارجن کے قتل اور گرو گوبند سنگھ کے خلاف کاروائی کا تعلق ہے حسب ذیل حوالوں سے ان کی حقیقت واضح ہو سکے گی۔

(۱) سکھ کتب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جب شہنشاہ جہانگیر کو چندو کی ان زیادتیوں کا علم ہوا اور اس کی نوٹس میں یہ بات آئی کہ گرو ارجن کی وفات چندو لعل کی ذاتی عداوت کے باعث ہوئی ہے تو اس نے عدل جہانگیری کی مثال تازہ کرتے ہوئے چندو لعل کو فوراً معزول کیا اور گرو ہرگوبند کے حوالے کر دیا۔ اور لکھا کہ یہ آپ کے باپ کا قاتل ہے اس لئے آپ جو چاہیں اس کو سزا دیں (ملاحظہ ہو تاریخ گورو خالصہ اردو صفحہ ۷۰ گرو پرتاپ سورج گرنتھ راس منوسو وغیرہ صفحہ ۶۳) سکھ عہد اسلمی، مصنف عباد اللہ گیانی۔

(۲) ایک اور سکھ دوست تحریر فرماتے ہیں: ایک دن شاہجہاں کے ہاتھ کا باز اُڑ کر گرو جی کے پا آ گیا۔ بادشاہ کے مانگنے پر ست گرو نے انکار کر دیا کیونکہ چل کر شرن کو آئے کو پھر ظالموں کے ہاتھ دیدینا بہادر گرو صاحبان کی شان کے خلاف تھا" (ترجمہ اروس گروں کا سنکھیپ جیون چرتر صفحہ ۱۳) سکھ عہد اسلامی میں صفحہ ۸۰۔

(۳) گرو گوبند صاحب کی تحریک پر مدھی چند نامی چھینہ جاٹ نے شاہی اصطبل سے دو گھوڑے چُرائے اور ان کو لا کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی فوج ان پر حملہ آور ہوئی (ہندو جاتی اور سکھ گرو صفحہ ۴) سکھ عہد اسلامی میں صفحہ ۸۱)۔

(۴) سکھوں کے تین بڑے فرقے (۱) اورسی (۲) میناس اور (۳) ہنڈالی ہیں۔

(Sikh Religion, PIXXX by Max Arthar Maccon life)

---

سکھ مذہب

(۳) موجودہ صدی کے اوائل میں سکھوں کا ایک بڑا فرقہ ''اکالی'' سکھ پیدا ہو گیا ہے جس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد گرُدواروں کی اصلاح کے سلسلے میں زبردست ایجی ٹیشن کے ذریعہ مہنتوں کے قبضے سے ان کو چھڑایا۔ یہی فرقہ اب سکھوں کا نمائندہ سیاسی گروہ بھی ہے لیکن مغلیہ سلطنت اور مسلمانوں سے سکھوں کے مخالفانہ اور عداوتانہ طرزوں کا اس سازش کا بڑا ہاتھ ہے' جو ایک ہندو فقیر بندہ بیراگی نے کی۔ یہ پچھمن نامی جموں کا ایک ہندو تھا جو اپنے آپ کو گیارھواں گرو کہلوانا چاہتا تھا۔ اس نے جنوبی ہند میں (گوداوری کے کنارے) دسویں گرو (گوبند سنگھ) سے مل کر اپنے آپ کو ان کا بندہ (غلام) ظاہر کیا اور اسی لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ (58) لیکن .......... مطابق گوبند سنگھ نے اس کو چیلا نہ بنایا بلکہ یہ خواہش کی کہ وہ سکھوں سے لڑائی نہ کرے۔ لیکن بندہ بیراگی نے ان کی نصیحتوں کو پس پشت ڈال دیا' بادشاہوں کا لباس پہن کر سکھوں پر حکومت کرنی شروع کی' اور ۱۷۱۰ء میں امرتسر میں ایک دربار کر کے گرو ہونے کا دعویٰ بھی کیا' اور ملک میں لوٹ مار اور غارت گری شروع کی۔ مسلمانوں کا قتل عام کیا اور سکھوں کو اس میں اُلجھا دیا' لیکن بالآخر سکھوں نے اس کے مظالم سے تنگ آ کر ۱۷۱۶ء میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس کا مقابلہ کیا اور یہ گرفتار ہو کر دہلی میں کیفر کردار کو پہنچا۔ اس طرح دراصل اس نے شہنشاہ عالمگیر کی وفات کے بعد مغلوں کی مرکزی حکومت میں جو کمزوری پیدا ہو گئی تھی اس سے فائدہ اُٹھانے کیلئے سکھوں کی بہادر اور سادہ قوم کو مسلمانوں سے الجھا دیا تا کہ ایک طرف سکھوں کا نقصان ہو اور دوسری طرف سے مسلمانوں کا۔

## سکھوں کے فرقے

### ناملاری سکھ

اس فرقہ کی ابتداء بھائی رام سنگھ نے کی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں بحیثیت سپاہی ملازم تھا۔ یہ مذہبی مزاج کا آدمی تھا جو بابا مالک رام ہزرو کے ایک اور سی

فقیر کا چیلہ تھا۔ یہ سکھ مذہب کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ اس کے پیرو بابک رام کو گیارھواں اور اس کو بارھواں گرو سمجھتے تھے یہ فرقہ اپنے لباس اور پرہیز گاری میں دوسرے سکھوں سے ممتاز ہے۔ یہ غیر نامداریوں کا پکایا ہوا کھانا نہیں کھاتے اور کھدر پہنتے ہیں۔ یہ برطانوی عدالتوں اور تارگھروں وغیرہ کا بائیکاٹ کرتے ہیں۔ بعد میں جل کر انہوں نے سکھوں کے اقتدار کی بحالی اور انگریزی سلطنت کا تختہ الٹنے کی بھی کوشش کی۔ یہ مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ گائے کو ذبح کرتے ہیں' جن کو وہ ہندوؤں کی طرح مقدس سمجھتے ہیں اسی کے باعث انہوں نے امرتسر میں بعض قصابوں کو شہید کر دیا جس کے نتیجے میں دار پر چڑھے۔ بعد میں انہوں نے پنجاب کی ایک مسلم ریاست مالیر کوٹلہ پر حملہ کیا' جن میں سے پچاس باغیوں کو توپ کے منہ پر رکھ کر اڑا دیا گیا۔ انبالہ ڈویژن کے ایک انگریزی حکام کی طرف سے ان کی اس سرکشی کے باعث پنجاب کے تمام حصوں سے ان کے لیڈر گرفتار کر کے رنگون اور انڈمان بھیجے گئے رام سنگھ کو بھی رنگون بھیجا گیا اور اس کو وہاں سے نہ آنے دیا گیا۔ اگرچہ حال میں دیگر سکھوں پر سے ایسی قید اُٹھالی گئی۔ گرو پرتاپ سنگھ جو بابا رام سنگھ کے بھانجے ہیں نامداری سکھوں کے گرو ہیں۔

## اکالی سکھ

سکھوں کا یہ فرقہ ایک جدید فرقہ ہے' جس کی تنظیم دوسری جنگِ عظیم کے بعد اس غرض سے ہوئی تھی کہ گردواروں کو مہنتوں کے اقتدار سے چھڑایا جائے اس کی نوعیت زیادہ تر سیاسی ہے۔

چنانچہ بندہ بیراگی نے اور اس کے ورغلانے اور اکسانے پر اس کے پیرو سکھوں نے جو کچھ کیا اس کا حال یہ تھا:

''مذکورہ بالا بندہ بادشاہی فوج کا سامنا بہت کم کرتا تھا' بلکہ زیادہ تر گوریلا وار کے طور پر چھپ چھپ کر حملے کرتا اور اطراف و جوانب

رہزنی کرتے ہوئے پھرا پھرتا' ایک جگہ اپنا ٹھکانہ بنا کرنہیں رہتا تھا' جہاں موقع مل گیا قتل و غارت' لوٹ مار اور مسجدوں کی بربادی اور مسلمانوں کے مقابر کے اُکھارنے میں کمی نہیں کرتا''۔(59)

مرزا حیرت نے ایک اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی جو ہند میں حسب ذیل شہادت نقل کی ہے:

''مسلمانوں سے سکھوں کو بڑی دشمنی تھی' اذان یعنی بانگ یہ آواز بلند نہیں ہونے دیتے تھے۔ مسجدوں کو اپنے تحت میں لے کر اس میں گرنتھ پڑھنا شروع کر دیتے اور اس کا نام مست گڑھ رکھتے تھے ........... دیکھنے والے کہتے ہیں کہ جہاں پہنچتے تھے جو برتن مٹی کا استعمالی کسی مذہب والے خصوصاً مسلمانوں کا پڑا ہوا ان کے ہاتھ آ جاتا تھا پانچ چھتر (جوتے) اس پر مار کر اس میں کھانا پکا لیتے تھے''۔

(الفرقان' شاہ ولی اللہ نمبر' مولانا گیلانی۔ صفحہ ۱۸۸)۔

## اجتماعی حیثیت

سکھ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں پنجاب پر حکمراں تھے' لیکن غدر سے پہلے وہاں انکی حکومت اگرچہ انگریزوں نے ختم کر دی' لیکن مشرقی پنجاب کے بڑے حصہ میں سکھوں کی ریاستیں باقی رہ گئیں۔ جن میں پٹیالہ اور نابھا وغیرہ بہت مشہور ہیں' جو دراصل سکھوں کے اصلی فرقوں کی نمائندہ تھیں۔ سر لیپل گریفن ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سکھ قوم جو زیادہ تر جاٹوں کی نسل سے ہے دو بڑے گروہوں پر مشتمل ہے جو ان اضلاع کے ناموں سے موسوم ہے۔ جہاں وہ سکونت رکھتے ہیں ان میں سے ایک کا نام مانجھا ہے اور دوسرے

کا نام مالوا۔ مانجھا باری دوآب کے جنوبی حصہ کا نام ہے جو لاہور اور امرتسر کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ باری دوآب سے مراد وہ خطہ ہے جو دریائے راوی اور بیاس کے مابین ہے' مانجھی سکھوں کے خلاف بلحاظ مناسب وسعت اصطلاح کے اس تمام گروہ پر ہو سکتا ہے جو مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے وقت دریائے ستلج کے شمال میں رہتے تھے"۔

مالوا (یہ وہ مالوا نہیں جو دکن میں ہے) اس دریا کے بالکل جنوب میں ہے۔ مذکورہ بالا کی وسعت دہلی اور بیکانیر تک ہے۔ سکھ جو یہاں سکونت رکھتے ہیں وہ یہاں کے اصل باشندے ہیں' وہ یہاں نہ لوٹ مار کیلئے آئے تھے اور نہ مانجھا سے وطن ترک کر کے آباد ہوئے تھے یہی سکھ نامور سکھ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا مسلمہ پیشو پھلکلیان کا خاندان ہے جس کا سب سے بڑا قائم مقام مہاراجہ پٹیالہ ہے۔ انگریزوں کے دورِ حکومت اور سکھوں کے پنجاب پر حکومت کے زمانے میں بھی سکھوں کی آبادی زیادہ نہ تھی' چنانچہ رنجیت سنگھ کے مصنف کا کہنا ہے:۔

"تعجب ہے کہ خالصہ کے زمانہ انتہائے عروج میں بھی پنجاب کی آبادی میں بہت کم تعداد ان لوگوں کی تھی جنہوں نے سکھ مذہب قبول کیا' لیکن غدر کے بعد سکھوں کو اپنی خدمات کے باعث کافی فائدہ پہنچا' چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سرکار انگریزی کے تحت میں ان کی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ غدر کے موقع پر ہو چکا ہے۔ جبکہ ستلج کے راجاؤں' پٹیالہ' نابھا' جیند اور کپورتھلہ نے ہنگامہ کی خبر پاتے ہی بغیر اس کی اطلاع پائے کہ یہ شگون نیک ہے یا بد' اپنی فوج کے ساتھ دہلی کی طرف انگریزوں کے دشمنوں پر حملہ کرنے کیلئے روانہ ہو گئے۔ ان

کی اس بہادرانہ مثال کی تقلید تمام صوبے کے سکھوں نے کی' اور
ہندوستان کا ملک جس طرح انگریزی سپاہ کی سنگینوں سے حاصل ہوا
اسی طرح پنجابی سپاہ کے سرگرم تعاون سے بھی۔ لیکن سکھ سی عہدے
پر یا میونسپل کمیٹیوں میں کام کرنے کیلئے بالکل موزوں نہیں''۔

لیکن یہ اس بہادر قوم پر اس انگریز مصنف کا اتہام ہے کہ سکھ سی عہدے پر یا میونسپل کمیٹیوں میں کام کرنے کیلئے بالکل موزوں نہیں ہیں۔ حالانکہ پٹیالہ' نابھ' کپورتھلہ جیسی حکومتیں وہ چلا رہے تھے' اور دہلی کی مرکزی حکومت اور پنجاب کی صوبائی حکومت میں بھی متعدد سکھ سیاست داں وزیر تھے۔ بہر حال تقسیم ہندوستان ۱۹۴۷ء تک سکھ ہندوستان میں اور خصوصاً پنجاب میں کافی بڑی سیاسی طاقت تھے۔ چونکہ سکھ بہادر اور جفاکش تھے' اسی لئے فوج میں ان کا کافی اثر تھا۔ گریفن ان کی اس خصوصیت کے بارے میں کہتے ہے:۔

''دیسی افواج میں صرف سکھ ہی ایسے ہیں جو بتعداد کثیر ملک کے
باہر عرصہ دراز تک مصروف کار رکھے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انہیں
معقول مشاہرہ دیا جائے' کیونکہ اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کی طرح وہ
بھی روپیہ کی قدر و قیمت سے بخوبی آشنا اور اس کے جمع کرنے کے
دلدادہ ہیں''۔

لیکن سکھوں کی بہادر قوم کی بدقسمتی سے سکھوں کی سیاسی قیادت تقسیم ہند سے پہلے ان کی حقیقی سیاسی مفاد کا صحیح اندازہ نہ کرسکی اور نتیجتاً انہوں نے ہندوؤں کے وعدوں پر بھروسہ کرلیا' اس طرح ان کے سیاسی قائدوں کے ہندوؤں کے دم دلاسے میں آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم کے زمانے میں انہیں ان کے مفاد کے خلاف مسلمانوں سے اُلجھا کر انہیں کمزور کردیا گیا' اور ان کو ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس طرح

---

منتشر کر دیا گیا کہ ان کی سیاسی طاقت ختم ہو جائے۔ اس مقصد میں اس طرح بھی کامیابی حاصل کی گئی کہ مشرقی پنجاب کی سکھ ریاستوں کو بڑی تعداد میں ہندو بنانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ میں ہندوستان کی حکومت اس امر کا دعویٰ کرتی ہے کہ بڑی تیزی سے ان کو ہندو بنایا جا رہا ہے۔ ہندوستان کی مردم شماری بابت ۱۹۵۱ء کی رپورٹ نمبر ۲ کے ضمیمے کے صفحہ ۱۹ پر لکھا ہوا ہے کہ:

''موجودہ مردم شماری میں اضافہ دراصل مسلمانوں کے پاکستان چلے جانے اور ان لوگوں کے شدھ ہو کر ہندو مذہب میں واپس آنے کا نتیجہ ہے جو تاکمل طور پر سکھ اور عیسائی ہو گئے تھے''۔

ہندوستان میں ۱۹۴۱ء کی سکھوں کی آبادی کا لحاظ کر کے ۱۹۵۱ء میں کم از کم دو لاکھ سکھوں کو ہندو بنایا گیا ہے۔ حالانکہ پہلے سکھ ہندوؤں کو سکھ بنایا کرتے تھے۔ چنانچہ کتاب (Iransforanation of Sikhism) کا مصنف لکھتا ہے:۔

''تبدیل مذہب کے بارے میں ان کی بھرتی کا واحد میدان ہندو فرقہ کے اندر تھا علی الخصوص نیچ ذات کہلانے والے' اور سکھ اچھوتوں سے کچھ رنگروٹ حاصل کیا کرتے تھے''۔ (صفحہ ۱۳۵)

اس طرح اب اس بہادر قوم کا مستقبل ہندوستان میں تاریک بنا دیا گیا ہے۔ کیونکہ شدھی کا گھن اب انہیں لگ گیا ہے۔ اور سر لیپل گریفن کا یہ قول نہ بھولنا چاہیئے کہ:

''اس (ہند) کی تاثیر عشق پیچاں کے بیل کی سی ہے جو ایک بار اس کی گرفت میں آ گیا اسے جکڑ کے دبوچ لیا۔ اس نے تمام مذاہب کو جیسے سکھ اور بدھ مذہب پر دونوں ہندو مذہب کی اتحادی صورتیں تھیں جب برسرِ مقابلہ ہوئیں تو تقریباً خاتمہ کر دیا مغرب میں رومی کلیسا کی

جو حالت ہے وہی مشرق میں ہندو دھرم کی ہے"۔ (رنجیت سنگھ دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن بابت ۱۹۲۲ء)

سکھوں کے ہندو بنا لئے جانے کی اسکیم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ اب ایک طرف ان کی مذہبی اور تہذیبی زبان (گورمکھی) کے خلاف ہندی زبان کی تحریک جاری ہے تو دوسری طرف ان کے مقدس مقامات کو ناپاک بنانے کی منظم مہم جاری ہے جس کا ایک اندازہ حسب ذیل اقتباسات سے ہو سکے گا:

(۱) "ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی اور تبادلہ پر زور"

نئی دہلی ۸ اگست ۱۹۵۷ء مسٹر کھیر سنگھ ویراگی سیکرٹری گردوارہ پربندھک کمیٹی نے ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان مشرقی پنجاب کی ہندی اور پنجابی بولنے والی ہندو اور سکھ آبادی کے باہمی تبالہ کی تجویز پیش کی ہے"۔ جگادھی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا: "ہندی بولنے والے خطے سے سکھوں کا پنجابی خطے میں اور پنجابی بولنے والے خطے سے ہندوؤں کا ہندی بولنے والے خطے میں تبادلہ پنجابی زبان کے تنازعہ کا واحد حل ہے۔ انہوں نے اس امر کا بھی اضافہ کیا کہ آبادی کا اس طرح تبادلہ باہمی رضامندی سے پُرامن طور پر ہونا چاہیئے تا کہ ۱۹۴۷ء کے واقعات کے اعادے کو روکا جا سکے"۔ (ڈان ۹۔ اگست ۱۹۵۷ء)

(۲) ۱۹ دسمبر ۱۹۵۷ء کو دہلی کی ایک خبر میں کہا گیا ہے کہ:

"اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ نے کل رات گرو گوبند سنگھ کی یوم پیدائش پر تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ مشرقی پنجاب کے لسانی فارمولوں کو بدلنے کیلئے میں ساتھ نہ دوں گا۔ انہوں نے ہندی کی مخالفت میں

تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اگر فارمولے میں کوئی تبدیلی کی گئی تو سکھ جوابی ستیا گرہ شروع کر دیں گے اور اپنے مطالبات میں اضافہ کر دیں گے' کیونکہ انہوں نے پنجابی صوبے کا مطالبہ ترک کر کے یہ فارمولہ منظور کیا تھا' مگر ہندی کے حامی پنجابی کا گلا گھونٹنے کیلئے ہندی کی قیادت مانگتے ہیں' میں پنجابی کا وہی مرتبہ چاہتا ہوں جو مغربی بنگال میں بنگالی کو حاصل ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے پنڈت پنت کی حکومت پر لسانی تنازعہ کے سلسلہ میں نکتہ چینی کر کے کہا کہ جب ستیا گرہ ماند پڑنے لگی تو انہوں نے غیر براہ راست کوئی بات کہہ دی ہندو سکھوں کو سیاسی طور پر مفلوج کرنے کیلئے لسانی فارمولے میں تبدیلی کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے قبل کرنال کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ماسٹر تارا سنگھ نے کہا کہ جو بدسلوکی آج ہندو کر رہے ہیں' سکھوں سے وہ سلوک برطانوی یا مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بھی نہیں کیا گیا۔ جب تک آریا سماجی سرگرم ہیں ہندوؤں اور سکھوں میں اختلاف رہے گا۔ لدھیانے میں سکھ اسٹوڈینٹ فیڈریشن کے لیٹر بکس میں پوسٹر ملے ہیں جس میں سکھوں کو دھمکیاں دی گئی ہیں اور ان کے مذہب پر حملے کیے گئے ہیں''۔

(جنگ ۳۰۔ دسمبر ۱۹۵۷ء)

(۳) یہ دھمکیاں اب معین اقدامات کی صورت اختیار کر رہی ہیں' جیسا کہ ذیل کی خبر سے واضح ہو گا:۔

''نئی دہلی ۳۔ جنوری۔ اکالی دل نے تمام ضلع داری جتھوں کو ہدایات

بھیجی ہیں کہ "شہیدی دل" کے نام سے خاص جتھے بنائے جائیں' تاکہ سکھ قوم اور اس کے معابد کے احترام کی حفاظت کی جاسکے۔ یہ ہدایت ان بڑھتی ہوئی کوششوں کے پس منظر میں جاری کی گئی ہیں جو سکھ معابد کی بے حرمتی اور سکھ احساسات کو مجروح کرنے کیلئے کی جارہی ہیں جو خاص طور پر مشرقی پنجاب میں جاری ہیں جہاں ہندی کی حمایت میں جاری شدہ ایجی ٹیشن نے سکھوں کو برافروختہ کردیا ہے مجوزہ شہیدی دل کے ارکان سکھ مذہب اور معابد کی حرمت وحفاظت کیلئے اپنی جان قربان کرنے کا عہد کرتے ہیں۔ اکالی دل نے یہ بھی طے کیا ہے کہ ۱۳۔ جنوری کو حفاظتِ مذہب کا دن منائیں گے۔ اور ۱۹۔ جنوری کو سکھ قوم کی شکایات ظاہر کرنے کیلئے دہلی میں مظاہرہ کریں گے۔ جس کیلئے وہ سیاہ پگڑیاں دوپٹہ اور بیجیس پہنیں گے اور شاہراہوں پر کوچ کریں گے۔ اور ماسٹر تارا سنگھ نے بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو کو ایک خط بھی بھیجا ہے جس میں ان کو سکھوں کی اس ناراضی کے مزاج سے واقف کردیا ہے جو امرتسر کے سنہری گنبد کی بے حرمتی کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ (ڈان ۴۔ جنوری ۱۹۵۸ء)

(۴) ۶۔ جنوری۔ مشہور سکھ لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کہتے ہیں۔ اس ملک میں اس وقت تک آزادی نہ ہوگی جب تک کہ اقلیتیں یہ محسوس نہ کریں کہ ان کا مذہب' ان کی ثقافت' انکی عزت اور ان کی معاشی حیثیت محفوظ ہے' کیا آج اقلیتیں ایسا محسوس کرتی ہیں۔ اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہ کیوں شرومنی اکالی دل نے دہلی میں ایک خاموش جلوس کا انتظام کیا' ماسٹر تارا سنگھ نے کہا۔ (جیسا کہ

۴۔ جنوری کے سکھ ہفتہ وار اخبار "اسپورٹس مین" میں شائع ہوا ہے:)

"سکھوں کو پست ہمت بنانے کیلئے انتہا درجہ ہتک آمیز اور بے مثال مخرّب مذہب افعال کئے گئے ہیں۔ ماسٹر تارا سنگھ نے ان افعال کی ایک لمبی فہرست پیش کی' جو سکھ مذہب کیلئے سخت اشتعال انگیز ہیں اور خاص طور پر آریا سماجیوں پر ایسے افعال کا الزام لگایا اور مشرقی پنجاب کی حکومت پر الزام لگایا کہ وہ مجرموں کے ساتھ نرمی برتتی ہے۔ اکالی دل لیڈر پوچھتے ہیں کہ کیوں سکھوں اور سکھ مذہب کے خلاف ایسے ہتک آمیز اور اشتعال انگیز جرائم کئے جاتے ہیں جو تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوؤں کی طرف سے یا ہندوؤں کے ایک فرقہ کی طرف سے کئے جا رہے ہیں۔ اس واقعہ سے مجھے سخت دُکھ پہنچا ہے۔ ہندوؤں کے ایک طبقہ کا دماغ پھر گیا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اب ہندو راج ہے اس لئے وہ اقلیتوں کو پست ہمت بنانے پر تلے ہوئے ہیں"۔ (ڈان ۷۔ فروری ۱۹۵۰ء)

(۵) نئی دہلی ۸۔ فروری۔ سکھوں کے ہفتہ وار اخبار "شیرِ پنجاب" دہلی نے اپنی ۲۔ فروری کی اشاعت میں لکھا ہے کہ جن لوگوں نے قیام پاکستان کو لازمی بنا دیا تھا وہ اب سکھوں کو اس بات پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اپنے لئے ایک علیحدہ وطن بنائیں' ہندوستان میں عیسائی' مسلم اور سکھ اقلیتوں کی ابتر حالت اور سکھوں کی عبادت گاہوں اور مقدس کتاب گرنتھ صاحب کی بے حرمتی کی تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے اخبار مذکور نے آگے چل کر لکھا ہے کہ اگر قیام پاکستان کا غیر

جانبدارانہ طور جائزہ لیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوگی کہ تنگ نظر اور متعصب ہندوؤں نے مسلمانوں کو ایک علیحدہ وطن قائم کرنے پر مجبور کیا، اقبالؔ، علی برادرانؔ، ظفر علی اور جناحؔ سب پہلے کانگریس میں شامل تھے، لیکن ہندوؤں نے انہیں علیحدہ ہونے پر مجبور کیا۔ اور آج یہی اکثریت اس ذہنیت کے ساتھ ہندوستان کی ثقافتی مذہبی اور لسانی اقلیتوں کی زندگی کو دشوار بنا رہی ہے"۔

(اخبار جنگ' کراچی ۱۵۔فروری)

(۶) "نئی دہلی ۹۔فروری گردوارہ سنگھ سبھا کے باہر ہندی کانفرنس کے لوگوں کے جلوس پر خشت باری کے نتیجہ میں دو آدمی مقتول اور ۲۶ زخمی ہوئے جن میں سے دس شدید زخمی ہیں۔ یہ واقعہ کل جالندھر کے قریب پولیس کی فائرنگ کے نتیجہ میں ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جبکہ کل ہندی کانفرنس شروع ہوئی۔ اس کے جلوس کے دوران میں پیش آیا۔ جلوس نے دس بجے رات تک واقعہ کے مقام کو نہیں چھوڑا تھا اور مطالبہ کر رہا تھا کہ جو لوگ دو آدمیوں کے قتل کے ذمہ دار ہیں ان کو گرفتار کیا جائے' لیکن اس وقت تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی بعد میں جلوس مسلح پولیس کی حفاظت میں جلسہ گاہ تک مقررہ راستہ سے گذرا"۔

(ڈان ۱۰۔فروری ۱۹۵۸ء)

(۷) مسٹر بھرنالال ۔۔۔ ۱۰۱ ڈوال اندور کی آل انڈیا شیڈول کاسٹ لیگ کے صدر اخبارات کے نام اپنے ایک حالیہ بیان میں لکھتے ہیں۔ ...

"بھارت کی جمہوریت اچھوت ذاتوں اور مسلمانوں کیلئے بے سی

ہے' کیونکہ منظم طور پر ان کے حقوق کی پامال کیئے جا رہے ہیں۔ ملازمتوں میں ان دونوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ نے ان دونوں فرقوں کو تباہی میں ڈال دیا ہے' سیاسی سطح پر ان جماعتوں کو شطرنج کے مہروں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور اگر کوئی شخص اس برہمن' بنیا حکمرانوں کے اشاروں پر ناچنے سے انکار کرتا ہے تو اس کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے''۔

واقعہ یہ ہے کہ شیخ عبداللہ نہ صرف مسلمانان کشمیر کی ترجمانی کر رہے ہیں بلکہ اس صورت حال کی صحیح تشریح پیش کر رہے ہیں' جس میں پورے بھارت کے مسلمان زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پنڈت نہرو ہمیشہ باہر کی ہر ایک مظلوم جماعت کے ساتھ ہمدردی کے اظہار میں پیش قدمی کرتے ہیں لیکن خود ان کے ملک میں مسلمان اور اچھوت قومیں غیر انسانی حالات میں زندگی گذار رہے ہیں۔ امن' اخوت' اور انصاف کے نعرے ان کیلئے بے معنی ہیں جبکہ وہ ملک کے برہمن بنیا حکمرانوں کے ہاتھوں برداشت کرنے پر مجبور ہیں''۔

(ڈان ۔۲۲۔فروری ۱۹۵۸ء)

(۸) دہلی سے شائع ہونے والا اُردو روزنامہ ''نئی دنیا'' لکھتا ہے کہ اگر مسلمانان بھارت بُرے دنوں کا شکار ہیں تو ان کی بدقسمتی کا سبب قابل فہم ہے' کیونکہ انہوں نے ملک کی تقسیم کی رائے دی تھی لیکن کوئی بتائے کہ سکھوں' برجنوں عیسائیوں اور ڈریوڈ کا سگام نے کیا قصور کیا تھا کہ وہ اکثریتی فرقہ کے غیض وغضب کا شکار ہیں'

اور ان کو بھی لاٹھی سے پیٹا جاتا ہے جس سے بھارتی مسلمان پیٹے جاتے ہیں۔

اپنی ۷۔فروری کی اشاعت میں بھارت کے اقلیتوں کے عنوان پر بحث کرتے ہوئے ان کی بیچارگی کو دہلی کا اخبار اندوہناک قرار دیتا ہے۔اور ''نئی دنیا'' لکھتا ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ مغربی بنگال' مشرقی پنجاب یا راجستان میں مساجد کے ناجائز قبضہ یا مسلم ثقافت اور زبان کے خلاف نفرت کی اور سوچی سمجھی ہوئی مہم کے خلاف احتجاج کرے اور نہ ہی غلط تاریخ مرتب کرنے کی حالیہ کوششوں کے خلاف کچھ لکھے۔غالباً یہ سب سودا بازی ہے لیکن کیوں غیر مسلم اقلیتوں کو بھارت میں مطعون کیا جاتا ہے تاکہ ان کو سولی پر چڑھایا جائے کیوں ان کی زبانوں کو دبایا جاتا ہے' کیوں ان کی تہذیبوں کو منسوخ کیا جاتا ہے' کیوں ان کے مقدس مقامات کو ناپاک بنایا جاتا ہے' اور کیوں ان پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے بند کئے جاتے ہیں۔

اکثریتی فرقہ کی فرقہ پرست جماعتوں کی مذمت کرتے ہوئے یہ سوالات اس نے کئے ہیں آج سکھ' عیسائی' مسلمان' پارسی' ڈریوڈی اور بدھ مَتی' ہریجن بھارت میں ایک ہی جہاز کے مسافر ہیں۔

## سیاسی قوت

سکھ جو کبھی حکمران تھے' اب ہندوستان میں محکوم اور سیاسی طاقت سے محروم ہیں۔ان کی کوئی ایسی جداگانہ اور آزاد سلطنت نہیں جو متحدہ اقوام کی رکن ہو۔اس لئے یہ نتیجہ صاف ہے کہ ان کی سیاسی طاقت بحالتِ مجموعی صفر ہے۔اور اسی لحاظ سے ان کا کوئی ملک بھی نہیں' اسی لئے اب وہ خالصتان کی آواز اُٹھا رہے ہیں۔

# SHANTOISM

# شنٹو مذہب

## شنٹو مذہب کی تاریخ اور شنٹو کے معنی

شنٹو کے معنی ''دیوتاؤں کا طریقہ'' ہے اور یہ کنفیوشی مت اور بدھ مت کے شائع ہونے سے پہلے سے جاپان کا مذہب رہا ہے۔ شنٹو آفتاب کی پوجا کرتے تھے' اس عقیدہ کا کوئی تعلق چین سے نہیں رہا ہے البتہ کوریا سے ہے لیکن ایک دوسرا نقطہ نظر اس کے خلاف یہ ہے کہ ڈاکٹر انوائی (Inowye) موجودہ جاپان پر کنفیوشی مت کا اثر کا یوں خلاصہ پیش کرتے ہیں کہ تیسرے دور کے اختتام کے قریب جو لوگ جاپان کی تعمیر میں حصہ دار تھے ان کی اکثریت کا کنفیوشیوں پر مشتمل ہونا ایک ناقابل تردید واقعہ ہے۔ کنفیوشی مت کے تمام شاخوں کے وانگ یانگ منگ کا چیکسی (Chatsye) مکتب نے نئے دور کے اکثر بانیوں کو جنم دیا ہے.......... اس امر کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ جس آمادگی سے ہماری قوم نے نئی مغربی تہذیب کو اپنایا ہے وہ زیادہ تر اس ذہنی تربیت کا نتیجہ ہے جو انہیں کنفیوشی مت کے ٹوکوگا عہد میں مطالعہ سے حاصل ہوئی تھی۔(60) کیونکہ آخر الذکر ملک کے بعض دیوتاؤں کو شنٹو دیوتاؤں میں شامل کر لیا گیا ہے۔ اس مذہب کی تعلیمات زبانی تھیں کیونکہ جاپان میں تحریر کا رواج نہ تھا۔ البتہ ۷۱۲ء میں ایک تاریخی تصنیف جس کو جیکی کہتے ہیں' شہنشاہ کے حکم سے تیار ہوئی۔ اس کا بڑا حصہ افسانوی ہے۔ ۷۲۰ء میں اسی قسم کا ایک مجموعہ 'نہونگی' کے نام سے شائع ہوا جو جاپان کے افسانوں کا دوسرا بڑا ماخذ ہے۔ شنٹو مذہب کی عبادت اور دعاؤں کو دسویں صدی کے آغاز سے پہلے تک ضبط تحریر میں نہ لایا جا سکا۔ چنانچہ اس دور

میں ''نیگی شیگی'' نامی کتاب شائع ہوئی' جس میں اصلی اور اہم عبادات اور دعائیں درج ہیں جن کو ناریتو کہتے ہیں۔

جب ہم شنٹو مذہب کا دنیا کے دیگر مذاہب سے مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ابتدائی بت پرست مذہب ہے جو متعدد خداؤں کی پرستش پر مبنی ہے اس میں خدا کا تصور مکمل نہیں' اس میں کوئی ضابطہ اخلاق نہیں۔ دراصل شنٹو مذہب اسلاف پرستی اور متوفی بادشاہوں کی پرستش کا مذہب ہے۔ خدا کیلئے جاپانی لفظ'' کامی'' ہے جس کے اصلی معنی بالا اور برتر ہیں۔ چنانچہ'' موتودی'' جو شنٹو مذہب کا زبردست جدید عالم ہے لکھتا ہے: ''لفظ کامی اولاً زمین اور آسمان کے متعدد دیوتاؤں کیلئے استعمال ہوا جن کا قدیم تذکروں میں ذکر آتا ہے۔ اس طرح ان کی ارواح (می تاما) کیلئے استعمال ہوتا ہے جو ان معبدوں میں رہتے ہیں جہاں ان کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ لفظ نہ صرف انسان بلکہ چرند' پرند' نباتات' دریا' پہاڑ اور ہر قسم کی دوسری اشیاء جس سے خوف کرنا اور ان کی عزت کرنا اس لئے لازمی ہے کہ ان کو غیر معمولی اور اہم اختیارات حاصل ہیں' جن کا صرف نیکی' اچھائی' یا فائدہ رسانی میں اعلیٰ ہونا ضروری نہیں' ان سب کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ بری اور ناپسندیدہ اشیاء بھی کامی کہلاتی ہیں بشرطیکہ ان کا خوف عام ہو۔ کامی کی قسم میں جو انسان داخل ہیں ان میں میکاڈو (شہنشاہ جاپان) کا تذکرہ غیر ضروری ہے۔ دوسری اشیاء کے منجملہ اعداد (جن کو جاپانی میں تاروکامی یا صوتی خدا کہتے ہیں) اژدہا' گونج (جس کو جاپانی میں لوڈاما یا روح شجر کہتے ہیں) اور لومڑی شامل ہیں جو اپنی عیارانہ اور مدھش فطرت کے لحاظ سے کامی ہے) (صفحہ ۲۶۳ جلد ۱۱ (Encyclopadia of Religions and Ethics)

اسی طرح ایک اور واقف کار لکھتا ہے:۔

'' مجموعی حیثیت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ'' کامی'' اولاً زمین اور آسمان کے

دیوتاؤں کا مظہر ہے جو پرانی کتابوں میں ملتے ہیں اور وہ جن کی معابد اور مندروں میں پوجا ہوتی ہے۔ (61)

یہی مصنف آگے چل کر صفحہ ۱۵۳ پر لکھتا ہے:-

"جاپانی مذہب کے بارے میں ہماری معلومات میں ڈاکٹر گرنجی کاٹو سے زیادہ کسی اور ہم عصر عالم نے اضافہ نہیں کیا جو ٹوکیو کی شاہی یونیورسٹی میں برسوں تک شنٹو مضمون کے پروفیسر رہے ہیں ان کے شنٹو مذہب کے بارے میں تجزیہ و تحلیل کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"اگر ہم تاریخ کے وسیع ترین ادوار کو پیش نظر رکھیں تو شنٹو مذہب کے ارتقاء میں تین بڑی تہذیبی نوبتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جو فطرت پرستی یا عفریت پرستی کا ابتدائی دور ہے دوسرا دور اعلیٰ فطرت پرستی کا دور ہے جس کو ہم متعدد خداؤں کی پرستش کہہ سکتے ہیں۔ اور تیسرا دور شنٹو مذہب کا ترقی یافتہ ثقافتی دور ہے جس میں مظاہر کامی (Kami objectives) کے بارے میں عقیدہ اور عمل اعلیٰ درجہ کے اخلاقی اور فکری اثرات کے تابع ہو گئے، اسی آخر الذکر نوبت پر شنٹو مذہب اپنی مکمل سیاسی وضع اور ساخت کو ظاہر کرتا ہے"۔

شنٹو مذہب میں عملاً بتوں کی تصویریں نہیں ہوتیں، ان کے دیوتاؤں کی تعداد میں کمی و بیشی ہوتی رہتی ہے، شنٹو مذہب میں ابتداء اسلاف پرستی تھی، لیکن بعد میں یہ چین سے اس میں در آئی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شہنشاہوں کے جانشینوں نے اپنے اسلاف کی پرستش کی، اور اس طرح اسلاف پرستی بھی "کامی" کی ایک شکل ہو گئی۔ جاپانیوں کے یہاں آخرت پر ایمان کا پتہ نہیں ملتا لیکن بعض لوگ شہنشاہ پرستی (اسلاف پرستی) کی بناء پر اس کے خلاف نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ شنٹو مذہب میں اگرچہ بزرگ دیوتا کا کوئی تخیل نہ تھا پھر بھی یہ

---

شنٹو مذہب

سمجھا جاتا ہے کہ سورج سب سے اعلیٰ دیوتا ہے اور شہنشاہ کو بھی اس کا وارث قرار دیا جاتا ہے۔

شنٹو مذہب میں مذہبی جماعت کا مستقل وجود نہیں بلکہ وہ حکومت کا ایک جز ہے چنانچہ (میکادو) شہنشاہ خود سب سے اعلیٰ اور اصلی مذہب رہنما ہے لیکن اس نے یہ فرائض دوسروں کے تفویض کر دیئے ہیں' عورتیں بھی مذہبی رہنما ہوتی ہیں' ان کی رہنما شاہی خاندان کی شہزادیاں ہوتی ہیں جن کو ''سائی ور'' کہا جاتا ہے۔

## عبادت کے طریقے

زندہ آدمیوں کا احترام' شنٹو عبادت میں آدمی دو مرتبہ پہلے اور بعد میں جھک جاتا ہے۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ جانا اور بعض اوقات تالیاں بجانا بھی عبادت میں شامل سمجھا جاتا ہے۔ دیوتاؤں پر پرساد کا طریقہ بھی رائج ہے۔ مندروں میں ناچ کا طریقہ بھی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اہم معابد میں اسٹیج اور ناچنے والیاں مہیا ہیں۔

شنٹو مذہب کی سب سے بڑی تقریب شہنشاہ کی تاجپوشی ہے جس کو اتھونی یا ڈائی جوری کہتے ہیں' سید راس مسعود صاحب شنٹو مذہب کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

> ''اس ملک کے سب سے قدیم مذہب کا نام شنٹو ہے۔ جس کا لفظی ترجمہ ''دیوتاؤں کا طریقہ'' ہوسکتا ہے۔ یہ ایسا مذہب ہے جس میں نہ کوئی مجموعہ تسلیم شدہ عقائد کا ہے اور نہ جس کی کوئی ایک مقدس کتاب ہے اور نہ کوئی اخلاقی ضابطہ۔ اس مذہب کو اسلاف پرستی اور کائنات پرستی کا ایک مجموعہ سمجھنا چاہیئے۔ دراصل یہ مذہب جاپانیوں کی اس خاندانی زندگی کی مضبوط شیرازہ بندی کا ایک نتیجہ ہے جو ازیاد رفتہ زمانہ سے اس قوم کی خصوصیات چلی آتی ہیں''۔ (جاپان اور اس کا

شنٹو مذہب

تعلیمی نظام ونسق ۔ مصنفہ سید راس مسعود صاحب' شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ۔ اورنگ آباد دکن )

خلاصہ یہ کہ پیروان شنٹو کا یقین ہے کہ عالم ظاہر اور عالم غیب میں مضبوط تعلقات ہیں اس لئے جو لوگ زندہ ہیں' وہ اپنے اعمال سے مردوں کی ارواح کو خوشی یا تکلیف پہونچا سکتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ پروفیسر چیمبرلین لکھتے ہیں :۔

''باپ کی قبر کی طرف سے بے توجہی کرنا یا کسی اور عزیز کی موت پر جن سالانہ رسوم کا رواج ہو گیا ہے ان کے ادا کرنے میں بے پرواہی کرنی ایسی بات ہے جس پر سخت سے سخت مادہ پرست جاپانی بھی خوف سے کانپ اُٹھتا ہے گو اپنی عاقبت کی پرواہ ایک جاپانی کو مطلق نہیں ہوتی ۔ مگر یہ ایک عجیب متضاد بات ہے کہ اس کے طرز عمل سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ مرگئے ہیں وہ اس کی خبر گیری کے محتاج ہیں'' ۔(62)

''شنٹو مذہب کی ایک عجیب خصوصیت برخلاف دیگر مذاہب کے یہ ہے کہ دیوتاؤں سے فائدہ حاصل کرنے کی امیدیں ان سے التجا کرنا مذہب میں شامل نہیں ہے۔ قدیم شنٹو مذہب میں شامل رہنے کیلئے اتنا ہی ضروری تھا کہ فطرت کے پابند رہو' اور حسن فطرت سے حظ اٹھاؤ۔

''مذہبی رسوم یہ تھیں کہ پاکیزگی پانی یا ہوا سے حاصل ہوتی ہے' موت اور خون نجس کرنے والی چیزیں ہیں' اور چونکہ کامی ہر چیز کو دیکھ سکتے تھے اس لئے حکم تھا کہ ہر شخص اپنے جسم اور روح کو دل کی تہہ تک صاف رکھے''۔ شنٹو کا بھجن یہ ہے :۔

''پاک ہوجیو آسمان' پاک ہوجیو زمین' پاک ہوجیو باطن اور ظاہر ۔ اور چھ جڑیں''

اس عبادت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جاپان تمام چیزوں کی پاکیزگی کے کس درجہ خواہشمند

تھے۔ چھ جڑوں سے مراد حواس خمسہ اور ایک دل ہے جو متخیلہ کا مقام سمجھا جاتا ہے۔ تمام چیزوں کو صاف ستھرا رکھنے کی خواہش اب تک جاپانیوں میں بڑی خصوصیت کے ساتھ موجود ہے اور بلا شبہ یہی وجہ ہے کہ وہ آجکل دنیا کی سب سے زیادہ صاف اور ستھری قوم ہو گئے ہیں''۔

شنتو مذہب کے ماننے والوں کو قدیم زمانے میں بھی یہ سکھایا جاتا تھا کہ ایک حقیقی جاپانی کیلئے یہ امر شایان شان نہیں کہ خطرے میں مدد کیلئے وہ اپنے کامی کو پکارے کیونکہ تمام خطرے اور تکلیفیں بغیر ان کی مدد کے جو زمین پر ہیں یا آسمان پر اٹھانی چاہئیں جس پروفیسر کی عبارت میں نے اوپر نقل کی ہے جہاں وہ شنتو مذہب کے اثرات موجودہ جاپان پر بیان کرتا ہے وہاں لکھتا ہے کہ:۔

> ''آج تک شنتو مذہب کے پیرو صرف اپنے شہنشاہ کی خیر و سلامتی کیلئے دعا مانگتے ہیں۔ اپنے لئے دعا نہیں مانگتے اور شہنشاہ روزانہ اپنی رعایا کی خیر و سلامتی کیلئے دعا کرتا ہے۔ شہنشاہ کو ایک زندہ کامی سمجھا جاتا ہے جس کی عظمت اور محبت قوم کے دل میں سب سے بڑھ کر ہے شہنشاہ خود اس قوم سے جس کی خبر گیری اس کے سپرد ہے' محبت رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے شہنشاہ اور قوم کا یہ تعلق ایسا ہے جس کو جاپان کا ہر متنفس بخوبی سمجھے ہوئے ہے۔ بادشاہ ہماری ضروریات پر توجہ کرتا ہے اور ہماری تکلیفوں کو محسوس کرتا ہے پس اس کے بعد کیا چیز باقی رہتی ہے جس کو ہم بلا واسطہ کامی سے مانگیں۔ شنتو مذہب شہنشاہ پرستی ہے۔ کامی کی رضا شہنشاہ کی رضا ہے یہی وہ احساس ہے جو ہر ایک جاپانی کی لوح دل پر نقش ہے۔

# شنٹو کی رسوم

کنفیوشس کے پند و نصائح' بدھ مت کے عقائد غرض ان سب کے مخلوط ہو جانے سے مذہب میں وہ غلط مبحث پیدا ہو گیا ہے جو اس وقت جاپان میں جاری ہے رسوم عامہ میں شنٹو مذہب کے قاعدے برتے جاتے ہیں۔ مذہبی عقائد بدھ مت کے ہیں اور قوم کی اخلاقی زندگی تمام تر کنفیوشس کی تعلیم کی پابند ہے اس حالت میں آجکل کے جاپانی قدیم کامی کی بھی عزت کرتے چلے آتے ہیں اور گوتم بدھ کی بھی مگر اس کی وہ پرواہ نہیں کرتے کہ یہ کون ہے وہ کون ہے کامی و شہنشاہ کے انتہائے صادق و خلوص کا خیال وہ چیز ہے جس سے بہادر سمورائی کا وہ ضابطہ عزت و ناموس مرتب ہوا ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا۔ جاپان میں ہر معمولی آدمی کا یہ یقین ہے کہ دیوتا ایزانانی نے جاپان کے جزیروں کو پیدا کیا ہے وہ ان دونوں کی بیٹی اماتیرہ سووہ ہے جس نے اپنے پوتے کو یہ کہہ کر آسمان سے بھیجا کہ" جاپان جا جہاں کے میدان سرسبز و شاداب ہیں وسیع جاپان پر ہماری نسل تا ابد حکومت کریگی اور ہماری اولاد مثل زمین و آسمان کے ہمیشہ قائم رہے گی" اس عقیدہ کی طرف کہ جاپان اور اُس کے شہنشاہوں نے دیوتائی جنم لیا ہے' اب تک سرکاری و اخلاقی طور پر بہت توجہ دلائی جاتی ہے۔

**شنٹو مذہب جاپان کا سرکاری مذہب ہے اور جاپانیوں کی اکثریت شنٹو کی پیرو ہے**

(۱) سید راس مسعود صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۲۷ پر لکھتے ہیں۔

"چونکہ متذکرہ بالا مذاہب میں شنٹو سب سے پرانا مذہب ہے جس کی نسبت کہہ سکتے ہیں کہ وہ خاص اہل جاپان ہی کا ایک نتیجہ فکر ہے' اور چونکہ یہ مذہب مختلف صورتوں میں اب تک اس طرح جاری ہے۔ جاپانیوں کو اپنی زندگی کا مال اسی میں نظر آتا ہے' اور ملک کے زیادہ تر باشندوں پر اسی کا اثر ہے اس لئے اس مذہب کا کسی قدر

زیادہ ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا''۔

(۲) ایک اور مصنف لکھتا ہے:-

''ڈاکٹر ہالٹن مذہب کی ہر ایک تعریف پر علیحدہ علیحدہ اور تفصیلی طور پر غور کرنے اور اس مسئلہ کی پوری چھان بین کرنے کے بعد مخالف سرکاری تیقنات کے باوجود اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ موجودہ شنتو مذہب اصلی معنوں میں مذہب ہے۔ یہ جاپان کا سرکاری مذہب ہے (اس مذہب) میں ہم قومی پوجا کی موجودہ ثقافت کی صورت میں اس غیر معمولی احیاء کی صورت گری دیکھتے ہیں جو ان قومی مذاہب کے مقابلے کی دلچسپ مماثل اشکال پیش کرتی ہے جو ہزاروں سال پہلے مغربی ایشیا اور بحر روم کی تہذیبوں پر غالب تھی۔(63)

(۳) اسی طرح ڈینیل کلیارنس (Doniel clarance) لکھتا ہے:۔

''تاؤ مت کو چین کا نسلی مذہب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کہا جا سکتا ہے کہ تاؤ مت کا رخ اسی راہ پر ہے جس پر جاپان میں شنتو کا سرکاری مذہب ہے جس کا مقتدر اعلیٰ شہنشاہوں کے ایک غیر منقطع خاندان میں مرکوز اور دو ہزار سال سے ان کا مسلسل وجود اسی ایک جاپانی قوم کا قومی مذہب ہے۔ تاؤ مت چینی قوم کی انقلابی شورشوں اور حکمران خاندانوں کی تبدیلیوں کے اثرات سے داغدار اور زخم خوردہ ہے۔ لیکن شنتو مذہب ایک متحدہ قوم کے قومی مذہب کی حیثیت سے جاپان کی پوری تاریخ میں مسلسل قائم رہا ہے۔ کیونکہ جاپانی قوم کے سر پر ایک ہی حکمران خاندان کا سایہ رہا ہے اس لئے روئے عالم پر کسی ایک قوم کے اتحاد کی زندہ نشانی اور مہر رہا ہو۔(64)

# CHRISTIANITY

# عیسائیت

## عیسائیت کیا ہے

عیسائیت کی یہ تعریف کی جاتی ہے:۔

''ہم عیسائیت کی یوں تعریف کر سکتے ہیں کہ وہ ایک اخلاقی' تاریخی' عالمگیر توحید پرست اور نجات دہندہ مذہب ہے جس میں خدا اور بندے کے تعلقات کا درمیانی واسطہ خداند یسوع مسیح کی ذات اور کارنامہ ہے''۔(65)

لیکن آگے مقالہ نگار عیسائیت کو توحید پرست کے علاوہ تثلیت پرست بھی قرار دیتا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

''عیسائیت میں خدا کا تصور نہ صرف توحید پرستی ہے۔ بلکہ تثلیت پرستی بھی''ص(۵۹۶)۔

# حضرت عیسیٰؑ اور عیسائیت کی تبلیغ

دنیا کے عظیم مذاہب میں عیسائیت کا شمار ہوتا ہے کیونکہ اس مذہب کی تعلیمات نے دنیا کی تقریباً ایک تہائی آبادی کی زندگی طور طریقے' رسم و رواج' ادب فلسفہ' آرٹ اور سیاست پر اپنے گہرے نقوش قائم کئے ہیں حالانکہ عیسائیت کی ابتداء مشرق سے ہوئی لیکن کچھ عرصہ بعد مغربی قوموں نے اس مذہب کو اختیار کیا اور وہ مغرب کے لوگوں کا مخصوص مذہب ہو گیا۔ عیسائیت کی تبلیغ سب سے پہلے رومن سلطنت

میں ہوئی اور پھر یورپ اور امریکہ کی اکثر ریاستوں نے سرکاری طور پر عیسائیت کو اختیار کرلیا۔ اگر چہ ابتداء میں عیسائیت ایک تبلیغی مذہب نہیں تھا۔ لیکن بعد میں تبلیغی ہو گیا اس کی حیثیت اب ایک تبلیغی مذہب کی ہے۔ عیسائیت کی ابتداء یہودیت سے ہوئی۔ مگر چونکہ یہودیت تبلیغی مذہب نہیں تھا اور بنی اسرائیل کے قبیلوں تک محدود تھا اس لئے کچھ ہی عرصہ بعد یہودیت اور عیسائیت کے اختلافات واضح ہوتے چلے گئے اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات نے ایک علیحدہ مذہب کی شکل اختیار کر لی۔

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش فلسطین کے ایک چھوٹے سے گاؤں بیت اللحم (BETHLEHM) میں اس زمانہ میں ہوئی جب روم میں جمہوریت کا خاتمہ ہو گیا تھا اور آگسٹس سیزر برسر اقتدار آ چکا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کو قرآن پاک میں ایک معجزہ بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ آپ خدا کے حکم سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی والدہ حضرت مریمؑ تھیں جو ناصرہ میں رہتی تھیں لیکن آپ کی پیدائش کے وقت وہ بیت اللحم چلی گئیں تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی ابتدائی زندگی کے حالات نہیں معلوم سوائے اس کے کہ آپ نے ابتدائی زمانہ میں یہودی مذہب کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور بڑھئی کا ابتدائی پیشہ اختیار کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ تیس سال کی عمر میں حضرت عیسیٰؑ پر وحی نازل ہوئی اور آپ نے اپنے مذہب کی اشاعت شروع کی۔ بیماروں اور قریب المرگ انسانوں کو صحت عطا فرمانا آپ کو معجزہ کے طور پر عطا کیا گیا تھا جس کا اکثر و بیشتر ظہور ہوتا رہتا تھا۔

آپ نے الخلیل (گیلی لی) کے بہت سے دیہاتوں میں واعظ فرمائے اور آپ کی شہرت بہت جلد فلسطین میں پھیل گئی۔ آپ نے تعلیمات میں اس بات پر زور دیا کہ انسان آپس میں ایک دوسرے سے محبت کریں' مدد کریں اور دوسروں کے کام آئیں۔ بیجا طریقوں سے دولت کمانے کو اور غلط طریقوں پر طاقت استعمال کرنے کو

آپ نے منع فرمایا۔ آپ نے آسمانی بادشاہت کے قیام پر زور دیا اور دنیاوی سلطنتوں کی مخالفت کی۔ آپ کے ایک وعظ کے الفاظ ہیں:۔

"مبارک ہیں وہ جن کی روحیں غریب ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہت ان ہی کی ہے' مبارک ہیں وہ جو حلیم ہیں کیونکہ زمین کے وہی وارث ہوں گے' مبارک ہیں وہ جو غمگین ہیں کیونکہ وہی اطمینان پائیں گے۔ مبارک ہیں وہ جو رحمدل ہیں کیونکہ ان پر رحم کیا جائے گا۔ مبارک ہیں وہ جو پاک دل ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے"۔

آپ نے اس قسم کے وعظ پہاڑیوں اور میدانوں میں دیئے اور آپ کی آواز پر یہودیوں نے لبیک کہا کیونکہ وہ اپنی مذہبی تعلیمات کی بناء پر ایک مسیح کے منتظر تھے۔ جو انہیں ان کی کھوئی ہوئی سلطنت دلانے والا تھا۔ اور ان کی دنیاوی تکالیف کو ختم کرنے والا تھا۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو غریبوں نے قبول کیا کیونکہ آپ نے دولت کے مقابلے میں غربت کو پسند فرمایا تھا اور غریبوں کو آسمانی بادشاہت کے قیام کی خوشخبری دی تھی۔ جب آپ اپنی تعلیمات کی اشاعت فرماتے ہوئے یروشلم میں داخل ہوئے تو آپ کے پیچھے یہودیوں کا کثیر مجمع تھا۔ کیونکہ یہودی یہ سمجھ رہے تھے کہ آپ یروشلم میں دنیاوی بادشاہت قائم کرنے آئے ہیں۔ لیکن جب حضرت عیسیٰ نے انہیں بتایا کہ ان کا مقصد دنیاوی بادشاہت کا نہیں ہے بلکہ وہ روحانی بادشاہت قائم کرنا چاہتے ہیں تو یہ بات یہودیوں کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ ان کے مخالف ہو گئے اور انہیں یہودیت کا مخالف سمجھنے لگے۔ یہودیوں کے مذہبی پیشوا کے حکم سے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کیا گیا۔ اور انہیں رومی گورنر کے حوالے کر دیا گیا۔ یروشلم پر اس وقت رومیوں کی حکومت تھی۔ یروشلم کے رومی گورنر پونٹیس پلاطس (Pontius Pilatus) نے حضرت عیسیٰ پر بغاوت کا الزام لگا کر انہیں سزائے موت دی۔ عیسائیوں کے عقیدے

کے مطابق حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ لیکن مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق وہ صلیب پر نہیں چڑھائے گئے بلکہ خدا نے انہیں آسمان پر اُٹھا لیا اور ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص صلیب پر چڑھا دیا گیا۔

حضرت عیسیٰ کو کل ڈھائی یا تین سال تبلیغ کا موقعہ ملا تھا اور اس عرصہ میں آپ نے خدا کی وحدانیت' انسانی اخوت' اور محبت' ظلم اور لالچ سے نفرت اور ناجائز طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کی مخالفت پر زور دیا تھا اور آپ کی تعلیمات اور یہودیت کی ابتدائی تعلیمات یکساں تھیں' لیکن یہودی اپنے مذہب سے اتنے زیادہ منحرف ہو چکے تھے اور دنیاوی طمع اور لالچ کے اس قدر شکار ہو چکے تھے کہ وہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو نہ سمجھ سکے بلکہ ان کے مخالف ہو گئے۔ رومیوں میں چونکہ بت پرستی رائج تھی اور بادشاہوں کو بھی دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ لہذا حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو خاص طور پر آسمانی حکومت کے قیام کو بغاوت سمجھا گیا اور اپنے نزدیک رومیوں نے انہیں سزائے موت دیدی۔ لیکن قرآن کے مطابق "اللہ نے اس کو اپنی طرف اُٹھا لیا اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے"۔

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو جن لوگوں نے صدق دل سے قبول کیا تھا۔ ان کی تعداد بہت مختصر تھی اور اب دین عیسوی کی اشاعت کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہو گئی تھی۔ آپ کے حواریوں نے یروشلم میں آپ کی تعلیمات کو جاری رکھا اور وہاں کے اکثر یہودیوں کو عیسائیت کے حلقہ میں شامل کر لیا۔ عیسائیت میں یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے' پختہ ہوتا گیا اور اسی عقیدہ کی بناء پر عیسائیت کی اشاعت جاری رہی یروشلم کے علاوہ فلسطین اور شام میں بھی حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو فروغ ہوتا رہا۔

سنہ ۴۵ء میں ایک ایسے شخص نے عیسائی مذہب کو قبول کیا جو عیسائیت کا زبردست

عیسائیت

مبلّغ بھی بنا لیکن ساتھ ہی ساتھ اس نے عیسائیت میں نئے تصورات داخل کر کے عیسائیت کی شکل کو بالکل تبدیل کر دیا یہ سینٹ پال (St.Paul) تھا جس کا اصلی نام ساول تھا اور جو ایشیائے کوچک کا باشندہ تھا اور یہودی مذہب کا عالم سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ وہ حضرت عیسیٰؑ کا ہمعصر تھا لیکن اس نے حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا نہیں تھا اور شروع میں وہ عیسائیت اور عیسائیوں کے مخالف تھا' لیکن اس کے اپنے قول کے مطابق اس نے خواب میں حضرت عیسیٰؑ کو دیکھ کر عیسائیت کو قبول کیا اور اس کی اشاعت کی ذمہ داری سنبھالی' بیس سال تک وہ ایشیائے کوچک مقدونیہ' یونان اور اٹلی میں عیسائیت کی تبلیغ کرتا رہا اور عیسائی چرچ قائم کرتا رہا۔ لیکن وہ جس عیسائیت کی تبلیغ کر رہا تھا اس میں اس نے مشرکانہ عقائد شامل کر دیے تھے اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کی روح کو بالکل تبدیل کر دیا تھا' اس نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا تھا اور باپ بیٹے اور روح القدس کے اجتماع سے خدا کا تصور قائم کیا تھا۔ اس نے یہ کہا کہ حضرت عیسیٰؑ نے سولی پر چڑھ کر تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ اس لئے اب ان سے کسی ختم کی باز پرس نہیں ہوگی اور تمام عیسائی بغیر کسی حساب کتاب کے بہشت میں داخل کیئے جائیں گے۔

سینٹ پال کی یہ تعلیمات رومن سلطنت کے مختلف حصوں میں پھیل گئیں اور انہیں ان یہودیوں نے خاص طور پر قبول کیا جو ارض فلسطین سے باہر تھے' سینٹ پال اور حضرت عیسیٰؑ کے مشہور حواری سینٹ پیٹر (St. Peter) شہنشاہ نیرو کے عہد میں گرفتار ہو کر قتل ہوئے۔

سینٹ پال کے بعد عیسائیت کی تبلیغ ختم نہیں ہوئی بلکہ رومیوں کے مظالم کی وجہ سے عیسائیت کو فروغ ہوتا رہا اور عیسائیوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ وہ چھپ چھپ کر اپنے گروہوں کی تنظیم کرتے تھے اور پوشیدہ طریقوں پر اپنے کلیسا قائم کرتے تھے' نیرو

کے علاوہ دیگر شہنشاہوں کے زمانہ میں بھی عیسائیوں پر مظالم کیے جاتے رہے۔ ان کو قید خانے میں ڈال دیا جاتا تھا اور انہیں قتل کر دینا ایک عام سی بات ہوگئی تھی' مارکس اریلی اس (Marcus Aurelius) اور ڈیوکلیشن (Docletion) کے زمانے میں یہ مظالم انتہا کو پہنچ گئے تھے کیونکہ ان شہنشاہوں کے نزدیک عیسائیوں کا وجود دنیاوی آفات کا باعث تھا۔ ۳۰۳ء سے ۳۱۱ء تک رومن سلطنت میں عیسائیوں کا قتل عام کیا گیا اور کوشش کی گئی کہ ان کا نام ونشان تک مٹ جائے' اس دوران میں رومن سلطنت مغربی اور مشرقی سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی تھی اور دونوں سلطنتوں میں خانہ جنگی کا دور شروع ہوگیا تھا جو قسطنطین کے برسر اقتدار آنے کے بعد ختم ہوا۔

قسطنطین نے عیسائیت کو رومیوں کے آبائی مذہب پر فوقیت دی اور اسے قبول کرلیا۔ اس نے تقریباً ۳۲۵ء میں عیسائی بشپس (Bishsops) کی ایک کونسل منعقد کی جس کا مقصد حضرت عیسیٰ کے مقام کا صحیح تعین کرنا تھا کیونکہ اس وقت عیسائیوں میں ان کے متعلق تین نظریے پیدا ہو چکے تھے۔

اریئس (Arius) کے مقلدین کا یہ خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ خدا سے کمتر ہیں۔ سبیلیئین (Sebellians) فرقہ کا یہ عقیدہ کہ "حضرت عیسیٰ خدا کا ایک روپ ہیں"۔ تثلیث (Trinitarians) کے حامیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ "باپ بیٹا اور روح القدس" تین علیحدہ علیحدہ ہستیاں ہیں لیکن خدا کے مکمل تصور کیلئے ان تینوں ہستیوں کا ہونا ضروری ہے۔

قسطنطین کی منعقد کردہ کونسل نے تثلیث کے نظریہ کی حمایت کی اور حضرت عیسیٰ اور خدا کے متعلق دیگر نظریات کو کفر قرار دیا۔ اسی وقت سے باقاعدہ طور پر تثلیث کا عقیدہ عیسائیت کا ستون اوّل بن گیا اور خدا کی وحدانیت کا تصور ختم ہوگیا۔

تقریباً ۳۲۹ء میں شہنشاہ تھیوڈوسیس نے عیسائیت کو رومن شہنشاہیت کا

سرکاری مذہب قرار دے دیا اور سلطنت میں عیسائی چرچ کے علاوہ دیگر مذاہب کے عبادت خانے بند کردیئے گئے اور دیوتاؤں کی عبادت کو جرم قرار دے دیا گیا۔ تقریباً ہر شہر میں چرچ تعمیر کئے گئے اور چرچ کی تنظیم بشپ کے ذمہ دیدی گئی۔ بڑے شہروں کے بشپ چھوٹے شہروں کے بشپ پر نگراں بن گئے۔ سلطنت کے پانچ اہم شہر یروشلم' انطاکیہ اسکندریہ' قسطنطنیہ اور روم مذہبی لحاظ سے بھی اہمیت اختیار کر گئے۔ اور ان شہروں کے بشپ عیسائی دنیا میں بہت اہم سمجھے جانے لگے۔ کچھ عرصہ بعد جب رومن سلطنت کی تقسیم مستقل حیثیت اختیار کرگئی تو مغرب میں تو روم کی حیثیت برقرار رہی لیکن مشرق میں بازنطینی سلطنت کی علیحدہ حیثیت ہوگئی اور اس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ سیاسی اور مذہبی لحاظ سے سب سے اہم شہر بن گیا۔ اس طرح مغرب میں روم کا اسقف جس نے پوپ کا لقب اختیار کیا' سب سے زیادہ با اثر ہوگیا اور مشرق میں قسطنطنیہ کا اسقف مذہبی معاملات میں سب سے زیادہ اہم ہوگیا یوں مذہبی اعتبار سے عیسائی دنیا دو بڑے حصوں میں منقسم ہوگئی ایک کی رہبری روم نے اختیار کی' دوسرے کی قسطنطنیہ نے۔ مغرب میں روم کا مذہبی اقتدار تقریباً ۴۷۶ء تک قائم رہا۔ جب تک کہ جرمن قبائل نے اٹلی کو فتح کر کے روم پر قبضہ نہیں کرلیا۔ تقریباً تین سو سال تک رومن سلطنت اور عیسائی مذہب پر جرمن قبائل اثر انداز ہے لیکن شارلمن کے برسر اقتدار آنے کے بعد ۸۰۰ء میں دوبارہ روم کی اہمیت کو مغرب کی عیسائی دنیا میں تسلیم کیا گیا اور پوپ کی حیثیت مذہبی معاملات میں سب سے اہم سمجھی جانے لگی۔ اب تک روم عیسائیت کا مرکز ہے اور پوپ رومن کیتھولک فرقہ کا سب سے بڑا رہنما سمجھا جاتا ہے مشرق کی بازنطینی سلطنت کو اور قسطنطنیہ کے چرچ کو آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں انتہائی عروج نصیب ہوا لیکن مسلمانوں کی اُبھرتی ہوئی طاقت اس کے لئے خطرہ کا باعث بن گئی' یروشلم' اسکندریہ اور انطاکیہ کے شہر تو مسلمانوں کے ابتدائی دور میں ہی عیسائیوں کے ہاتھوں سے نکل

گئے' لیکن قسطنطنیہ پر عیسائیت کا اقتدار ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے نہ صرف بازنطینی سلطنت کو ختم کر دیا بلکہ مشرق سے عیسائیت کے رہے سہے اثرات بھی ختم کر دیئے۔

# عیسائیوں کی مذہبی کتابیں

عیسائیوں کی مذہبی کتاب بائبل دو حصوں پر مشتمل ہے' پہلا حصہ "عہد نامہ قدیم" (Old Testament) کا ہے۔ جس میں ۳۹ کتابیں معہ توریت کے شامل ہیں اور دوسرا حصہ "عہد نامہ جدید" (New Testament) کا ہے جس کے ۲۷ حصے ہیں' ۴ انجیل کے ہیں باقی ۲۳ حصوں پر پادریوں کے خطوط اور مکاشفات شامل ہیں' کیونکہ عیسائیت کی بنیادیں یہودیت پر قائم ہیں اور حضرت عیسیٰ کا تعلق بھی اسی قدیم مذہب سے تھا۔ اس لئے بنیادی طور پر عیسائیت اور یہودیت کی تعلیمات میں اختلاف نہیں ہے' اور جس طرح توریت یہودیوں کی مذہبی کتاب ہے اس طرح عیسائیوں کے مذہب میں بھی شامل ہے۔ حضرت عیسیٰ کے بعد ان کے حواریوں نے ان کی زندگی کے حالات اور ان کی تعلیمات کو قلمبند کیا۔ ممکن ہے کہ حضرت عیسیٰ کی زندگی میں ہی انجیل کا کچھ حصہ تحریر میں آ گیا ہو مگر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا' حضرت عیسیٰ کی تعلیمات مختلف رسالوں کی شکل میں تحریر میں لائی گئیں۔ جن چار تحریروں کو مستند سمجھا گیا اور جنہیں بائبل میں شامل کیا گیا وہ یہ ہیں۔ انجیل متیٰ (Mathew) مرقش (Mark) لوقا (Luke) اور یوحنا (John) یہ رسالے حضرت عیسیٰ کے حواریوں یا سینٹ پال کے مریدوں کے ترتیب دیے ہوئے ہیں۔ ان رسالوں کے قدیم ترین نسخے یونانی زبان میں محفوظ ہیں' جس سے ظاہر ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں تحریر میں نہیں آئے تھے بلکہ ان کے بعد لکھے گئے' کسی حد تک حضرت عیسیٰ کی صحیح تعلیمات ان رسائل میں محفوظ رہ گئیں' بتانا مشکل ہے۔ حضرت عیسیٰ کی اگر تھوڑی بہت تعلیمات اس دنیا میں

موجود ہیں تو وہ ان ہی رسائل کے ذریعہ باقی ہیں' ان رسائل کے علاوہ انجیل میں سینٹ پال اور سینٹ پطرس وغیرہ کے خطوط بھی شامل ہیں جنہیں حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح انجیل کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہے اس میں حضرت عیسیٰ سے زیادہ ان کے حواریوں اور معتقدین کی تعلیمات شامل ہیں۔ جس مذہب کی حضرت عیسیٰ نے اشاعت کی تھی اسے ان کے حواریوں اور سینٹ پال کے مریدوں نے تبدیل شدہ صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا' اور عیسائیت میں وہ عقائد داخل کر دیے جن کی حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے کوئی مطابقت نہیں تھی۔

## مذہبی تعلیمات میں تبدیلیاں اور پاپائیت کی اہمیت

عیسائیت[1] کی اشاعت چونکہ یہودیت کی بنیادوں پر ہوئی اور حضرت عیسیٰ کا مقصد بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش تھا' اس لئے بنیادی طور پر دونوں مذاہب کی تعلیم ایک ہی تھی۔ حضرت عیسیٰ نے خدا کی وحدانیت اور رسولوں پر ایمان لانے کی تعلیم دی تھی' آپ نے دنیاوی اعمال کو جزاوسزا کا پابند قرار دیا تھا اور لوگوں کو اس دن سے ڈرایا تھا جس دن ان کے اعمال کی بازپرس کی جائے گی۔ آپ نے اس بات پر زور دیا تھا کہ لوگ قناعت اور صبر کی زندگی بسر کریں' دوسروں کو اپنی ذات سے نقصان نہ پہنچائیں' دولت کے پیچھے نہ بھاگیں اور اپنے خالق کے سامنے عجز وانکساری کا اظہار کریں۔ لیکن حضرت عیسیٰ کی یہ سیدھی سادھی تعلیمات جلد ہی فراموش کر دی گئیں' اور عیسائیت پر یونانی فلسفہ کے اثرات قائم ہو گئے' سینٹ پال نے پہلی صدی عیسوی ہی میں کلیسائی نظام قائم کر دیا۔ اور حضرت عیسیٰ کے رتبے کو انسانوں سے بلند کر کے خدا تک پہنچا دیا۔ اس نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بتایا' اور اس خیال کی اشاعت کی کہ حضرت عیسیٰ نے صلیب پر چڑھ کر تمام عیسائیوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا اور اب عیسائیوں سے ان کے اعمال کی بازپرس نہیں ہو گی' پال کے بعد عیسائیت میں خدا کا

---

[1] عیسائیت

تصور مزید پیچیدہ ہوتا چلا گیا اور خدا کے تصور میں اختلافات کی بناء پر عیسائی تین فرقوں میں بٹ گئے' شہنشاہ قسطنطنیہ نے ۳۲۵ء میں نیکا کی کونسل (Council of Nicaea) بلائی جس نے تثلیث کے عقیدے کو قبول کیا اور حضرت عیسیٰ اور روح القدس کو خدا کے وجود کیلئے ضروری قرار دیا۔ کلیساؤں میں خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰ کی عبادت بھی کی جانے لگی' اور پانچویں صدی عیسوی میں اسکندریہ کے عیسائی علماء نے حضرت مریم کو "مادر خدا" کا خطاب دیکر انہیں بھی عبودیت کا رتبہ دے دیا۔ پہلے خدا' خدا کا بیٹا' اور روح القدس سے تثلیث کا تصور وابستہ تھا' اب ماں' باپ اور بیٹا" (یعنی خدا' مریم اور عیسیٰ) معبود قرار پائے اور اس طرح تثلیث کا عقیدہ ایک نئی شکل اختیار کر گیا۔ حضرت عیسیٰ کی تصاویر اور بتوں کے ساتھ ساتھ حضرت مریم کے بت بھی کلیساؤں میں نصب کئے جانے لگے' اور اس طرح عیسائیت میں بت پرستی بڑی طرح رائج ہوگئی۔

## عیسائیت کی تاریخ کے تین ادوار

عیسائیت کی تاریخ کو عام طور پر تین ادوار میں منقسم کیا جاتا ہے' پہلا دور قدیم عیسائیت پر مبنی ہے جو پہلی آٹھ عیسوی صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس زمانہ میں یروشلم سے عیسائیت کی ابتداء ہوتی ہے' اور رومن سلطنت میں یہ سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ رومن سلطنت کے زوال کے بعد بھی عیسائیت کی تبلیغ جاری رہی اور یورپ کی نئی ریاستوں میں عیسائیت کو فروغ ہوتا رہا' دوسرا دور درمیانی دور ہے جو تقریباً سات سو سال تک یعنی نویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی تک رہا' اس زمانے میں روم کے کلیسا کی اہمیت سارے یورپ میں تسلیم کی گئی اور مغربی یورپ کی عیسائی سلطنتیں روم کے پوپ کی اطاعت گذار سمجھی جانے لگی۔ لیکن اسی زمانے میں روم کے علاوہ مشرق میں بھی عیسائیت کا دوسرا مرکز قسطنطنیہ بھی ایک علیحدہ حیثیت اختیار کر گیا اور مشرق میں

عیسائیت کے جس فرقہ کی نشو ونما ہوئی اسے تقلید پسند (Eastern Orthodox) کہا گیا اس درمیانی دور میں ہی عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان صلیبی جنگیں لڑی گئیں جن کا انجام عیسائیوں کی ناکامی پر ہوا' تیسرا دور موجودہ دور ہے جو سولہویں صدی سے شروع ہوا ہے۔ اور اب تک قائم ہے اس زمانہ میں مذہب میں اصلاحات کی مختلف تحریکوں کو فروغ ہوا اور ساتھ ہی ساتھ ایسی تحریکوں کی بھی ابتداء ہوئی جنہوں نے عیسائی مذہب کو انسان کی ذات تک محدود کر دیا اور مذہب کو ذاتی معاملہ بنا دیا۔ موجودہ زمانہ میں عیسائیت کی تبلیغ جاری ہے لیکن عیسائیوں کے نزدیک مذہب کا تعلق انسان کی نجی زندگی سے ہے اسے دنیاوی معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عیسائیت اشتراکیت مقابلہ کرنے میں ناکام ہے اور اشتراکیت کو ان ممالک میں عروج ہوا ہے جو پہلے عیسائی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔

رومن سلطنت کے زوال کے وقت (۳۹۵ عیسوی سے ۴۴۵ عیسوی تک)

عیسائیت کی تبلیغ تمام رومن سلطنت میں ہو چکی تھی لیکن جب رومن سلطنت پر جرمن اور دیگر قبائل کے حملے شروع ہوئے اور متمدن دنیا پر بربری اور وحشی لوگوں نے قبضہ کرنا شروع کر دیا تو عیسائیت کا مستقبل بھی تاریک معلوم ہونے لگا لیکن عیسائیوں کی تبلیغی جماعت نے اپنا کام جاری رکھا اور حملہ آور قبائل (جو روم کے سیاسی اور تہذیبی وارث بننا چاہتے تھے) میں عیسائیت کی اشاعت کی۔ رومن سلطنت پر زوال آ گیا' لیکن روم کے کلیسا پر زوال نہیں آیا اور کلیسا کی حرمت برقرار رہی' پوپ نے اٹلی' فرانس' انگلستان اور جرمنی کے علاقوں میں مبلغین بھیجے جہاں انہیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی' جرمنی اور فرانس کے بڑے حصے پر جن قبائل نے فتوحات حاصل کیں وہ فرنکس کہلاتے تھے مبلغین کی کوشش کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں فرانکس قبائل نے عیسائیت کو قبول کر لیا اور جب ان میں بادشاہت قائم ہوئی تو فرنکس بادشاہوں کو عیسائی دنیا میں بہت زیادہ

اہمیت حاصل ہوگئی اور یہ پوپ کے محافظ بن گئے۔

چھٹی صدی عیسوی میں انگلستان اور آئرلینڈ میں عیسائیت کو فروغ ہوا اور آٹھویں صدی عیسوی میں جرمنی میں عیسائیت کی تبلیغ زوروں پر ہوئی۔ جرمن قبائل کی اکثریت نے عیسائیت کو قبول کرلیا۔ جب شارلمن آٹھویں صدی کے اختتام پر فرنکس کا بادشاہ ہوا تو اس نے عیسائیت کی بنیادوں پر اپنی شہنشاہیت کی تشکیل کی اور ۸۰۰ء میں پوپ کے ہاتھوں سے تاج شاہی پہنا۔ اس کے بعد سے عیسائی بادشاہوں کیلئے ضروری ہوگیا کہ وہ پوپ سے اختیارات حکمرانی حاصل کریں اور انہیں اس کی امانت کے طور پر حاصل کریں لیکن چونکہ پوپ کے پاس کوئی فوجی طاقت نہیں تھی اس لئے اکثر روم کی پاپائیت کو فوجی طاقت کے سامنے جھکنا پڑا اور اس طرح پوپ اور حکمرانوں کے درمیان برتری کی کشمکش شروع ہوگئی۔ یہ کشمکش نویں صدی عیسوی سے لے کر سولھویں صدی عیسوی تک جاری رہی اس زمانے میں کبھی پوپ کی طاقت انتہائی عروج پر پہنچ گئی اور کبھی وہ جرمن فرانس یا انگلستان کے بادشاہوں کے مقابلے میں بے بس ہوگیا۔ فرانس کے حکمرانوں نے تو تقریباً ۷۰ سال تک (۱۳۰۹ء سے ۱۳۷۶ء تک) پاپائیت کے مرکز کو روم سے تبدیل کر کے اپنی سلطنت کے شہر 'ادنون' (Auignon) میں منتقل کردیا تھا۔ اسی زمانہ میں جرمنی اور انگلستان کے حکمرانوں نے پاپائیت کی مذہبی برتری کے خلاف بغاوت کردی اور علیحدہ علیحدہ کلیساؤں کی بنیادیں ڈال دیں۔ اس طرح عیسائیت کی مغربی دنیا میں چودھویں صدی سے ہی پاپائیت کی مرکزی حیثیت ختم ہوگئی اور عیسائیوں میں نئے کلیسائیوں کو عروج ہونے لگا جن کی بناء پر عیسائی دنیا مذہبی طور پر کئی اہم فرقوں میں بٹ گئی۔

اس بارے میں ہم تفصیلی طور پر وہاں غور کریں گے جہاں عیسائیت کے تین بڑے مذاہب (رومن کیتھولک' آرتھوڈکس اور پروٹسٹنٹ) کا جائزہ لیں گے لیکن

یہاں اس قدر کہنا کافی ہو گا کہ عیسائیت ابراہیمی مذاہب کی شاخ ہے۔ اس لئے اس میں ملتِ ابراہیمی کے مرکزی عقیدہ (توحید) کے آثار باقی ہیں لیکن اس کے ساتھ حضرت عیسیٰ کی اُلوہیت اور خدا کے بیٹے کے تصور کا پیوند بھی لگا دیا گیا ہے جس کے باعث حضرت عیسیٰ کی تاریخی شخصیت گہنا گئی ہے۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار کہتا ہے۔ ''اپنے مقدمہ کے ابتدائی جملوں میں پفلیڈرس (Pfleders) حضرت مسیح کی شخصیت کے متعلق نہایت وضاحت سے لکھتا ہے۔ انیسویں صدی کی سائنٹیفک مذہبی تعلیمات (دینیات) کا یہ عظیم الشان اور دیرپا کارنامہ ہے کہ اس نے تاریخ کے مسیح اور مذہبی مسیح میں امتیاز کرنا سکھایا۔ یہ دونوں جداگانہ شخصیتیں ہیں جن کو مذہبی روایات نے ایک کر دیا تھا۔ محتاط اور پر مشقت تنقیدی تحقیقات اور جانچ پڑتال کے ذریعہ یہ واضح کیا گیا کہ کس طرح انسان کو خدا سمجھنے کا عقیدہ بتدریج پیدا ہوا جو دراصل عقائد کے حضرت عیسیٰ کی زندگی کے بارے میں ابتدائی کلیسا کے سوانح و وقائع سے خلط ملط کا نتیجہ تھا۔

## عیسائیت کی اصل

لوسے (Loesy) اپنی کتاب مذہب کلیسا (Gospel of the Church) میں ہارنیاک (Harnack) کا بالکل برخلاف جس کے مشرقی اور پاپائی عقیدہ کے نظریہ کو وہ رومن کیتھولک مذہب پر ایک حملہ قرار دیتا ہے' یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ عیسائیت کی بنیادیں وہ نہیں ہیں جن کو ہارنیاک بیان کرتا ہے بلکہ ان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ بلحاظ ضرورت جائز طور پر رومن کیتھولک مذہب نے ان کو اختیار کر لیا ہے۔

> ''لوسے اس مفروضہ اور قیاس سے ابتدا کرتا ہے کہ انجیلیں اصلی معنوں میں تاریخی دستاویزات نہیں ہیں''۔

## عیسائیت مذہب کے مطالعہ کا صحیح طریقہ

عیسائی مذہب کی تاریخ اور تعلیمات کے مطالعہ کا بہترین طریقہ یہ بتلایا جاتا ہے کہ جرمنی کے اندر حالیہ سالوں میں ٹرالٹش (Troltich) اس امر پر مصر رہا ہے کہ عیسائیت کا دنیا کے ایک مذہب ہونے کے مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ سائنس کے انداز میں مطالعہ ہونا چاہیئے ۔یعنی خالص عقیدہ کے انداز میں نہیں بلکہ مذہبی و تاریخی انداز میں جس کے تین اصول ہیں اور جس کو ہم اجمالاً تنقیدی' مربوط اور تقابلی کہہ سکتے ہیں''۔

## مختلف عیسائی مذاہب

عیسائی مذاہب کے عقائد اور تعلیمات پر تفصیلی طور پر غور کرنا اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم عیسائی مذہب کے تین بڑے فرقوں یعنی (۱) تقلید پسندی (Eastern Arthodesy) (۲) رومن کیتھولک اور (۳) پروٹسٹنٹ مذہب کے عقائد اور تاریخ پر جداگانہ غور کریں۔ کیونکہ ان تینوں فرقوں کے درمیان عیسائیت کی اساسی مذہبی تعلیمات کے بارے میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ان مذاہب کی تعلیمات اور تاریخ کے بارے میں تبصرے کیلئے اگر ہم ٹرالٹش (Troltich) کے بیان کردہ اصول پر عمل کریں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو ہمیں عیسائیت کے ان تینوں مذاہب کا تنقیدی مربوط اور تقابلی مطالعہ کرنا پڑے گا۔اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ خود یہ فرض انجام دینے کے بجائے کتاب موجودہ دنیا کے بڑے مذاہب (The Great Religions of the Modern World) کے جستہ جستہ اقتباسات کے ذریعہ اپنے ناظرین کے سامنے اس کا ایک مجمل خاکہ پیش کریں۔ بلحاظ عددی اہمیت اور قدامت ہم ذیل میں بالترتیب ان کا ذکر کرتے ہیں:

# رومن کیتھولک مذہب

## مختلف پہلو

جیرالڈ گرولینڈ والش (Gerald Groveland Volsh) رومن کیتھولک مذہب پر اپنے مقالہ میں یوں لکھتا ہے: ''جہاں تک تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے رومن کیتھولک مذہب کی تاریخ وہ ہے جس کو ہم ستائیس عیسوی کا ابتدائی موسم گرما کہتے ہیں۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ اسی زمانے میں غلیلو (Galiloe) کے مقام پر آئے اور انہوں نے آسمانی بادشاہت کے عقیدے کی تبلیغ کی اس ''بادشاہت'' کی حضرت عیسیٰ نے ابتداء جو تعریف کی وہ اس وعدہ کی تکمیل تھی کہ ''وقت پورا ہوگیا اور خدا کی بادشاہت اب قریب ہے''۔ اور جو لوگ اس میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ ان پر دو شرائط عائد کی گئیں کہ ''وہ توبہ کریں اور ایمان لے آئیں''۔ کیونکہ ان کی تبلیغ کے پہلے چھ مہینے میں حضرت عیسیٰ پہلی ہی شرط پر زور دیتے رہے یعنی توبہ تبدیلی قلب اخلاقی تعبیر شخصی تکمیل ذات کے ساتھ میری پیروی کرو۔ انہوں نے کہا کہ مبارک ہیں وہ لوگ جو مزاج میں غریب ہیں ......... مسکین ......... مہربان ہیں ......... صاف دل ہیں ......... اور وہ لوگ جو انصاف کیلئے مصیبت اُٹھاتے ہیں' کیونکہ آسمان کی بادشاہت ان ہی کیلئے ہے۔

بعد میں حضرت عیسیٰ نے اس عقیدے کی تبلیغ کی جس کو ہم آجکل عیسائیت کا معمر کہتے ہیں۔ یعنی یہ تعلیم کہ جو شخص میری خاطر اپنی زندگی کھوتا ہے وہ اس کو ملے گی۔

آپ کی بادشاہت کا دوسرا بنیادی پہلو صداقت اور ایمان کا عقیدہ ہے' یہ ایک سرِ باطن کے طور پر مشہور ہے۔ یہ نہ صرف ارادے کی متابعت ہے بلکہ ذہن کا مقابلہ ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ اپنے پیرووں سے فرماتے ہیں' خدا کی بادشاہت کے راز کے معلوم کرنے کا تمہیں موقع دیا گیا ہے۔

---

عیسائیت[1]

یہ بادشاہت اپنے آپ کو ظاہر کرنے لگی' چنانچہ اس کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ مردوں اور عورتوں کے ایک منظم معاشرے کی حیثیت سے یعنی ایک جماعت کی حیثیت سے وہ اس صداقت اور اس کے طریقے کے مطابق زندگی گذارنے لگے۔

حضرت عیسیٰؑ کے بہت سے اقوال اور افعال میں اس بادشاہت کے چوتھے پہلو کو ظاہر کیا گیا ہے جو اور زیادہ پُر اسرار تھا۔ انہوں نے اپنے پیروؤں سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اپنی متفقہ مرضی سے وہ ان کے طریقے کی پیروی کریں بلکہ یہ فرمایا کہ خدا کی مدد اور اس کی مہربانی کے راستوں سے وہ خدا کی پیروی کریں۔

اس بادشاہت کا ایک پانچواں پہلو اس سے بھی زیادہ گہرا اور پُر اسرار تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے نہ صرف اپنی ''بادشاہت'' کے ساتھ اپنے آپ کو ضابطے' عقیدے اور جماعت کی حیثیت سے مثل کر دیا۔ کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ میں مذہب ہوں صداقت ہوں اور زندگی ہوں بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو خدا کی ذات کے مشابہ کر دیا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

> ''ابراہیم کے وجود سے پہلے میں تھا...... میں اور مقدس باپ ایک ہیں...... میں مقدس باپ میں ہوں اور مقدس باپ مجھ میں ہے...... مقدس باپ جن چیزوں کا مالک ہے وہ میری ہیں...... میں مقدس باپ سے پیدا ہوا ہوں''۔

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں:۔

> ''ابھی مجھے تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں' لیکن ابھی تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جو وہ جو صداقت کی روح ہے آئے گا تو وہ تم کو پوری صداقت کی تعلیم دے گا...... اور جو چیزیں پیش آنے والی ہیں

وہ تمہیں بتلا دے گا‘‘۔ (جان ۱۲ تا ۱۴ صفحہ ۳۱۰)

## کیتھولک مذہب کے پیروؤں کے تجربات اور محسوسات

(۱) کیتھولک مذہب کا پیرو پہلے تو اس چیز کو محسوس کرتا ہے جو اس کے نزدیک خدائی طاقت کا اظہار ہے ایک ایسا روحانی احساس جس کے باعث وہ اپنے آپ کو خدا کی معیت میں محسوس کرتا ہے تاکہ وہ خدا کی مرضی کی پیروی کے مطالبہ کا جواب دے سکے چاہے وہ خدا کے راستے میں لڑکھڑاتا ہوا ہی چلے۔ یہ ایک خاص طریقہء زندگی ہے یہ ایک اخلاقی ضابطہ ہے جو اس کی دانست میں ماورائے عقل وادارک ہے۔

(۲) کیتھولک مذہب کا پیروی دوسری چیز محسوس کرتا ہے کہ وہ آسمانی روشنی سے ایک ربط رکھتا ہے یہ ایک ایسی روشنی ہے جس کے باعث وہ اپنے آپ کو گوشت اور خون کے قدرتی تقاضوں کی قوت سے بالاتر محسوس کرتا ہے۔

(۳) کیتھولک مذہب کا پیرو ان تمام اشخاص سے ایک روحانی رشتہ محسوس کرتا ہے جو علانیہ اس راستے اور صداقت پر چلتے ہیں جو ان کو اس زندہ اقتدار کی طرف سے دکھلایا جاتا ہے جو کسی نظر آنے والے (مرئی) معاشرہ میں موجود ہوتی ہے اور جو ان کی دانست میں انسانی اور الٰہی حیثیت سے ایک ایسی زندگی رکھتی ہے جو حضرت عیسیٰ کی زندگی کے مشابہ ہو چنانچہ پوپ کی ذات تاریخی کلیسا کے صدر حاضر کی حیثیت سے حضرت عیسیٰ کی نمائندے کی ہے وہ حضرت عیسیٰ کا نائب ہے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس پُر اسرار ہستی کا ایک رہنما یعنی حضرت عیسیٰ کی مقدس ذات ہے۔

## (۲) مشرقی تقلید پسندی Eastern Orthodoxy

جوزف ایل ہراماڈکا (Joseph L Hromadka) لکھتا ہے:-

''سوویت یونین کے علاقہ تاریخی طور پر تقلید پسند عیسائیت کا مرکز ہے۔ خیف اور ماسکو کو عیسائیت کا یہ عقیدہ بازنطینیوں سے ملا ہے۔ عبادات' دینیات' اور کلیسا کی پالیسی میں روسیوں یوکرینیوں' سفید روسیوں اور قفقازی اقوام کا عیسائی عقیدہ' مصر' شام' ایشیائے کوچک' یونان اور قسطنطنیہ کے قدیم کلیسا کی روحانی' اخلاقی اور علمی روایات کے سرچشمے سے پھوٹا ہے۔

### اس مذہب کے مختلف نام

مشرق کلیسا کے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری دستاویزات میں مختلف نام بیان کئے جاتے ہیں چنانچہ کوئی اس کو The Arthodox Catholic of The Eastern کہتا ہے اور کوئی Apostolic Church of the East. Church. کہتا ہے' کوئی صرف Orthodox Church. کہتا ہے لیکن حالیہ زمانے میں مشرق کے ماہرین دینیات .Orthodoxy or Orthodox Church کہتے ہیں۔ آرتھوڈکس' ہے ان کے نزدیک مراد صحیح اعتقاد سے زیادہ صحیح عبادت' صحیح اقرار گناہ اور اس قیادت کا غیر متنازعہ تسلسل نیز مذہبی رسومات کا اشتراک ہے جو قدیم کلیسا کی پیداوار ہے اور جو اب تک جاری ہے۔ مشرق کا لفظ کلیسا کے کسی مقامی یا جغرافی حد کو ظاہر نہیں کرتا۔ یہ صرف دوسرے روم (یعنی قسطنطنیہ) کی شاندار یاد کو ظاہر کرتا ہے جو مشرقی عیسائیوں کے ذہن میں سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کا جانشین تھا اور جو تقلید

---

عیسائیت

پسندی اور قدامت پرستی کی روایات کا گہوارہ تھا۔ ۳۸۱ء کے بعد قسطنطنیہ کے بشپ کو ایسا اعزاز عطا کیا گیا جو صرف روم کے بشپ سے کم تر تھا' اور مشرقی کلیسا نے رومی بشپ کی اس برتری سے کبھی اختلاف نہیں کیا لیکن مغربی چرچ کا پیشوا اپنے مراعات اور اعزازات سے اس بناء پر محروم کر دیا گیا کہ اس نے پرانی روایت کے خلاف ورزی کی اور وہ عقیدے اور اقتدار کے دائرے میں برتری کا دعویٰ کرنے لگا۔ جو مشرقی عیسائیوں کی رائے میں قدیم کلیسا کی روح اور آزادی کے خلاف تھا۔ قسطنطنیہ کے بشپ کی برتری خالص تاریخی اور مثالی ہے جس کا کوئی تعلق اختیارات سماعت کے مضمرات سے نہیں ہے۔

۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کے سقوط کے بعد روسی آرتھوڈکس کلیسا کو مشرقی عیسائیت کے رقبے میں اپنی حقیقی قیادت کا احساس روزافزوں ہونے لگا۔ اس کے فکری نمائندوں نے تاریخ کا ایک ایسا فلسفہ گھڑا جس میں ماسکو کو تیسرا روم ظاہر کیا گیا تھا' جو روم اور قسطنطنیہ دونوں کا وارث تھا' چنانچہ کہا گیا کہ

> ''دو روم مفتوح اور ختم ہو گئے یعنی مغربی اور مشرقی' تقدیر نے ماسکو کیلئے تیسرے روم کا مقام متعین کر دیا ہے۔ اب چوتھا روم کبھی نہ ہو گا''۔

یہ اعلان ایک روسی راہب فلوتھیوس (Philotheus) نے قسطنطنیہ کے سقوط کے فوراً بعد کیا تھا۔ مشرقی اور مغربی کلیسا کی یہ مکمل علیحدگی (۱۰۵۴ء) میں ہوئی۔ قسطنطنیہ کے بطریق میکائل سرولوریوس نے اپنے شہر میں نیز بالواسطہ طور پر بلغاریہ میں لاطینی کلیسا کو بند کروا دیا۔

## مشرقی تقلید پرستوں اور رومن کیتھولک میں اختلاف

سرکاری طور پر مغربی اور مشرقی کلیسا کے جن نقاط پر بحث کی جاتی ہے وہ

جزوی نوعیت کے ہیں ...... اس اختلاف کے پیچھے جو بنیادی اسباب ہیں وہ نا قابل امتیاز اور بسا اوقات نا قابل فہم ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایسی بنیاد بن گئے ہیں جن پر مشرقی کلیسا نے عیسائیت کی ایک جداگانہ تاریخی صورت اختیار کر لی ہے۔

اس بناء پر مشرقی کلیسا کے عقیدہ کے مطابق ان دونوں میں حسب ذیل اختلافات پائے جاتے ہیں:۔

(۱) کلیسا صرف ایک ہے کیونکہ حضرت یسوع مسیح کی ذات صرف ایک ہو سکتی ہے۔

(۲) صرف کلیسا ہی صداقت کی قطعی صورت اور معیار ہے۔

(۳) سچی بات یہ ہے کہ غلطی سے مبرا کوئی خاص عہدہ یا طریقہ نہیں

## مشرقی تقلید پسندی کے اصلی عقائد

اُوپر جو کچھ بیان ہوا وہ تو ایسے اختلاف تھے جو عیسائیوں کے دونوں فرقوں میں پائے جاتے ہیں۔ اب ہم ذیل میں ان عقائد کا ذکر کریں گے جو مشرقی تقلید پسندی میں ایجابی طور پر پائے جاتے ہیں:۔

(۱) مشرقی کلیسا کی ذہنی، عبادتی اور عملی زندگی کا مغز حضرت یسوع مسیح کا بشکل انسان دوبارہ پیدا ہونا ہے۔

(۲) مشرقی کلیسا یسوع مسیح کی انسانی اور الٰہی نوعیت کا اقرار کرتا ہے لیکن حضرت عیسیٰ کی خدا بصیرت انسان کی حیثیت سے مکمل وجودی اتحاد کی حیثیت سے تعبیر کرتا ہے۔

(۳) خدا بصورت انسان کا وجود، دوبارہ زندگی اور اس کا پُر اسرار اور روایاتی وجود ہی دراصل عشائے ربّانی کی عام عبادت کے اصلی معنی ہیں۔

## سات عبادات

مشرقی کلیسا میں سرکاری طور پر مقبولہ سات عبادات ہیں:-

(۱) بپتسمہ (۲) عید منانا (۳) توبہ (دوسرا بپتسمہ) (۴) مقدس عشائے ربانی (۵) مقدس احکامات (۶) ازدواج (۷) مریضوں کی خبر گیری۔

## پروٹسٹنٹ مذہب Protestants

جان الیگزینڈر میکے (John Alexender Mackey) لکھتا ہے:-

''قریب تر زمانے میں عیسائی طریقہ زندگی نے جو تاریخی صورت اختیار کی اس کو عام طور پر پروٹسٹنٹ مذہب کے عام نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جہاں تک اس اصطلاح کے مقصدی مظاہر کا تعلق ہے پروٹسٹنٹ مذہب تینوں عیسائی مذاہب میں جدید ترین ہے۔ اگر ہم اور زیادہ متعین ہو جائیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسا عیسائی مذہب ہے جس کی مذہبی صورت' اس کا اعتقادی مقام اور سولہویں صدی کی مساعی سے متعلق اس کا روحانی نقطہ نظر اس امر کا باعث بنا کہ وہ عیسائیت کی اس تعریف کے مقابلے میں اس کو زیادہ بامعنی بنائے جو سولہویں صدی میں رائج تھی۔

# پروٹسٹنٹ مذہب کی دو اقسام

گزشتہ چار صدیوں کے پس منظر میں پروٹسٹنٹ مذہب نے اپنے آپ کو دو اصلی مذہبی اقسام میں ظاہر کیا ہے ان کو ہم (الف) کلاسیکل پروٹسٹنٹ (ب) ریڈیکل پرٹسٹنٹ مذہب کہہ سکتے ہیں۔ کلاسیکل مذہب سے ہماری مراد وہ عظیم الشان نظام کلیسا ہے جو اگرچہ اس عیسائیت کے خلاف ایک بغاوت تھی جو عیسائیت کے اس

---

عہد میں قرار پا چکی تھی۔ کلاسیکل پرٹسٹنٹ مذہب کی نمائندگی (۱) لوتھری (۲) اصلاح یافتہ اور (۳) انگریزی کلیسا کرتا ہے۔ ریڈیکل پروٹسٹنٹ مذہب مختلف مذہبی فرقوں کی ترجمانی کرتا ہے یعنی ان تمام مذہبی جماعتوں پر مشتمل ہے جو مختلف مذہبی خیال کے ترجمان ہیں اور جو دائیں یا بائیں بازو کے مخصوص رجحانات کو ظاہر کرتے ہیں' اور جن کے متعلق خیال یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد اور رجحانات کے ذریعہ عیسائیت کے ضروری عقائد کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اب ہم ذیل میں ان مختلف فرقوں کا حال بیان کریں گے۔

### (۱) لوتھر کے پیرو

لوتھر کے پیرووں سے مراد یہ ہے کہ عیسائی نقطۂ نظر پر خاص طور سے زور دیا جائے اور ان خاص کلیساؤں پر زور دیا جائے جو اپنے وجود کیلئے مارٹن لوتھر کی سرگرمی' روح اور عقائد کے شرمندۂ احسان ہیں' لوتھر کے کلیسا زیادہ تر جرمنی' ممالک اسکنڈی نیویا اور ممالک متحدہ امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔ اپنے بانی مذہب کی پیروی میں اپنی پوری تاریخ کے دوران میں وہ دو بنیادی حقائق میں دلچسپی لیتے ہیں' روحانی زندگی اور گرجاؤں کی عبادت۔ ان کے نزدیک کلیسا دنیوی زندگی کیلئے ذمہ دار نہیں۔ یہ اس خیال کے مسلسل حامی رہے ہیں کہ محبت کے قانون کو سیاسیات کے دائرہ میں برتنے کی کوشش نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ گناہ کے باعث سیاسی نظام' خدائی بادشاہت کے قوانین کے مطابق رُو بہ عمل نہیں آ سکتا۔

اس عقیدہ کے بارے میں مقالہ نگار حسب ذیل رائے کا اظہار کرتا ہے:۔

(۱) اگرچہ یہ الزام بالکل غلط ہے کہ اڈالف ہٹلر اور جرمن نازیت کیلئے اصلی ذمہ داری لوتھر کے سر عائد ہوتی ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ جرمنی میں لوتھر کے عقیدے

کے مطابق سرکاری معاملات سے روایاتی بے تعلقی نے اس ملک کے معاشرہ اور حکومت کیلئے یہ آسان کر دیا تھا کہ وہ عیسائیت کی ہدایت سے اپنے آپ کو آزاد کر لے۔

## (۲) کالون کا پیرو (Calvinists)

تاریخی طور پر اس مذہب کا دوسرا درجہ ہے لیکن آج کل پروٹسٹنٹ دنیا میں اپنے اثر نیز اپنے پیرووں کی تعداد کے لحاظ سے یہ پہلے درجہ میں ہے۔ کالون کے مذہب کو اصلاح یافتہ عیسائیت بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اصلاح یافتہ عیسائیت جان کالون کے افکار و خیالات سے پیدا ہوئی۔ جس کا جذبہ یہ تھا کہ وہ عیسائیت کی اس طرح اصلاح کرے کہ وہ اصل عیسائیت کے مشابہ ہو جائے۔

کالون ایک فرانسیسی تھا اس نے بڑی سخت مذہبی ریاضت کی تھی۔ اس کے مرید بیفا کے الفاظ یہ ہیں: ''اس نے دیگر تمام علوم ترک کر دیئے اور اپنے آپ کو اپنے خدا کیلئے مخصوص کر دیا''۔ اُس نے اپنی مذہبی تحریروں کے ذریعے خصوصاً عیسائی مذہب کے اداروں سے متعلق، مبلغ و مقرر کی حیثیت سے نیز جنیوا میں کلیسا کی تنظیم کے بانی کی حیثیت سے (جہاں وہ فرانس سے جلاوطنی کے بعد فروکش ہو گیا تھا) کالون مذہبی اور دنیوی تاریخ میں دنیا کی زبردست انقلابی شخصیتوں میں سے ایک ہو گیا تھا۔ اپنے عہد کے کسی اور شخص سے زیادہ اس نے یورپ کو تباہی سے بچا لیا۔ اس کے پیشرو (لوتھر) کا جوش و خروش ایک روح اور ذریعہ نجات تھا لیکن کالون کو جوش و خروش اور جذبہ دراصل ایک الٰہی صداقت اور عقیدہ تھا۔

## (۳) انگریزی کلیسا (Anglican Church)

انگلستان کا انگریزی کلیسا جو ہنری ہفتم کے زمانے سے اس ملک کا مسلّمہ کلیسا ہے۔ ایک جداگانہ مذہبی وجود کی حیثیت اختیار کرنے کے بعد (یعنی ہنری ہفتم اور

پوپ کے درمیان لڑائی کے بعد) انگریزی چرچ اپنی مخصوص نوعیت و روح کیلئے کسی حیثیت سے انگریز بادشاہوں یا ان کے دور حکومت کا رہن منت نہیں بلکہ رچرڈ ہوکر اور جیری ٹیلی جیسی شخصیتوں کا شرمندۂ احسان ہے جو ملکہ الزبتھ کے دور حکومت میں انگریزی کلیسا کے بانی ہوئے ہیں۔

ریڈیکل پروٹسٹنٹ مذہب کی بہترین نمائندگی (۱)(Congregationalists) (۲)(Baptists) (۳)(Methodists) اور (۴)(Quakers) کرتے ہیں۔

## ان کے عقائد کے اہم اور بنیادی اُصول

(۱) انجیل کا اعلیٰ اور مکمل اقتدار پروٹسٹنٹ مذہب کی تاریخ میں اس ادعا کے ساتھ آیا کہ انجیل کے قدیم اور جدید صحیفے نہ کہ روایات یا کلیسا ان تمام سوالات سے متعلق قطعی اختیار رکھتے ہیں جو عیسائی عقیدے اور اعمال سے متعلق پیدا ہوں۔ یہ عقیدہ رومن کیتھولک چرچ کے اقتدار کے خلاف تھا۔ خصوصاً یہ پوپ کے خلاف تھا جس نے اس اقتدار کو اپنی ذات میں مرکوز کر لیا تھا۔ درآنحالیکہ قبل ازیں اس کو مذہبی رہنماؤں کی نسل استعمال کرتی تھی۔

(۲) پروٹسٹنٹ مذہب میں خداوند یسوع مسیح کے راست اقتدار' عیسائیوں کے عقیدے اور عمل میں حضرت مسیح کی ذات مقدس کا بالراست اثر اور حضرت مسیح کی ذات اور انسانوں کی روح میں بالراست تعلق پر پروٹسٹنٹ مذہب میں بنیادی زور دیا گیا ہے اس لئے حسب ذیل چار گنا اقرارت دراصل انسانوں کے ساتھ مسیح کے اس تعلق کے معنی اور اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں جو پروٹسٹنٹ مذہب کی خصوصیت ہے۔

# چہار گونہ اقرارات

(الف) نجات یسوع مسیح پر اعتقاد سے حاصل ہوتی ہے۔

(ب) عالم کے کلیسا کی اعلیٰ ترین مقتدر ہستی یسوع مسیح کی ذات ہے۔ اس لئے مملکت کے بارے میں بھی مسیح کا اقتدار مساوی طور پر فیصلہ کن ہونا چاہئے۔ پروٹسٹنٹ مذہب کے پیروؤں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی ایسی طرز حکومت میں شریک ہوں یا اس سے فائدہ حاصل کریں جس کے اصول عیسائی مذہب کی صداقت کے خلاف ہوں یا کلیسا کے اس حق کے خلاف ہوں کہ وہ خدا کی صداقت اور خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گذارنے کا اعلان کرے۔

(ج) یسوع مسیح کا جسمانی وجود (جس طرح وہ انجیل سے ظاہر ہوتا ہے) انسانی زندگی کیلئے ایک معیار (اُسوہ) ہے۔

(د) مسیح کی ذات عمل کیلئے ایک خزانہ طاقت ہے۔

پروٹسٹنٹ نقطۂ نظر سے عیسائی کلیسا کا اصلی فرض خدا کی گواہی بن جاتا ہے۔ انجیل کی یہ گواہی قولاً وفعلاً ہونی چاہیئے۔ اس تبلیغ کا مرکز قولاً انجیل کا اعلان ہے اور یہی پروٹسٹنٹ کلیسا کی اصلی خصوصیت ہے۔

## پروٹسٹنٹ مذہب مزید اصلاح وترقی کا محتاج ہے

"ہمارے زمانے میں پروٹسٹنٹ عیسائیت میں جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ ان پر غور وخوض ضروری ہے کیونکہ یہ بات اہم ہے کہ پروٹسٹنٹ مذہب نہ تو ابھی تک مذہبی اکثریت حاصل کرسکا ہے اور نہ اس نے اپنے تاریخی منصب کا ملاً ادا کیا ہے ابھی وہ تکمیل کے راستے

میں ہے اس کا بہترین عہد پیچھے نہیں بلکہ آگے ہے چار صدیوں قبل
اصلاح کے دور میں جو کچھ پیش آیا اس کے پورے معنی کو زندگی عقیدہ
یا مذہبی تنظیم میں ظاہر ہونے کی ضرورت ہے۔ دیگر امور کو بھی واقع
ہونا چاہیئے جن کا خیال ''اصلاح'' کی تحریک میں داخل نہیں ہوا تھا''۔

## پروٹسٹنٹ مذہب میں چار تغیرات

اسی احساس کے مدِنظر پروٹسٹنٹ مذہب میں چار اہم تغیرات رو بہ عمل ہیں:۔

''حالیہ سالوں میں پروٹسٹنٹ مذہب میں چار بڑے تغیرات ہو رہے
ہیں جن کا عیسائیت کی تاریخ اور انسانی تہذیب کے مستقبل پر دور رس
اثر پڑے گا۔ ان کا ہم ذکر کریں گے اور ان میں سے ہر ایک پر غور
کریں گے''۔

پہلا عیسائیت کے تاریخی عقیدے کے معنی اور عقائد کی نئی تعبیر' دوسرا مقدس کیتھولک کلیسا کی اصلیت اور عیسائی فرقہ اور اقوام کے خاندان کیلئے اس کے مضمرات نے پروٹسٹنٹ تخیل کو متاثر کیا ہے۔ پیشتر دنیوی معاملات کے بارے میں ذمہ داری کے ایک نئے احساس نے' ایک نئے مجموعہ' عیسائیت کے زبردست جذبے کو پیدا کیا ہے۔ چوتھا ایک ایسی دینیات جس کا وجود عالمگیر عیسائیت کی توسیع اور تہذیب و ثقافت کے نئے مسائل کے باعث ضروری ہو گیا ہے جو پروٹسٹنٹ مفکرین کے اجتہاد کا نتیجہ ہے۔

ان رُجحانات کا نتیجہ یہ ہے افراد اور اقوام کی دنیوی زندگی کے مختلف شئون و مظاہر کے بارے میں مذہب کے وظیفہ اور اثر پر نئے سرے سے زور دیا جانے لگا ہے چنانچہ مقالہ نگار کا بیان ہے کہ:

''پروٹسٹنٹ مذہب کے رہنماؤں کا اعلان یہ ہے کہ معاشرہ کیلئے
اخلاقی اصولوں منضبط کرنا کافی نہیں اور نہ یہ کافی ہے کہ انجیل کی تلقین

کے ذریعہ افراد کو روحانی حیثیت سے زندہ کیا جائے۔ معاشرہ کے اصلی معنی کا معاشرتی زندگی کے نمائندہ دائروں میں تعین کیا جائے۔ ثقافتی دائرہ عمل میں اس امر کی نشان دہی کی جاتی ہے کہ موجودہ ثقافت کی کوئی جڑ اور بنیاد باقی نہیں رہی ہے ایک روشن تخیل کے ماسوا وہ زندگی کو کوئی معنی' ہدایت اور طاقت عطا کرنے سے عاری ہو گئی ہے۔ اس لئے موجودہ ثقافت کو عیسائی مذہب کی زبردست بصیرت عطا کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم میں دوبارہ خدائے برتر کے عمل و دخل کی ضرورت ہے' اور نوجوانوں کو دوبارہ احترام و عقیدت کی تعلیم ضروری ہے۔ سیاسیات کے دائرہ میں خصوصاً بین الاقوامی تعلقات کے دائرہ میں ممالک متحدہ امریکہ کے اس کمیشن نے فیصلہ کن اثر ڈالا ہے جس کا نام '' منصفانہ اور پائیدار امن کی بنیادوں کے مطالعہ کا کمیشن (The Comission of study the basis of a just and durable peace) ہے۔ اس کمیشن کی بنیاد (The federal Concil of the Churches of the Christ) نے رکھی ہے اور پروٹسٹنٹ مذہب کے ایک نمایاں مگر عام پیرو مسٹر جان فاسٹر ڈلس کی صدارت میں (جن کو آکسفورڈ کانفرنس میں کلیسا کے حقیقی معنی اور اس کے امکانات کا اندازہ ہوا تھا) یہ جماعت حالیہ سالوں میں امریکہ کے اندر عیسائی رائے عامہ نیز حکومت کی بین الاقوامی پالیسی کے بنانے میں کسی اور جماعت کے مقابلے میں زیادہ اثر انداز ہوئی ہے''۔

## ایک اہم سوال

لیکن یہاں یہ غور طلب اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ عیسائیت کے اس مستقبل

کو مذکورہ بالا تغیرات کے ذریعہ محفوظ بتایا جا سکے گا۔ جس کے بارے میں (Encyclopedia of Religions & Ethics) کا مقالہ نگار جلد سوم کے صفحہ ۵۱۵ پر یہ رائے ظاہر کرتا ہے:

''اگر عیسائی کلیسا کو نہ صرف اپنے آپ کو بچاتا ہے بلکہ (جیسا کہ اس کا مقصد ہے) دنیا کو یسوع مسیح کیلئے مفتوح کرنا ہے تو اس کے سامنے چار اصلی تکمیل طلب کام ہیں۔ اس کو بیرونی تبلیغی کوششوں کے موجودہ موقع کا احساس کرنا پڑے گا اس کو معاشرتی اصلاح کی فوری ضرورت کو تسلیم کرنا پڑے گا' اس کو مقدس ذمہ داری کو قبول کرنا پڑے گا کہ مختلف عیسائی کلیساؤں میں اتحاد تلاش کیا جائے اور اس کو زمانے کے تقاضے کے مطابق عیسائی عقیدے کو نئے سرے سے نئی دینیات کے مطابق ڈھالنے کا فرض انجام دینا پڑے گا''۔

اس کام کیلئے صورتِ حال کس حد تک اُمید افزا ہے' اس کے بارے میں مقالہ نگار کی حسب ذیل رائے بصیرت افروز ہے:۔

''آج ایک تاریخی منصب کی حیثیت سے عیسائیت کو عدم اعتماد' شک اور چیلنج کا سامنا ہے۔ حال اپنی کامیابیوں اور [illegible] سے اس طرح مطمئن ہے کہ وہ کسی ایسی تابعداری کے معاملہ میں غیر مطمئن ہے جو ماضی پر مبنی ہو چکا ہے وہ روحانی معاملات ہی سے متعلق کیوں نہ ہو آج عقیدے کو زمانے کے حالات کے مطابق ہونا چاہئے۔ اس خود استقائی کی تائید اس تنقید سے ہوتی ہے کہ انجیل اور مذہب کی اس پوری حقیقت کو زیر بحث و نظر لایا جائے۔ جو ایک غائب ہونے والی کمیت ہے کیونکہ یہ مذہب بحیثیت انسانی معاشرہ کی ترقی کے کسی ممکنہ قدر کے عنصر کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو چکا ہے۔ موجودہ

اخلاقی تصورات اور معاشرتی مقاصد اب دوسرے ماخذ میں تلاش کئے جا سکتے ہیں اور اس طرح انسان کو متوارث طور پر ایک ثقافت اور تہذیب ملی ہے جس کے بنانے میں عیسائیت کا کافی حصہ رہا ہے لیکن اب یہ انسان اپنے آپ کو عیسائیت سے آزاد محسوس کرتا ہے اور وہ اپنے آپ کو یہ باور کرا سکتا ہے کہ عیسائی کلیسا ماضی میں اور اب بھی انسان دوستی کی تحریک میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ اس صورت حال کی جڑیں نسبتاً زیادہ گہری ہیں۔ اگرچہ ان لوگوں کی اکثریت جو کلیسا سے علیحدہ رہتی ہے اور تاریخی مذہب کی حیثیت سے اپنے آپ کو عیسائیت کو ممنون نہیں پاتی۔ وہ بھی عیسائی مقصد زندگی کو قبول کرتی ہے درآنحالیکہ وہ ڈھٹائی سے اس کی منکر ہے۔ لادینیت، ایجابیت (Positiveism) اور اشتراکیت اور اخلاقی تحریکیں موجودہ معاشرہ کو رہنمائی عطا کر رہی ہیں۔ اور فرسودہ عیسائیت کے مقابلے میں بہتر ہونے کی دعویدار ہیں۔ نیٹشے جس کے متبعین پیدا ہوتے جا رہے ہیں کھلے بندوں تجویز پیش کرتا ہے کہ تمام اقدار کو بدل کر ان کو بے قدر بنانے کی ضرورت ہے اور ایک ایسے اخلاق کو پیش کرتا ہے جو ارادتاً مخالفِ عیسائیت ہے اس کا استدلال یہ ہے کہ عزت اور بہادری کے وہ دو آئیڈیل جن کو موجودہ معاشرہ تسلیم کرتا ہے وہ نہ تو یونانی ہیں اور نہ عیسائی ہیں بلکہ گوتھک ہیں۔ اور یہ شمالی اقوام کی مخصوص ورثہ اور تخلیق ہیں، وہ اس امر سے انکار کرتا ہے کہ یونانی یا عیسائی آئیڈیل تنہا یا دونوں مل کر حقیقی معنی میں کبھی ترقی پسند رہے ہیں۔ جرمنی میں معاشرتی جمہوریت نے ہیگل کے فلسفے میں اپنے لئے ایک عالمی نقطۂ نظر پایا جس نے مذہب کی جگہ لے لی ہے لیکن ہم

اس کو مذہب نہیں کہہ سکتے"۔

# عام اجتماعی حالت

حسب دستور اب ہم عیسائیوں کے قوی اور کمزور پہلوؤں کا جائزہ لیں گے۔

## الف۔ قوی پہلو

عیسائیوں کے اہم قوی پہلو حسب ذیل ہیں:۔

### (ا) عیسائی مذہب عملاً تبلیغی ہے

اگرچہ انجیل کے احکامات اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات وارشادات کی رو سے مسیحیت حقیقی معنوں میں ایک تبلیغی مذہب نہیں ہے کیونکہ اس کا تعلق صرف بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کی تلاش سے تھا لیکن اب اس پہلو پر زور دینے کا کوئی حاصل نہیں کیونکہ اس تعلیم کے برخلاف عیسائیت نے عملاً ایک تبلیغی مذہب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور اس کی تبلیغی مساعی میں دنیا کا کوئی ایک مذہب کیا تمام مذاہب مل کر بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ عیسائی ممالک کے منجملہ صرف ایک ملک ممالک متحدہ امریکہ کی مثال سے یہ بخوبی واضح ہوگا۔ اس ملک کے صرف ایک فرقے (یعنی رومن کیتھولک) کی تبلیغی مساعی کا حال یہ ہے:۔

"ممالک متحدہ کے کیتھولک ماوراء البحر مشنریوں کی تعداد کے جدید ترین اعداد ایک کتاب میں شائع کئے گئے ہیں، جس کو مشنریوں کی معتمدی نے واشنگٹن میں شائع کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو (5126) کیتھولک پادری ممالک متحدہ امریکہ سے باہر فعالانہ خدمت انجام دے رہے تھے۔ (صفحہ

(National Catholic Almanac 1957. ۴٦٧

اسی طرح افریقہ کے بارے میں گنیھر کی شہادت یہ ہے کہ اس براعظم میں کیتھولک مشنریوں کی جملہ تعداد (12700) ہے۔ اور امریکی پروٹسٹنٹ مبلغین کی یہ تعداد صحرا سے نیچے کے علاقوں میں ہے اور سالانہ خرچ اس سے زیادہ ہے جتنا معاشی امداد کے طور پر امریکہ پورے براعظم افریقہ کو دیتا ہے (صفحہ ۴۰۴ Inside Africa)

اب ممالک متحدہ امریکہ میں رومن کیتھولک فرقے کی تعلیمی مساعی کا حال دیکھئے جو اعداد ذیل سے نمایاں ہے۔

| | ابتدائی | ثانوی | اعلیٰ |
|---|---|---|---|
| مدارس | 9,568 | 2,383 | 254 |
| طلباء | 35,44,598 | 6,72,299 | 2,41,709 |

## (۲) عیسائی سیاسی طور پر محکوم نہیں

دنیا کے جس حصے میں بھی عیسائی اکثریت میں ہیں' وہ آزاد اور خود مختار ہیں اور کسی اور مذہب کے پیروؤں کے ماتحت نہیں بلکہ اُلٹا ان کا تسلط دوسری اقوام اور مذاہب کے پیروؤں پر ہے اس میں کسی براعظم کی قید نہیں' یہاں تک کہ ایشیا اور افریقہ میں بھی جہاں عیسائیت بہت کم اور عددی حیثیت سے کمزور ہے چار علاقوں میں وہ اکثریت یا مساوی تعداد میں ہیں (مثلاً اریٹریا' جہاں وہ اکثریت میں ہیں مثلاً فلپائن اور گوآ جہاں وہ کسی اور مذہب کے پیروؤں کے محکوم نہیں اور جہاں وہ برابر کی تعداد مثلاً (حبش و لبنان) میں ہیں وہاں بھی وہ دستوری حیثیت سے اقتدار میں یا تو مسلمانوں کے برابر شریک ہیں جیسے لبنان یا حاکم ہیں جیسے ارٹیریا و ایتھوپیا۔

# (ب) عیسائیوں کے کمزور پہلو

عیسائیوں کے کمزور پہلو حسب ذیل ہیں:۔

## (۱) استعمار کی تاریخ

گذشتہ تین صدیوں میں عیسائیوں نے بتدریج دنیا پر قبضہ کر لیا تھا مشرق کی قدیم اقوام جو زبردست تہذیبوں کے علمبردار تھیں اس طرح مغربی استعمار کی شکار بنائی گئیں جس کے باعث یورپی اقوام کیلئے یہ ممکن ہوا کہ ایک طرف ان سے معاشی استحصال کریں تو دوسری طرف اپنے نظریہ حیات اور ثقافت کی تبلیغ و اشاعت کر کے مقامی مذاہب اور تہذیبوں کی ہمت شکنی کریں۔ لیکن موجودہ صدی کے اوائل سے مشرق میں بیداری کی جو ایک نئی رو پیدا ہوئی س نے یورپی استعمار کو متزلزل کر دیا۔ اور وہ مشرقی اقوام کے بیشتر حصے کو حق حکومت خود اختیاری اور آزادی کے دینے پر مجبور ہوئیں۔ لیکن آخری نوبت پر عیسائی اقوام کے اقتدار سے دست کش ہونے کے متوقع نتائج پورے پورے ظاہر نہ ہو سکے' کیونکہ صدیوں کے استحصال و استبداد کے زخم مندمل نہ ہو سکے اور ان کے خلاف مشرق میں نفرت کی ایک عام فضا باقی رہی۔ جس کو مغربی اقوام کی مخالف طاقتیں ہوا دیتی اور قدیم لوٹ کھسوٹ کے نام پر نہ صرف اکساتی ہیں بلکہ بعض عالمی اقوام کی سرگرم تائید سے مشرقی اقوام کو ان کے خلاف صف آراء کر رہی ہیں جس کیلئے ایشیا اور ایشیا و افریقہ کے مشترکہ مفاد کی دہائی دی جاتی ہے' حالانکہ اس تحریک کے سب سے بڑے اور پُر جوش داعی ایشیائی اقوام کے متجانس ہونے یا مشترکہ مفاد کی یوں تردید کرتے ہیں:

"ایشیا کے ایک ہونے کے بارے میں بڑی باتیں کی جاتی ہیں۔
ایشیا ایک خاص معنی میں ایک جغرافی اکائی ہے اور دیگر متعدد

طریقوں سے بھی وہ ایک ایسی اکائی رہا ہے لیکن اصل میں تو وہ منفی معنی میں ایک اکائی رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عملاً پورا ایشیا استعمار کی سلطنت بن گیا تھا جہاں متعدد و مختلف اقوام یورپی استعمار کے خلاف آزادی کیلئے جدوجہد کر رہی تھیں' ان کی جدوجہد آزادی اور ایک قسم کے مقصد کی یگانگت کے باعث یہ ایک اکائی تھا لیکن اس کے پہلو بہ پہلو زبردست اختلاف بھی تھا' کیونکہ چینیوں اور مغربی ایشیا کے باشندوں میں مشترک باتیں بہت کم ہیں اور جو لوگ مغربی ایشیا میں رہتے ہیں وہ بالکلیہ مختلف ثقافتی' تاریخی اور دیگر پس منظر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اسی طرح آپ ایشیا کے دیگر خطوں کو علیحدہ کر سکتے ہیں''۔(۵۵)

جب ایشیا ثقافتی' تاریخی اور مذہبی حیثیت سے ایک نہیں تو پھر افریقہ سے مل کر کیسے ایک ہو سکتا ہے۔ اس ''منفی اتحاد'' کی خاطر وہ عیسائی اقوام کی استعمار پرستی اور نو آبادیاتی نظام کو یاد دلا کر ان کے خلاف نفرت اور انتقامی جذبہ کو دوامی بنا رہے ہیں۔ اس طرح مغرب کی قدیم استعماری تاریخ مشرق سے تعاون کے راستے میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ اس کو اگر عیسائیوں نے جلد محسوس نہ کیا اور مسلمانوں سے جو ثقافتی اور جغرافیائی طور پر ان سے زیادہ قریب ہیں پائیدار مفاہمت کی حقیقی کوشش نہ کی تو انہیں مستقبل میں دنیا کی آبادی کی دشمن اکثریت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

## (۲) عیسائی اقوام کا باہمی اختلاف

پچھلی صدیوں میں مشرقی اقوام آپس کے اختلافات کیلئے بدنام رہی ہیں' لیکن پچھلے عشرہ کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مرض اب مغربی اقوام میں بھی شدت سے پیدا

ہو گیا ہے جس کی حد یہ ہے کہ اب وہ دو متحارب کیمپوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اشتراکی اور جمہوری بلاکس اصلاً عیسائیوں کے بلاک ہیں' گو رفتہ رفتہ غیر عیسائی اقوام بھی ان میں شریک ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ صورتِ حال عیسائیوں کے نقطۂ نظر سے تشویش انگیز ہے۔ اس آویزش کا آخری نتیجہ عیسائی اقوام کی کمزوری پر منتج ہوگا۔ ان دونوں بلاکس کے اختلافات سے زیادہ خوفناک جمہوری ممالک میں بنیادی پالیسی کا وہ اختلاف ہے جو کوریا اور انڈو چائنا اور نہر سوئز سے لیکر تخفیف اسلحہ اور ایٹمی ہتھیاروں کے معاملات میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان اختلافات سے فائدہ اُٹھانے کیلئے بہت سی نئی قومیں تیاریاں کر رہی ہیں' اور اپنی پُرفریب چالوں سے برطانیہ وامریکہ' امریکہ وفرانس اور فرانس و برطانیہ کو اُلجھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

## (۳) اخوت ومساوات کا فقدان

عیسائیوں کی ایک بہت بڑی کمزوری عیسائیوں میں باہم اخوت و مساوات کا فقدان ہے' جب تک انہیں دنیا میں کامل غلبہ حاصل رہا یہ چیز نمایاں نہ ہو سکی اور نہ ان کے مفادات پر مخالفانہ اثر انداز' لیکن اب ان کے نظریہ حیات کی یہ کمزوری ان کے مستقبل کو تاریک بنا رہی ہے۔ چونکہ انجیل کی تعلیم کے مطابق عیسائیت بنی اسرائیل کے لئے آئی تھی' اس لئے عیسائیوں میں غیر شعوری طور پر نسلی احساس وغرور پایا جاتا ہے اس کا اثر یہ ہے کہ اپنی ترقی کے انتہائی دور میں بھی وہ کوئی ایک مرکزی سیاسی اقتدار نہ بنا سکی بلکہ اُلٹا نسلی اور جغرافی قومیت کے فروغ کا سامان کرتی رہی۔ صدیوں کے اس متوارث ذہن کا نتیجہ یہ ہے کہ جن رنگدار یا کالی اقوام کو عیسائی بنایا گیا' ان کو چاہے "آسمانی بادشاہت" میں جگہ مل گئی ہو لیکن دنیوی بادشاہت میں کوئی جگہ نہ مل سکی' ان کو حقارت اور کمتری کی نگاہ سے دیکھا گیا اور سفید فام عیسائیوں کے معاشرہ میں برابری کی جگہ نہ دی گئی۔ مثلاً حبش کی مثال لیجئے۔ وہ

ایک قدیم عیسائی مملکت تھی اور ہے لیکن یورپ کی سفید فام عیسائی قوم (اٹلی) نے اس پر بلا وجہ چڑھائی کر کے بیچارے غریب حبشیوں کا قتل عام کیا اور کئی سال تک غلام بنائے رکھا۔ اس ظلم و نا انصافی کے خلاف یورپ اور امریکہ کے عیسائی ضمیر کی سرزنش صرف ایک ہلکا احتجاج تھا اس کے برخلاف اس ملک کے ساتھ مسلمانوں کے طرز عمل کی کہانی ایک عیسائی کی زبانی سنیئے۔

(۱) ''لیکن عربوں کی فتوحات کے نتیجے میں ایتھوپیا کی عیسائی سلطنت بالکلیہ کٹ گئی اور یورپ نے اس کے وجود کو اس طرح بھلا دیا کہ صدیوں تک اس کا جغرفی محل وقوع معلوم نہ تھا۔ گبن لکھتا ہے'' چاروں طرف سے اپنے مذہب کے دشمنوں سے گھرا ہوا ایتھوپیا ایک ہزار سال تک سوتا پڑا رہا اور اس دنیا سے بے خبر ہو گیا جس دنیا نے اس کو فراموش کر دیا تھا''۔(67)

(۲) ''بہرحال فاتحانہ اسپرٹ کے عظیم الشان دور میں جبکہ ایک ملک کے بعد دوسرے ملک پر مسلمان چھا رہے تھے' حبش کے خلاف کوئی جہاد نہیں کیا گیا''۔

## (۴) نظریاتی کمزوری

عیسائیوں کی نظریاتی کمزوری اتنی عیاں اور نمایاں ہے کہ خود عیسائی مصنفین اور مفکرین بھی شدت سے اس کو محسوس کرتے ہیں۔

### (الف) دین و دنیا کی تفریق

مذہب یا سیاست کی علیحدگی یا مملکت اور کلیسا کے جدا گانہ دائرۂ اثر کے باعث گو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے دور میں عیسائیوں کو اپنی قومی مملکتوں کے قیام اور

استحکام میں مدد ملی جس سے طاقت حاصل کر کے انہوں نے عالمی تسلّط کے منصوبہ کو آگے بڑھایا لیکن اسی نے ان کے جسدِ اجتماعی میں جو جلن پیدا کی اور قومی مزاج میں فساد پیدا کیا اس کے نتائج آج وہ بھگت رہے ہیں۔ پروٹسٹنٹ اصلاح یافتہ مذہب کا لادینی نظریہ قدیم کلیسا کے استبداد و استحصال کا ردِعمل سہی لیکن اس نے نئی فتنہ سامانیوں کی داغ بیل ڈالی' اور نازیت' فاسطیت اور اشتراکیت جیسی انتہا پسند اور تخریبی طاقتوں کو جنم دیا۔ نازیت کے بارے میں اوپر Encyclopadia of Religions and Ethics کے مقالہ نگار کی رائے پڑھ چکے ہیں۔ فاسطیت اس کی توام بہن ہے اب اشتراکیت کے بارے میں آرنالڈ ٹائن بی کی شہادت سنیئے۔

''روسیوں نے مغرب کے لادینی معاشرتی فلسفہ کو لیا اور مارکسیت بنادیا۔ مارکسیت کو اگر آپ عیسائی بدعت کہیں تو بھی صحیح ہوگا وہ عیسائیت کی کتاب سے پھاڑ کر لیا ہوا ایک ورق ہے جس کو پوری انجیل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ روسیوں نے اس مغربی بدعتی مذہب کو لیا اور اس کو اپنے ایک نئے مذہب کے قالب میں ڈھالا اور اسی کو اب الثاہم پر تھوپ رہے ہیں۔ یہ مغرب کے خلاف جوابی حملے کی پہلی گولی ہے''۔ (Civilization on trail. صفحہ ۲۲۱)

## (ب) عیسائی عقیدہ کی پیچیدگی

عیسائیوں کے نظریہ حیات کی ایک بڑی کمزوری اس کی پیچیدگی اور ابہام ہے یہاں تک کہ عیسائیت کا مرکزی عقیدۂ تثلیث (Trinity) بھی اس سے مبرا نہیں۔ ایک خدا میں تین خدا اور تین خداؤں میں ایک خدا کا مابعد الطبیعاتی اور فلسفیانہ تصور معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی کے فہم و ادارک سے بالاتر ہے۔ یہی

عیسائیت

حال تمام دیگر عقائد اور اعمال کا ہے۔ پچھلے صفحات میں عیسائیت کے مختلف مذاہب کی تعلیم اور عقائد کا جو مستند خلاصہ پیش کیا گیا ہے' اس کے پڑھنے والے پر یہ حقیقت منکشف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی' یہی وہ اصلی دقت ہے جس نے یورپ کے عقلی دور میں پروٹسٹنٹ مصلحین کو عقائد اور اعمال مذہبی کے اس گورکھ دھندے کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا' اور اس نقطۂ نظر کو تقویت دی کہ انسانی زندگی کے معاشرتی اعمال اور اجتماعی دائرۂ اثر سے عیسائیت کو بے دخل کر دیا جائے۔ لیکن اس احتجاج کے اپنی جگہ پر واجبی ہونے کے باوجود اس کی بنیاد پر جو نیا مذہب (پروٹسٹنٹ) بنا وہ بھی یوں ''بنائے الفاسد علی الفاسد'' کا مصداق تھا کہ اس نے انسانی اعمال کے حقیقی سرچشمے (یعنی مذہب) کو بند کر دیا' بہر حال عیسائیت کے تمام مذاہب کم وبیش اپنی موجودہ شکل میں ایسے نہیں کہ وہ ایک اوسط ذہانت کیلئے قابل فہم ہو۔ چنانچہ ایک عیسائی اس کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے:

> ''اصلی شکایت جس کیلئے کسی طرح مقامی مشنری ذمہ دار نہیں قرار دیئے جا سکتے یہ ہے کہ عیسائیت کا عقیدہ افریقیوں کے لئے بے حد مبہم اور پیچیدہ ہے جس کو وہ آسانی سے اخذ نہیں کر سکتے۔ نیز تبدیل مذہب ان کو لڑکھڑا دیتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف وہ ان سے قبائلی عقائد چھڑا دیتا ہے۔ دوسری طرف اس کے معاوضہ میں کوئی ایسا عقیدہ نہیں دیتا جس کو وہ سمجھ سکیں''۔

(Inside Africa by Gunther صفحہ ۳۰۶)

عیسائی مذہب کے پُر جوش حامی اپنی کتابوں میں بار بار اور بڑے فخر یہ انداز میں اس امر پر زور دیتے ہیں کہ عیسائیت کے عقائد اور اعمال ترقی یافتہ ذہنیت اور

تربیت یافتہ دماغ کو اپیل کرتے ہیں اس لئے وہ افریقہ کے وحشی قبائل کیلئے اسلام کے مقابلے میں زیادہ نامانوس اور ناقابل قبول ہیں۔ لیکن وہ اس امر کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اس طرح وہ بالواسطہ اس امر کا اقرار کرتے ہیں کہ عیسائیت کے ان پیچیدہ عقائد واعمال میں انسان کے فطری مزاج کی تسکین کا کوئی سامان نہیں یہ مذہب کو فلسفہ کا مقام عطا کرنے کی ناکام کوشش ہے۔ لیکن یہ دعویٰ بھی کس حد تک صحیح ہے کہ عیسائیت تربیت شدہ ذہن اور ترقی یافتہ فکر کی نمائندگی کرتی ہے اس کے بارے میں خود ایک عیسائی عالم کا فتویٰ یہ ہے:

> ''ہمارے زمانے میں پروٹسٹنٹ مذہب نہ تو ابھی تک مذہبی اکثریت حاصل کر سکا ہے اور نہ اس نے اپنے تاریخی منصب کو کاملاً ادا کیا ہے ابھی وہ تکمیل کے راستے میں ہے اس کا بہترین عہد پیچھے نہیں بلکہ آگے ہے چار صدیوں قبل اصلاح کے دور میں جو کچھ پیش آیا اس کے پورے معنی کو زندگی' عقیدہ اور مذہبی تنظیم میں ظاہر ہونے کی ضرورت ہے دیگر اُمور کو بھی واقع ہونا چاہیئے جن کا خیال ''اصلاح'' کی تحریک میں داخل نہیں ہوا تھا''۔ (68)

اسی طرح (Encyclopedia of Religion & Ethics) کا مقالہ نگار لکھتا ہے:۔

> ''لادینیت' ایجابیت اور اشتراکیت اور اخلاقی تحریکیں موجودہ معاشرہ کا رہنمائی عطا کر رہی ہیں اور فرسودہ عیسائیت کے مقابلے میں بہتر ہونے کی دعویدار ہیں۔ (صفحہ ۵۹۴)

## (ج) عیسائیوں کے مذہبی اختلافات اور گروہ بندی

عیسائیوں کی ایک بڑی کمزوری ان کے مذہبی اختلافات ہیں' جن کی شدت اور باہمی قتل و غارت گری کے بے شمار واقعات تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ تبلیغ مذہب کے میدان میں بھی وہ باہم دست و گریبان ہوتے ہیں۔ چنانچہ افریقہ میں ان کی باہمی لڑائیوں کا حال یہ ہے کہ ۸۸-۱۸۹۱ء میں وہ مذہبی لڑائی ہوئی جس کا حوالہ ذیل میں ذکر کیا گیا ہے:

''افریقی عیسائیوں نے پروٹسٹنٹ گرجاؤں کو لوٹا اور آگ لگائی۔
پروٹسنٹوں نے افریقیوں کے کیتھولک گرجاؤں کو لوٹا اور آگ لگائی
لیکن بالآخر پروٹسٹنٹ جیتے اور موانگا قبائلی (کیتھولک عیسائی)
فرانسیسی کیتھولکوں کے ساتھ بھاگ کھڑے ہوئے''۔(69)

اساسی عقائد کی بنا پر وہ بے شمار مذہبی گروہوں میں منقسم ہیں۔ جن کے منجملہ تین بڑے معروف مذاہب کے بنیادی عقائد بھی باہم متضاد ہیں' ان کا کوئی ایک مرکز نہیں' سیاسی اور مذہبی مرکزی علیحدگی کے علاوہ مذہبی مرکز کے دائرہ میں بھی مشرقی تقلید پسند ماسکو کے اقتدار کے علاوہ کسی اور اقتدار کے منکر ہیں۔ رومن کیتھولک صرف پوپ کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں پروٹسٹنٹ ماسکو اور یورپ دونوں کی رہنمائی کو مسترد کرتے اور صرف انجیل کی رہنمائی پر تکیہ کرتے ہیں لیکن یہ بھی نامکمل اور ناقص طور پر کیونکہ حقیقی اقتدار تو وہ اپنی قومی مملکتوں کو عطا کرتے ہیں۔

یہ افراتفری اس قدر نمایاں ہے کہ عیسائیت کی موجودہ حالت کے مبصرین شدت سے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہیں کہ اس مرض کو دور کرنے اور ان مختلف عیسائی مذاہب کو ایک کرنے کی ضرورت ہے جس کے بغیر وہ اشتراکیت کے لادینی

فلسفہ کا کامیاب مقابلہ نہیں کر سکے جو عیسائیت کی اسی فطری کمزوری سے پیدا ہوا ہے۔

### (د) سیاسی نظریہ کا فقدان

عیسائیوں کی سب سے بڑی اور فطری کمزوری یہ ہے کہ عیسائیت انہیں کوئی مضبوط اور جامع معاشرتی فلسفہ نہیں عطا کرتی۔ نعمان (Nauman) اپنی کتاب (Brife uber Religion) میں لکھتا ہے:

> ''ابتدائی عیسائیت مملکت' قانون' تنظیم اور پیداوار کے تحفظ کو کوئی اہمیت نہیں دیتی' وہ انسانی معاشرہ کے حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی''۔ پھر نعمان نتیجہ اخذ کرتا ہے اس لئے یا تو ہمیں بغیر مملکت کے مقصود کے گزارنا چاہیئے یا پھر ارادتاً اپنے آپ کو نراجی قوتوں کے حوالہ کرنا چاہیئے۔ یا اگر ہم اپنے مذہبی عقیدہ کے ساتھ ساتھ مملکت کو بھی چاہتے ہیں تو پھر ایک جداگانہ سیاسی عقیدہ بھی اختیار کرنا چاہیئے''۔

ایک الہامی مذہب کی حیثیت سے یہ امر گو نا قابل قیاس ہے لیکن عیسائیت کے آغاز کے بعد کی دو صدیوں میں عیسائیت کے اندر ہمسایہ تہذیبوں اور بت پرست مذاہب خصوصاً ہیلن ازم (Hellanism) کے جو تصورات در آئے اس کے اثر کے تحت صرف آسمانی بادشاہت کے تنگ مفہوم پر زور دیا گیا اور دنیوی بادشاہت کو جابر حکمرانوں (قیصروں) کے حوالے کر دیا گیا۔ اس دو عملی کے نتائج دور اصلاح میں پروٹسٹنٹ مذہب کے فروغ کی صورت میں نمودار ہوئے۔ جس نے عیسائی کلیسا کے رہے سہے اقتدار کو ختم کر دیا عیسائیوں کی مذہبی اساس سے یہاں بحث نہیں اس کی اجتماعی اساس بنی اسرائیل کی قیادت کے تخیل پر مبنی تھی۔ قرون وسطیٰ میں پروٹسٹنٹ

مذاہب کا عروج جن مغربی ممالک میں ہوا وہ انگلستان' فرانس اور جرمنی ہیں' اور یہ آریائی نسل کے پڑاؤ سمجھے جاتے ہیں اور یہ بات مسلم ہے کہ آریائی نسل سب سے زیادہ جدائی پسند اور خود پرست ہے؟ اس لئے یہ قیاس دوراز کار نہیں ہوسکتا کہ ان کا قومی مزاج اور متوارث ذہن' عیسائیت کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوا اور یہ بغاوت سب سے پہلے جرمنی میں ظاہر ہوئی' جو آریائی نسل کا بڑا اڈا ہے۔ اور تین صدی بعد جرمنی ہی میں موجودہ اشتراکیت کے علمبردار پیدا ہوئے جن کا سیاسی اور معاشری نظریہ زندہ طاقت کی حیثیت سے روس میں برسرکار آیا ہے جس کے متعلق یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ وہ صدیوں سے تقلید پسند عیسائیت کا مرکز رہا ہے۔ کیا عیسائیت کی یہی تقلید وجمود پسندی روس کی اشتراکیت کیلئے ذمہ دار نہیں ہے؟

اشتراکیت کا یہ بھونچال عیسائیت کے نامکمل اور تشنہ نظریہ حیات کا فطری ردِ عمل ہے اس ردِعمل کے ممکنہ اثرات کا پیمانہ صرف اشتراکی روس کی سیاسی طاقت نہیں ہے۔ یہ تو آغاز ہے۔ اور ٹائن بی کے الفاظ میں ''پہلی گولی'' ہے۔ عیسائیت کو بحیثیت ایک اجتماعی طاقت کے کامل شکست کا سامنا ہے۔ مذہب کو نجی زندگی میں بند اور محدود رکھنے کی کوشش کی ناکامی مقدر ہے۔ جبکہ زندگی موجودہ عہد میں اس طرح اپنے آپ کو محدود اور پابند سمجھنے کیلئے آمادہ نہیں اور بدقسمتی سے عیسائیت اس پر مصر اور حیات انسانی کے سرگرم اور کارفرما پہلو سیاست کو شجر ممنوعہ قرار دے چکی ہے۔

### (ھ) عیسائیت اشتراکیت کا مقابلہ نہیں کرسکتی

عیسائیت اشتراکیت کا کامیاب مقابلہ کرنے میں ناکام ہوچکی ہے۔ عیسائیوں کی آبادی کا ایک تہائی حصہ یعنی تقریباً چھبیس کروڑ کی تعداد اب روس میں اور مشرقی یورپ کے حاشیہ بردار ممالک میں اشتراکیت کے جھنڈے کے نیچے ہے

عیسائیت

بقیہ دو تہائی عیسائی آبادی کا بھی ایک قابل لحاظ حصہ اشتراکیت کے زیر اثر ہے۔
نصف صدی سے بھی کم مدت میں عیسائیت کا یہ نقصان اس کے وجود کیلئے اتنا غیر معمولی خطرہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

## (و) تبلیغی مساعی کی ناکامی

اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود کہ عیسائی عددی حیثیت سے آج دنیا کے دیگر مذاہب کے پیروؤں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ حقائق اس امر کو ثابت کرتے ہیں کہ عیسائیت اپنی تبلیغی مساعی میں ناکام ہو چکی ہے چنانچہ عیسائیوں کی موجودہ آبادی یورپ اور نئی دنیا (شمالی وجنوبی امریکہ واوشیانا) میں مرکوز ہے اور ان علاقوں کے باہر ناقابل لحاظ۔ گذشتہ تین صدیوں میں عیسائیت کو جو بے مثال اقتدار نصیب ہوا اور اس کے سائے میں انہوں نے عیسائیت کے فروغ اور اشاعت کے لئے جو جان توڑ کوششیں کیں' ان کو دیکھتے ہوئے یہ بات حیرت انگیز ہے۔

نئی دنیا میں انہیں دنیا کے موجودہ ترقی یافتہ مذاہب میں سے کسی سے مقابلہ نہ کرنا پڑا۔ مقابل میں صرف وحشی اقوام اور قدیم قبائل کا ابتدائی مذہب بت پرستی (Paganism) تھا۔ جو خرافات اور اوہام باطلہ کا ایک پلندہ تھا۔ عیسائیت کے برتر عقیدہ' اس کی برتر ثقافت اور زیادہ تر سیاسی اقتدار کے باعث اس کا مقامی بت پرستی پر غالب آ جانا قدرتی تھا لیکن اس میں بھی صرف افہام وتفہیم کا دخل نہیں چنانچہ ٹائن بی اپنی کتاب (An Historians Approach to Religion, Geofferey Cumber(Lege) Oxford University Press 1956. Page-163 پر سترھویں صدی عیسوی کے دو مغربی مبصروں کے خطوط شائع کرتا ہے ان میں سے ایک کا

ترجمہ درج ذیل ہے جس سے اس تبلیغ کی نوعیت معلوم ہو سکے گی۔

''عیسائیوں کی ایک ناقابل لحاظ اور کمزور تعداد (جو چیز سے محروم ہے) بت پرستوں کے علاقوں میں پہنچتی ہے۔ یہ نووارد غیر ملکی انسانیت کے نام پر مقامی باشندوں سے التجا کرتے ہیں کہ وہ ان کو ضروریاتِ زندگی مہیا کریں' یہ ضروریات انہیں مہیا کی جاتی ہیں ان کو رہائش کیلئے جگہ بھی دی جاتی ہے وہ سب مل کر ایک قوم کی طرح بسر کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح عیسائی مذہب اس ملک میں جڑ پکڑتا اور شائع ہوتا ہے۔ لیکن وہ فوری طور پر سب سے زیادہ قوی نہیں ہو جاتا۔ حالات کی جب یہ نوعیت ہوتی ہے کہ تو امن' دوستی' عقیدہ اور انصاف میں مساوات ان میں باقی رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ مجسٹریٹ (حاکم عدالت) عیسائی ہو جائے۔ جب مجسٹریٹ عیسائی ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی پارٹی (عیسائی) سب سے زیادہ طاقتور ہو گئی۔ پھر کیا ہے محبت کے تمام رشتے آناً فاناً ٹوٹ جاتے ہیں تمام تمدنی حقوق کی خلاف ورزی ہونے لگتی ہے بت پرستی کا قلع قمع شروع ہو جاتا ہے اور جب تک یہ بے گناہ بت پرست جو صداقت اور قانون قدرت پر سختی سے عامل ہوتے ہیں اور معاشرہ کے قوانین و آداب کی کسی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوتے۔ جب تک (میں کہتا ہوں کہ) اپنے قدیم مذہب کو ترک نہ کر دیں اور ایک نئے اور اجنبی مذہب کو قبول نہ کریں' ان کو اپنی املاک' ارضیات اور اپنے آباؤ اجداد کی جائیداد سے بے دخل کر دیا جائے گا بلکہ جان

سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا اس طرح آسمانی مذہب کی آڑ اور روح کی نجات کے پردے میں دراصل حرص و غارت گری کا ایک لبادہ ہوتا ہے''۔

اسی طرح ایک دوسرا مصنف لکھتا ہے:

''تمام عیسائی مبلغوں میں سب سے زیادہ مشہور مشنری دنیا کا سب سے بڑا دریافت کنندہ (Explorar) بھی تھا یہ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ ڈیوڈ لینگ اسٹون تھا' وہ ایک حیرتناک عزم اور قوتِ برداشت رکھنے والی شخصیت کا مالک تھا۔ اس سے زیادہ پُرجوش اور سچا عیسائی کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس عام اعتقاد کے برخلاف کہ اس کے ہاتھ میں انجیل اور دوسرے میں بندوق ہوتی تھی دراصل وہ جبری طور پر عیسائی بنانے میں دلچسپی نہ رکھتا تھا''۔(70)

اسی طرح نئی دنیا اور یورپ میں جہاں عیسائیت کو بت پرستی کا مقابلہ تھا۔ عیسائیت نے کامیابی حاصل کی' لیکن مشرق میں جہاں منظّم مذاہب (اسلام' بدھ مت' ہندو مذہب' کنفیوشی مت اور شنٹو مذہب وغیرہ) کا مقابلہ تھا' وہاں باوجود اپنے مکمل سیاسی اقتدار اور بے مثال تبلیغی مساعی کے انہیں بہت کامیابی حاصل ہوئی۔

# اسلام اور عیسائیت

## عیسائیت کے بارے میں اسلام کی تعلیمات اور عیسائیوں سے مسلمانوں کا سلوک

عیسائیت کے بار میں اسلام کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کیلئے یہ ضروری ہو گا کہ ہم اسلام کی اصل حقیقت کو پیش نظر رکھیں۔

## حقیقت اسلام

اسلام کا مرکزی اور بنیادی عقیدہ توحید ہے جس کے متعلق قرآن کا نظریہ ہے کہ وہ ایک پرانی یعنی ازلی اور ابدی حقیقت ہے جو تمام انبیاء سابق کی تعلیمات کی روح تھی اسی لئے کلام اللہ کی شہادت یہ ہے۔

(۱) وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملة ابیکم ابراہیم وھو سماکم المسلمین (پارہ ۱۷ آیت ۷۸)

(ترجمہ) تمہارے لئے دین میں کوئی حرج (تنگی) نہیں جو تمہارے باپ ابراہیم کا دین (ملت) ہے اور اسی نے تم کو مسلمان کہہ کر پکارا ہے۔

(۲) قل اننی ھدانی ربی الی صراط المستقیم دیناً قیماً ملة ابرہیم حنیفاً وما کان من المشرکین (سورۂ انعام پارہ ۸ آیت ۱۶۱)

(ترجمہ) کہہ دیجئے کہ میرے خدا نے میری ہدایت صراط مستقیم کی طرف کی ہے جو دین قیم ہے جو ملت دین ابراہیم ہے اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔

(۳) ومن یرغب عن ملة ابراہیم الا من سفه نفسه۔ (سورۂ بقر پارہ الم آیت ۱۳۰)

(ترجمہ) جو شخص ملّت (دین) ابراہیم سے روگردانی کرے وہ اپنی ذات کو ہلکا بناتا ہے۔

توحید کا مرکزی تصور اسلام کی اساس ہے اور یہی اساس اس کو کفار اور مشرکین سے جدا کرتی ہے۔ اسی لئے جو ادیان سابقہ عقیدۂ توحید پر مبنی تھے جیسا کہ عیسائیت اور موسویت کا حال ہے۔ باوجود تحریف عقیدۂ توحید کے ان میں اسلام سے ایک حد تک مماثلت تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مذاہبِ عالم کے جاننے والے علماء جب

---

عیسائیت

مذاہب کی وصولی تقسیم کرتے ہیں تو وہ اسلام عیسائیت اور موسویت کو توحیدی مذہب میں داخل کرتے ہیں یہاں تک کہ عیسائی پادری بھی یہی کہتے ہیں چنانچہ بیتھ من (Bthman) اپنی کتاب برج ٹو اسلام (BRIDGE TO ISLAM) کے صفحہ ۴۷ پر لکھتے ہیں۔

> ''خدا کے سوا کوئی الہٰ (معبود) نہیں اسلام' عیسائیت اور یہودیت کی طرح ایک خالص توحیدی مذہب ہے' یہ تینوں مذاہب ایک خدا کو تسلیم کرتے ہیں' لیکن ہر ایک میں خدا کی ایک مختلف صفت پر زور دیا گیا ہے''۔

یہ صحیح ہے کہ مرورِ زمانہ کے باعث عیسویت اور موسویت میں توحیدِ خالص باقی نہیں رہی تھی اور ان مذاہب آسمانی کی تعلیم مسخ کر دی گئی تھی' لیکن اس کے باوجود ان دونوں سابقہ ابراہیمی اور سامی مذاہب کی اصل وہی ہے جو اسلام کی ہے۔ اسی اصل سے دراصل عیسائیوں سے متعلق اسلام کے طرزِ عمل کا تعین ہوتا ہے۔

## اہلِ کتاب اور مشرکین میں امتیاز

چنانچہ اسی عقیدۂ توحید کی بنیاد پر مذاہب عالم کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے طرزِ عمل اور برتاؤ کی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔ جہاں قرآن کے احکام اور احادیث کی تصریحات کے تحت غیر مسلموں کے ساتھ اسلام میں بنیادی تعلیمات کے بارے میں کسی قسم کی مفاہمت کو روا نہیں رکھا گیا ہے وہاں عیسوی اور موسوی مذہب کے پیروؤں (اہلِ کتاب) کے ساتھ طرزِ عمل میں ایک نمایاں امتیاز رکھا گیا ہے۔ اس خصوصی برتاؤ کی چار خصوصیات ہیں۔

### (۱) دعوت اتحاد نظریاتی

اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اہل کتاب کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ توحید اور الوہیت کی بناء پر جو انسانی فطرت کی آواز ہے آپس میں متحد ہو جائیں چنانچہ قرآن کے الفاظ میں انہیں یہ پیغام دیا گیا ہے:

تعالو الیٰ کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ۔

(ترجمہ) اے محمد ﷺ کہہ دیجئے کہ ایک ایسے کلمہ پر متفق ہو جائیں جو تمہارے اور ہمارے درمیان مشترک ہے کہ ہم سوائے اللہ کے کسی اور کی پرستش اور عبادت نہیں کریں گے۔

یہاں یہ چیز یاد دلانا ضروری ہے کہ یہی وہ پیغام ہے جو حضور سرداردو عالم ﷺ نے نجران کے ان عیسائیوں کو مخاطب کر کے مدینہ میں دہرایا تھا جو آپ کے مہمان کی حیثیت سے نہایت عزت و احترام کے ساتھ مسجد نبوی میں اتارے گئے تھے' نیز اسی پیغام کو آپ نے ان مختلف خطوط میں دہرایا ہے جو متعدد عیسائی حکمرانوں مثلاً ہرقل کو بھیجے گئے تھے۔

### (۲) اہل کتاب کا ذبیحہ کا جواز

انسان کی بنیادی ضروریات میں غذا کی اہمیت ظاہر ہے کہ اسی پر بقائے ذات کا انحصار ہے۔ اسلامی آئیڈیالوجی میں حلال غذا کا بہت اہم مقام ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق جائز اور ٹھیک طور پر تیار ہو' ان شرائط کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ صرف اسی غذا کو استعمال کر سکتے ہیں جو اسلامی احکامات کے مطابق تیار ہوئی ہوں' لیکن اہل کتاب کی تیار کی ہوئی غذا اور ان کے ذبیحہ کے متعلق یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے بہ نسبت دیگر غیر مسلموں کے جائز ہوگی۔

چنانچہ اس بارے میں قرآن پاک کا حکم یہ ہے:

قال اللہ تعالی۔ الیوم احل لکم الطیبات و طعام الذین اوتوا لاکتاب حل لکم و طعامکم حل لھم۔

(ترجمہ) فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔ آج حلال کی گئیں تمہارے لئے سب چیزیں اور کھانا ان لوگوں کا جن کو کتاب دی گئی ہے، حلال تمہارے لئے اور کھانا تمھارا حلال ہے ان کیلئے۔

اسی طرح حدیث میں جو مسلمانوں کی شریعت (قانون) کا دوسرا بڑا ماخذ ہے یہ حکم موجود ہے۔

وفی الترمذی۔ مألت النبی ﷺ عن طعام النصاری فقال لا یتخلجن فی صدرك طعام ضارعت فیه النصرانیه قال الترمذی والعمل علےٰ هذا عند اهل العلمؒ من الرخصة فی طعام اهل الکتاب۔

اور ترمذی میں روایت ہے کہ پوچھا میں نے نبی اکرم ﷺ سے حکم طعام نصاریٰ کا' تو فرمایا نہ خلجان میں تیرے سینہ میں (یعنی دل میں) کوئی کھانا' کیا مشابہ ہوگیا تو نصرانی لوگوں کے ساتھ و کہا ہے ترمذی نے کہ عمل ہے اسی حدیث پر سب اہل علم کا نزدیک رخصت اور اجازت کا کھانے میں اہل کتاب کے۔

کتاب وسنت کے ان ہی احکام کی بناء پر مسلمانوں کی شریعت کا حکم یہی ہے کہ اہل کتاب کا کھانا اور ذبیحہ مسلمانوں کیلئے جائز ہے۔ یہ بات اسلامی شریعت (فقہ) کی ہر ایک کتاب میں موجود ہے یہاں ہم صرف ایک حوالہ کافی سمجھتے ہیں۔

وفی العالمگیری لا باس لطعام لایهود والنصاری کله من الذبائخ وغیرها۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے نہیں کچھ مضائقہ یہود ونصاری کے سب قسم کے کھانے میں ذبیحہ اور اس کے سوا۔

(تفصیل کیلئے دیکھے کتاب ''احکام اہل کتاب مولفہ سرسید احمد خان مطبع مصطفائی لاہور)

## اہل کتاب کے ساتھ ازدواج کی اجازت

انسان کی بنیادی احتیاج کے بعد جو بقائے ذات اور زندگی کے لئے ضروری ہے' انسان کی تیسری اہم ضرورت بقائے نسل اور نظم معاشرت ہے جس کی بنیاد دعائلی زندگی پر ہے اس لئے اسلام نے اس امر کا خاص اہتمام کیا کہ ایسا ماحول نہ پیدا ہو جو اسلامی آئیڈیالوجی کے تحفظ و ترقی کیلئے ناسازگار نہ ہو' نیز اولاد کے ذریعہ جو خاندان اور معاشرہ بنے وہ اسلامی ہو اس مقصد کیلئے یہ ضروری تھا کہ غیر مسلموں سے نکاح اور ازدواجی تعلقات کو ممنوع قرار دیا جائے' چنانچہ قرآن مجید نے حسب ذیل حکم (آیت) کے ذریعے اس کا کافی اور موثر بندوبست کیا۔

ولا تنكحوا المشركات حتى يؤمن ولامة مومنة خير من مشركة ولو اعجبتكم ولا تنكحوا المشركين حتى يؤمنوا ولعبد مومن خير من مشرك ولو اعجبكم۔

تم مشرک عورتوں سے شادی نہ کرو یہاں تک وہ مسلمان ہو جائیں۔ مسلمان لونڈیاں مشرک عورتوں سے بہتر ہیں چاہے وہ مشرک تمہیں پیاری معلوم ہوں' اور نہ مشرکوں سے نکاح کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں کیونکہ مسلمان غلام مشرک سے بہتر ہے چاہے وہ تمہیں بہتر لگے۔

لیکن اس حکم سے اہل کتاب کو مستثنیٰ کیا گیا چنانچہ قرآنی حکم ہے:

والمحصنت من المومنات والمحصنت من الذين اوتوا الكتب من قبلكم اذا آتيتموهن اجورهن محصنين غير مصافحين والا متخذى الاخدان (مائدہ پارہ ششم رکوع ۱۶)

مومن عورتوں سے محصنات اور سابقہ اہل کتاب سے نکاح کر سکتے ہو جبکہ مہر موعودہ ادا

کردو در آنحالیکہ تم پاکدامنی اور بدکاری سے بچنا چاہتے ہو۔اور چوری چھپے آشنائی ہے۔

پیغمبر اسلام کی تصریحات اور احادیث یہ ہیں۔

عن جابر بن عبداللّٰہ قال' قال رسول اللّٰہ ﷺ نتزوج نساء اھل الکتب ولا یتزوجون نساء نا۔ (درالمنثور جلد دوم صفحہ ۲۶۱)

جابر بن عبداللہ سے روایت فرمایا کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ہم اہل کتاب کی عورتوں سے شادی کریں۔لیکن اہل کتاب ہماری عورتوں سے نہ کریں۔

عن عمرؓ بن الخطاب قال المسلم یتزوج النصرانیۃ ولا یتزوج النصرانی المسلمۃ (ایضاً)

حضرت عمرؓ بن الخطاب سے روایت ہے فرمایا کہ مسلمان نصرانی عورت سے شادی کرے لیکن عیسائی مسلمان عورت سے شادی نہ کرے۔

چنانچہ ابن کثیر آیت مذکورہ کی تائید میں کہتے ہیں۔

قد تزوج جماعتہ من الصحابتہ من نساء النصار نیے ولم یربہ ناساً

صحابہ کی ایک جماعت نے عیسائی عورتوں سے شادی کی اور اس میں کوئی حرج نہیں دیکھا۔

قرآن اور حدیث کے ان احکام کی بناء پر اسلامی شریعت کی ہر ایک چھوٹی بڑی کتاب کی رُو سے نہ صرف اہل کتاب عورتوں سے بلا تبدیل مذہب نکاح کر سکتے ہیں بلکہ ان کو نکاح کے بعد بھی اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔

چنانچہ ہم ذیل میں دو حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) فتاویٰ عالمگیری جلد ثانی مطبوعہ نول کشور پریس صفحہ ۱ میں لکھا ہے:

ویجوز للمسلم نکاح الکتا بیتہ الحربیۃ والذمیۃ حوۃ

كانت أمة كذافي محيطا الرخسي۔

مسلمان کیلئے اہل کتاب عورت سے چاہے وہ حربی ہو یا ذمی چاہے آزاد ہو یا لونڈی نکاح جائز ہے۔ (یہ سرخسی میں لکھا ہے)

(۲) جسٹس امیر علی اپنی کتاب ''اصول شرع محمدی'' مطبوعہ جامعہ عثمانیہ ۱۹۲۳ء کے صفحہ ۸۹ پر لکھتے ہیں:

> ''سنت جماعت کے فرقوں میں مسلمان مرد کا کسی دین الہامی کی عورت سے یعنی کتابیہ سے جیسے یہودی اور عیسائی ہیں نکاح کرنا شرعاً جائز ہے''۔

## (۲) اہل کتاب کی معاشی امداد و کفالت

تمدن اور سیاسی حقوق کی اصلی کسوٹی وہ معاشرتی انصاف ہے جو مملکت کے مالی وسائل کے ذریعہ عطا ہوتا ہے یعنی معاشرہ کے محتاج اور غریب طبقات کو بنیادی ضروریات مہیا کی جاتی ہیں۔ اسلامی نظام زندگی میں محصول زکوٰۃ اس کا ضامن ہے جس کی ادائیگی کی قانونی ذمہ داری تو صرف مسلمانوں پر لازمی طور پر عائد ہوتی ہے لیکن اہل کتاب کو بھی اس زکوٰۃ سے استفادہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے بیت المال کے عامل کو لکھ بھیجا۔ ''خدا کے اس قوم میں کہ انما الصدقات للفقراء والمساکین الخ (صدقات زکوٰۃ فقرا و مساکین کے لئے ہیں) فقراء سے مسلمان اور مساکین سے اہل کتاب مراد ہیں۔ (الفاروق حصہ دوم صفحہ ۳۸۳ طبع ثانی۔ والعدالتہ الاجتمالمحیہ مصنفہ سید قلب مصری صفحہ نمبر ۱۷۶)

اہل کتاب کے ساتھ خصوصی برتاؤ کی ان چار خصوصیات کے اس پہلو پر زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے کہ ان کا کسی فرد یا معاشرہ کی زندگی میں کتنا اہم مقام

ہے' لیکن اس امر کو دہرانا مفید ہوگا کہ دنیا کے دیگر مذاہب کے پیروؤں کے مقابلے میں اہل کتاب سے ایک قسم کی یگانگت اور خصوصی امتیاز روا رکھا گیا ہے' جس کی حد یہ ہے کہ ان دونوں مذاہب (یعنی عیسائیت اور موسویت) کی الہامی کتابوں اور ان دونوں کے رسولوں پر ایمان لانا بھی مسلمانوں کیلئے ایسا ہی لازمی قرار دیا گیا ہے جس طرح قرآن پاک اور خاتم النبین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر' یہی وجہ ہے کہ آپؐ اہل کتاب سے مشابہت کا ذکر فرماتے ہیں:

اسی طرح ابن عباس فرماتے ہیں:

انتم اشبه الامم بنی اسرائیل سمتاً و دهدیاً

اے مسلمانو! تم بنی اسرائیل سے بہت مشابہ ہو خصلتوں میں اور عادتوں میں۔

## اہل کتاب کے منجملہ عیسائیوں سے ترجیحی سلوک

جہاں تک عیسائیوں کا تعلق ہے ان کے ساتھ تو اور زیادہ ترجیحی برتاؤ کیا گیا ہے۔ چنانچہ نجاشی کے نام آنحضرت ﷺ اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

واشهدان عیسی مریم روح الله وکلمته القاما الی مریم البتول الطیبة المحصنة فحملت بعیسی نخلقه الله من روحه ونفخه کما خلق آدم بیده۔

اور گواہی دیتا ہوں کی عیسیٰ ابن مریم خدا کی روح اور کلمہ ہیں' خدا نے ان کو مریم بتول پاک پر ڈالا جس سے وہ حاملہ ہوئیں تو خدا نے حضرت عیسیٰ کو اپنی روح اور نفخ سے پیدا کیا جس طرح آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا۔(71)

اس طرح نہ صرف حضور اکرم ﷺ نے حضرت عیسیٰ کی رسالت اور صداقت کی توثیق فرمائی بلکہ آپکی والدۂ محترمہ حضرت مریم کی پاکدامنی کا اعلان فرما کر

عیسائیت کی تائید میں زبردست اور کامیاب وکالت فرمائی۔

عیسائیوں کے ساتھ اسلام کی یہ خصوصی ہمدردی بلا وجہ نہیں تھی کہ اس مودت کا جواب تھا جس کا اشارہ حسبِ ذیل آیت میں کیا گیا ہے اور جس کی تصدیق حبش کے عیسائی بادشاہ کے طرزِ عمل سے ہوتی ہے۔

ولتجدن اشدالناس عداوۃالذین امنوا الیھود والذین شرکو ولتجدن اقربھم مودۃ للذین امنواالذین قالوا انا نصری ذلک بان منھم قسیسین ورھبانا والنھم لا یستکبرون۔ سورۃ المائدہ پ ٦ ع ١١ آیت ٨٢

اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تم ایمان والوں کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہودیوں اور مشرکوں کو پاؤ گے اور ایمان والوں کی دوستی میں سب سے زیادہ قریب ان لوگوں کو پاؤ گے جو خود کو انصاری کہتے ہیں اس لئے کہ ان میں پادری اور رہبان ہیں (یعنی عالم اور تارک الدنیا فقیر دونوں طبقے جو زہد و عبادت میں مشغول رہتے ہیں اور ان میں گھمنڈ نہیں ہے۔

اس آیت قرآنی میں بیان کی ہوئی مودت کا یہ اثر تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اپنی زندگی میں عیسائیوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا اور ان کو غیر معمولی مراعات دیں۔ چنانچہ ان سے جو معاہدہ کیا گیا اس کی شرائط اس کی گواہی ہیں۔

لنجران جواراللہ وذمۃ محمد النبی علی انفسھم وملتھم وارضھم واموالھم وغائبھم وشاھدھم وعشیرتھم و تبعھم ولا یغیر لما کانوا علیہ ولا یغیر حق من حقوقھم ولا یغیر کلماتحت ایدیھم من قلیل او کثیر۔(72)

اہل نجران کو خدا کی حفاظت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری حاصل ہوگئی ان کی جان اور مذہب اور ملک اور اموال کے متعلق تمام موجودہ اشخاص اور غیر موجودہ عیسائی قوم اور ان کے پیرو اس ذمہ داری میں شامل ہوں گے ان کی موجودہ حالت تبدیل نہیں کی جائے گی۔ ان کے حقوق

میں سے کوئی حق بدلا نہیں جائے گا اور جو کچھ تھوڑا بہت ان کے قبضے میں ہے اس میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا۔

اسی قسم کی مراعات عرب کے دیگر عیسائیوں کو دی گئی تھیں جن کی شہادت آرنالڈ دیتے ہیں۔

''خود رسول اللہ ﷺ نے چند مسیحی قبائل سے عہد نامے گئے تھے جن میں آپ نے عیسائیوں کی حفاظت کا اور پابندی مذہب میں ان کے آزاد رہنے کا ذمہ اور ان کے قسوس کے دیرینہ حقوق و اختیارات کے بحال رہنے کا وعدہ فرمایا تھا۔(73)

## خلفائے راشدین کا طرزِ عمل

رسول اللہ ﷺ کے اس طرزِ عمل کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ خلفائے راشدین نے بھی ہمیشہ عیسائیوں کے ساتھ خصوصی اور امتیازی سلوک روا رکھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے عیسائیوں کے مقدس مقام (قبلہ) کا اس قدر احترام کیا کہ اس کی فتح کے موقع پر بہ نفس نفیس بیت المقدس تشریف لے گئے۔ اور عیسائیوں کو حسب ذیل مراعات عطا فرمائیں' جن کو خود آپ نے لکھا:

''یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المومنین عمرؓ نے ایلا کے لوگوں کو دی یہ امان ان کی جان مال' گرجا' صلیب' تندرست' بیمار اور ان کے تمام مذاہب والوں کے لئے ہے۔ اس طرح یہ کہ ان کے گرجاؤں میں نہ سکونت کی جائے گی نہ وہ ڈھائے جائیں گے' نہ ان کو نہ ان کے احاطے کو کچھ نقصان پہنچایا جائے گا' نہ ان کے صلیبوں کو نہ ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا' نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا''۔(74)

اس فیاضانہ سلوک کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ بطریق نے حضرت عمرؓ کو اپنے مقدس گرجے میں نماز پڑھنے کی اجازت دی۔(75)

اس کے متعلق ایک عیسائی مصنف کا بیان سنیئے:

''یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب بطریق نے حضرت عمرؓ سے مقدس عیسائی گرجا میں نماز پڑھنے کی دعوت دی تو حضرت عمرؓ نے اس بنیاد پر انکار کیا کہ اگر وہ ایسا کریں تو پھر مسلمان اس واقعہ کو اس امر کیلئے نظیر بنالیں گے اور عیسائیوں کو کلیسا بے دخل کر دینگے' اور کلیسا کو مسجد بنا لیں گے''۔

اس کا یہ اثر تھا کہ بعد کے دور میں ہمیشہ مسلم حکمرانوں نے بھی عیسائیوں سے فیاضانہ سلوک کیا۔ چنانچہ امیر شکیب ارسلان اپنی کتاب الحاضر العالم الاسلامی کی جلد دوم کے صفحہ ۲۵۸ پر لکھتے ہیں۔

مشہور فرانسیسی مستشرق کارادے اوس (Karade avas) اپنی کتاب 'ابن سینا' میں لکھتا ہے کہ:

''خلیفہ مامون عباسی بلادِ روم کی فتح کے سلسلے میں ایک مرتبہ شہر جبران پر پہنچا۔ وہاں بعض ایسے لوگوں سے ملا جن کا عجیب وغریب لباس تھا۔ پس ان سے پوچھا کہ کیا تم یہودی ہو؟ انہوں نے کہا نہیں' پھر پوچھا کہ تمہارے پاس خدا کی کوئی کتاب ہے؟ اور کوئی خدا کا نبی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں تو پھر ان سے کہا کہ اگر تم اسلام کو ناپسند کرتے ہو تو عیسائی ہو جاؤ یا یہودی ہو جاؤ' یا ایسا دین اختیار کرو جس کو مسلمان جانتے اور مانتے ہوں''۔

مامون کا یہ واقعہ منفرد اور صرف اسی دور کا واقعہ نہیں ہے جبکہ مسلمان غالب تھے اور صلیبی لڑائیوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا بلکہ ہر دور کا آئینہ دار ہے کیونکہ مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل اس گہرے ثقافتی اور سیاسی ہمدردی کا قدرتی نتیجہ تھا جو آغازِ اسلام سے پائی جاتی ہے۔ اور جس کی نشان دہی سیرۃ اور عہد نبوی کے دو واقعات سے ہوتی ہے۔

## رومیوں اور ایرانیوں کی جنگ کا واقعہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور ایرانی رومیوں پر غالب آئے تو باوجود کہ نہ تو مسلمان کا رومیوں سے کوئی فوجی یا سیاسی معاہدہ تھا اور نہ کفار قریش سے اسی نوع کا ایرانیوں سے کوئی معاہدہ تھا' لیکن کفار قریش خوش اور مسلمان رنجیدہ ہوئے کیونکہ کفار و مشرکین ایرانیوں سے ثقافتی یگانگت محسوس کرتے تھے اور مسلمان عیسائیوں سے' چنانچہ وہاں کے ایک سردار (ابی ابن خلف) کی زبان سے حضرت ابوبکرؓ کے مواجہہ میں ایسا جملہ نکل گیا جس سے عیسائیوں کی ہزیمت پر خوشی کا اظہار مقصود تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو یہ بات ناگوار گذری انہوں نے (ابی) سے فرمایا کہ اس فتح کی خوشی میں عجلت نہ کیجئے عنقریب عیسائی ان مجوسیوں پر غالب آنے لگے۔ حضرت ابوبکرؓ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر ابی آگ بھبھوکا ہو گیا۔ اس نے متکبرانہ انداز میں کہا ''تم کاذب ہو'' حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں فرمایا ''کذبت یا عدو اللہ''۔ (اے اللہ کے دشمن تو کاذب ہے) اگر تجھے اپنی صداقت پر اس قدر بھروسہ ہے تو میں اس پر دس اونٹوں کی شرط بدتا ہوں' اگر عیسائی ان مجوسیوں پر سال بھر سے پہلے غالب نہ آ گئے تو میں یہ شرط ہار دوں گا ورنہ تم مجھے دس اونٹ دینا۔ یہ واقعہ

جب حضرت محمد ﷺ نے سنا تو فرمایا کہ اگر ابی دس ہزار سے زیادہ بازی لگانا اور مدت میں توسیع کرنا چاہے تو آپ تامل نہ کیجئے۔ مدت میں نو سال تک توسیع ہو گئی جس کے بعد مسیحی بادشاہ ہرقل نے ایران پر حملہ کر کے ایرانیوں کو شکست دے کر ان سے اپنا مفتوحہ علاقہ (شام) واپس لے لیا۔ عیسائیوں کی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ واپس آ گئی جس پر حضرت صدیقؓ نے ابی بن خلف سے شرط جیت لی۔ قرآن مجید میں خداوند عالم نے یہ آیات ارشاد فرمائیں۔

الم۔ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین للّٰہ الامر من قبل ومن بعدویومئذ یفرح المومنون (سورۂ روم رکوع ا)

الم۔ روم میں فی الحال عیسائی مغلوب ہو گئے مگر وہ پھر عنقریب غالب آ جائیں گے اور چندہی سال تک اللہ کے ہاتھ میں ہر امر کی ابتداء اور انتہا اور جس وقت روم کو دوبارہ غلبہ حاصل ہو گا اس روز مسلمان بھی ان کی فتح یابی پر خوش ہونگے۔

## حبش پر حملہ کی افواہ سے مسلمانوں میں اضطراب اور فوجی امداد کی تیاری

آنحضرت ﷺ کی زندگی میں یہ افواہ پھیلی کہ حبش کی عیسائی سلطنت پر دشمنوں نے حملہ کر دیا ہے اس افواہ سے مسلمان اس حد تک مضطرب ہوئے کہ حبش کی فوجی امداد کیلئے انہوں نے تیاری شروع کر دی' لیکن کچھ لوگ جو تحقیق حال کیلئے بھیجے گئے تھے یہ خبر لائے کہ افواہ غلط تھی تو پھر مسلمانوں نے امدادی فوج بھیجنے کا منصوبہ ترک کر دیا۔

# مسلمانوں اور عیسائیوں کی یگانگت کی بنیاد

قرآن و حدیث کی تعلیمات' نیز سنت رسول اللہ ﷺ و خلفائے راشدین کا اثر یہ ہے کہ عیسائیوں سے صدیوں کی آویزش اور صلیبی محاربات کے علی الرغم راسخ العقیدہ مسلمان بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ:

## اسلام اور عیسائیت میں مماثلت

(۱) ان دونوں امتوں (مسلم و مسیحیہ) کے کارناموں میں صورت و حقیقت کی نسبت قائم ہوئی اور اسی لئے دونوں کے نظاموں میں ہمرنگی اور مطابقت بھی قدرتی طور پر نمایاں ہوئی تو ضرور تھا کہ وہ نصرانیوں کا تصوری نظام' اسلام کے حقیقی نظام کے لئے اسی طرح وجہ تعارف ہو جس طرح صورت اپنی حقیقت کے لئے باعث تعارف و پہچان ہوتی ہے جسے اسلامی تشریع کے دقیق حقائق پہچاننے ہوں وہ نصرانی تمدن کی صور و اشکال کو آنکھوں کے سامنے لے آئے تو ان حقائق کو جلد پہچان سکے گا۔ گویا یہ دونوں مادی اور روحانی نظام ایک ہی شے کی دو رخ ہیں جو ایک دوسرے پر منطبق ہیں۔(76)

(۲) اسلامی فطرت کا باطنی رُخ اگر امتِ مُسلمہ کے ہاتھوں وجود پذیر ہو سکتا تھا تو اسلام ہی کی فطرت کا دوسرا حسّی اور مادی رُخ اس قوم کے ہاتھوں کھلنا چاہیئے تھا۔ اس امتِ مُسلمہ کے سامنے اسلام کا تشریعی میدان کھول دیا گیا کہ اس سے اصول اسلامیہ کا پابند ہو کر اس کے علم سے تربیت پائی تھی' اور امتِ نصرانیہ کیلئے اسلام کی تکوینی صورتوں اور حسّی تمثیلات کی شاہرہ وسیع کر دی گئی کہ انہوں نے داعی اسلام کا اتباع کئے بغیر محض علمی صورتوں سے روشنی حاصل کی تھی' پس جونہی

اس کا وقت آن پہنچا کہ دنیا کے سامنے اسلامی حقائق واشگاف کی جائیں اور بلحاظ کمیت ساری دنیا کی مختلف الخیال اقوام کو اسلامی مقاصد سے آشنا بنایا جائے۔ وہی صورت پسند نصرانی اُمت کو ان ہی قرآنی اصول کی روشنی میں سلیقہ دیا گیا کہ وہ ہر اسلامی حقیقت کے بالمقابل اس کی ایک دلچسپ مادی مثال مہیا کرے تاکہ جس پسند اقوام اور ظاہر بینوں کیلئے اسلامی حقیقت دلپزیر ہو جائے اور کسی مادی یا طبعی انسان کو بھی اس کے انکار کی جرات نہ ہو۔(77)

یہ امر بطور خاص قابل لحاظ ہے کہ مصنف برصغیر پاک و ہند کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ (دیوبند) کے مشہور عالم و مہتمم ہی نہیں بلکہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے متبعین میں ہیں جن کو انگریزوں کا دشمن اور بغاوت کا ملزم قرار دیکر مالٹا میں محبوس کیا گیا تھا اور جو علماء کی اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جن کو گذشتہ صدی میں انگریز اپنا اور عیسائیوں کا سب سے بڑا دشمن اور باغی سمجھتے تھے' باوجود انگریزوں کے ظالمانہ اور متشددانہ برتاؤ کے اگر آج اسی جماعت کا ایک عالم کی عیسائیت کے بارے میں یہ رائے ہے تو وہ اسلام کی اس واضح اور پُر زور تعلیم کا نتیجہ ہے جس کی روح عیسائیت سے ثقافتی اور سیاسی یگانگت سے سرشار ہے۔

## ترکِ موالات کا مسئلہ اور ایک شُبہ کا ازالہ

یہاں اس شبہ کا ازالہ ضروری ہے جو بعض لوگوں کے ذہن میں قرآن پاک کے ان احکام کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جس میں کفار اور یہود و نصاریٰ سے ترک موالات کی تعلیم دی گئی ہے چنانچہ ہم ذیل میں ان آیات کو درج کریں کہ ان کے حقیقی منشاء کو واضح کریں گے۔

---

عیسائیت

(۱) یاایھاالذین امنو لا تتخذ والذین اتخذوا دینکم ھزواولعبا من الذین اوتوا لاکتب من قبلکم والکفار اولیاء واتقوااللہ ان کنتم مومنین (مائدہ رکوع ۹)

اے ایمان والو جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے جو ایسے ہیں کہ انھوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے ان کو اور دوسرے کفار کو دوست مت بناؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو۔

(۲) لا یتخذ المومنون الکفرین اولیاء من دون الا مومنین ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شیء الا ان تتقوامنھم تقتہ ویحذرکم اللہ نفسہ والی اللہ المصیر۔(آل عمران۔رکوع ۳)

مسلمانوں کو چاہیئے کہ کافروں کو دوست نہ بنائیں مسلمانوں سے بچاو کرکے اور جو شخص ایسا کرے گا سو وہ شخص اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے میں کسی شمار میں نہیں مگر ایسی صورت میں کہ تم ان سے کسی قسم کا اندیشہ رکھتے ہو اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

(۳) ودو لو تکفرون کما کفروافتکونون سواء فلا تتخذوامنھم اولیاء حتی یہاجروافی سبیل اللہ (النساء۔رکوع ۱۲)

وہ اس آرزو میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی کافر بن جاؤ اور وہ سب ایک طرح کے ہو جاؤ سو ان میں سے دوست نہ بنانا جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں۔

(۴) وبشر المنافقین الذین بان لھم عذابا الیما۔ ن الذین یتخذون الکفرین اولیاء من دون المومنین (النساء رکوع ۱۰)

منافقوں کو خوش خبری سنا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے بڑی دردناک سزا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمان کو چھوڑ کر۔

(۵) یاایھا الذین امنو لا تتخذو الکفرین اولیاء من دون

المومنين اتريدون ان تجعلواللّٰه عليكم سلطنا مبينا (النساء رکوع ۲۱)

اے ایمان والو تم مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کرلو۔

(۶) یاایھاالذین امنو لا تتخذوا الیھود والنصری اولیاء بعضھم واولیاء بعض ومن یتولھم منکم فانہ منھم' اناللّٰہ لا یھدی القوم الظلمین (مائدہ آیت ۵۵)

اے ایمان والو تم یہود و نصاری کو اپنا دوست (حلیف) نہ بناؤ اور تم میں سے جو شخص دوست بنائے وہ انہیں (یہود و نصاری) میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ ظالموں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

آیات مذکورہ بالا کے منجملہ صرف دو آیات (پہلی اور چھٹی) میں اہل کتاب سے موالات کی ممانعت کی گئی ہے اور بقیہ چار میں کفار مشرکین سے۔ لیکن چاہے اہل کتاب ہوں یا کفار و مشرکین ان سے مطلق ترکِ موالات مقصود نہیں بلکہ اس صورت میں ہے جبکہ مسلمانوں کے مقابلے میں ان کے خلاف ہو جیسا کہ ان الفاظ میں ''من دون المومنین'' (مسلمانوں سے تجاوز) سے ظاہر ہے چنانچہ آخری آیت (۶) کی تفسیر میں سید رشید رضا لکھتے ہیں:-

سابقہ تصریحات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ موالات سے باہمی امداد و مخالفت مراد ہے اور بعض مفسرین نے قید لگائی ہے کہ یہ اس صورت میں ہے جبکہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہو اور یہ ممانعت مسلمانوں کے افراد اور گروہوں کیلئے ہے نہ کہ تمام امت کیلئے ہے۔ چنانچہ اگر ایسا نہ ہو تو مخالفت تمام مسلمانوں کیلئے ہوگی اور ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اصول دین میں سے نہیں ہے کہ جو لوگ دین میں اختلاف رکھتے ہیں ان سے موالات نہ کی جائے یہ کیسے ممکن ہے جب کہ حضور اکرم ﷺ جب مدینہ

تشریف لائے تو آپ نے یہود مدینہ سے مخالفت کی۔ ایک دوسری جگہ قرآن حکیم کا حکیم یہ ہے:

لا ینھلکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوا کم من دیارکم ان تبروھم وتقسطو الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔ انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین و اخرجو کم من دیارکم وظاھرواعلی اخراجکم عن تولواھم ومن یتولھم فاولک ھم الظلمون۔ (پارہ ۲۷-رکوع ۲-آیت ۹)

اللہ تعالیٰ تم کو ان لوگوں سے حسن معاملت سے منع نہیں کرتا جو دین کے مسئلہ میں تم سے جنگ نہ کریں اور تمہارا دیس نکالا نہ کریں اور نہ ان کے ساتھ انصاف سے منع کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انصاف کو پسند فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم کو ان لوگوں سے (دوستی سے) منع کیا ہے جو دین کے بارے میں تم سے جنگ کریں اور تم کو اپنے گھروں سے نکال دیں اور تمہارے دیس نکالے پر مستعد ہوجائیں۔ جو شخص (ایسے لوگوں سے) ملاقات کرے وہ ظالموں میں سے ہے۔

احکام قرآنی کی یہی وہ انسب تعبیر ہے جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ۱۹۲۰ء کے ہنگامی اور جذباتی دور میں پیش نظر رکھی اور کامل عزیمت کے ساتھ سے اس کا برملا اظہار فرمایا جس کا اثر یہ ہے کہ کانگریسی علماء کا وہ گروہ بھی جو شدت سے ترکِ موالات کا حامی تھا ان کے نمائندہ (دیوبند کے مہتمم) مولانا محمد طیب صاحب اپنی کتاب "تعلیمات اسلامی اور مسیحی اقوام" میں اسلام اور عیسائیت میں مماثلت ثابت کرتے ہیں اور کانگریسی علماء کا دارالاشاعت (ندوۃ المصنفین) اس کو اہتمام سے شائع کرتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ یہودی، عیسائی اور مسلمان نہ صرف ثقافتی حیثیت سے متجانس تھے (کیونکہ اصلاً یہ تینوں الہامی اور سامی تھے) بلکہ ان

میں ایک گہرا روحانی ربط بھی تھا۔ یہ رشتہ ''ملت ابراہیمی'' کا رشتہ تھا۔ اس لئے شریعت اسلامیہ میں اس سے خصوصی اور ترجیحی سلوک روا رکھا گیا جس کے ثبوت میں ہم نے اسلامی شریعت کے چاروں ماخذ' قرآن' حدیث' اجماع اور قیاس واجتہاد (علماء دین کے اقوال) کے حوالے پیش کئے' نیز بتلایا کہ اہل کتاب میں بھی عیسائیوں کے ساتھ زیادہ ترجیحی سلوک مرعی تھا' جس کی وجہ ظاہر ہے کہ باوجود انجیل کی تعلیم میں تحریف کے بلحاظ قربِ زمانہ وہ ''ملت ابراہیمی'' کی تعلیمات اور اس کی روح سے بیگانہ نہ ہو گئے تھے۔

## اسلامی معاشرہ میں عیسائیوں کو برابر کا درجہ دیا گیا

عیسائیوں کے ساتھ اسلام کے ترجیحی سلوک کا سب سے بڑا ثبوت اس امر سے ملتا ہے کہ اسلامی معاشرہ و مملکت میں ان کو برابر کا شریک قرار دیا گیا حالانکہ اسلامی مملکت ایک نظریاتی مملکت ہونے کے باعث اس میں اس امر کا پورا پورا بندوبست رکھا گیا ہے کہ جو اشخاص و طبقات اس مملکت کے تقاضے اور مزاج سے ہم آہنگ نہ ہوں ان کو اس کا پابند نہ بنایا جائے یعنی اس میں شریک نہ کیا جائے جس کی آگے صراحت ہو گی' لیکن عیسائیوں کے بارے میں چونکہ اسلامی تعلیمات کے رجحان یہ تھا کہ وہ اصلاً چونکہ توحید اور پیغمبر برحق (حضرت عیسیٰ) اور صحیفہ الٰہی (انجیل) پر یقین رکھتے ہیں اس لئے باوجود انجیل میں تحریف اور اس کے منسوخ ہونے کے اسلامی مملکت کے طبعی مزاج سے بیگانہ نہیں قرار دیئے جا سکتے اور ان کو اسلامی مملکت میں شریک کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس نظریاتی مملکت کے شہری کے تمام فرائض و واجبات کو ادا کرنے پر آمادہ ہوں۔ جزیہ یا خراج کی ادائی' دیگر غیر مسلموں کی طرح مساوی حقوق قانونی و سیاسی

کے معارض نہیں قرار دیا جا سکتا۔ عیسائیوں کی حد تک جزیہ یا خراج کی ادائی قانونی یا سیاسی حقوق کی کمی علامت نہیں بلکہ ان کے مخصوص مراعات کی علامت ہے نیز یہ اس امر کی نشانی ہے کہ ان کو اس نظریاتی مملکت میں مسلمانوں کے برابر حقوق و فرائض کے ساتھ ساتھ رضا کارانہ طور پر شریک ہونے یا نہ ہونے کی پوری آزادی حاصل ہے لااکراہ فی الدین (دین کے معاملے میں جبر نہیں) یہ کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ جزیہ اور خراج کی صحیح قانونی تعبیر ہے۔

## خراج اور جزیہ کا منشاء

اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے بنو تغلب اور دیگر عیسائی قبیلوں کی خواہش پر انہیں جزیہ سے مستثنیٰ کیا جبکہ وہ مسلمانوں کی طرح فوجی خدمت انجام دینے پر آمادہ تھے' کیونکہ جزیہ دراصل ان' فوجی خدمات کا مالی معاوضہ تھا جو مملکت اسلامیہ کے ہر ایک باشندے کو لازماً انجام دینے پڑتے تھے تمام غیر مسلموں کی حد تک (جنہیں عیسائی بھی شامل ہیں) یہ رعایت رکھی گئی تھی ان لازمی فوجی خدمات کے بجائے (اگر چاہیں تو) جزیہ ادا کریں۔ چنانچہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں:۔

> ''جن لوگوں سے کبھی کسی قسم کی کوئی فوجی خدمت لی گئی ان کو باوجود اپنے مذہب پر قائم رہنے کی جزیہ معاف کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے خود ۱۷ھ میں عراق کے افسران کو لکھ بھیجا کہ فوجی سواروں میں سے جن سے مدد لینے کی ضرورت ہو ان سے مدد لو اور ان کا جزیہ چھوڑ دو''۔(78)

جزیہ نوشیروانی محصول تھا جو باقی رکھا گیا اور عملی طور سے اس بات کو ظاہر کیا

کہ وہ صرف حفاظت کا معاوضہ ہے چنانچہ حمص اور دمشق وغیرہ سے جب ضرورتاً اسلامی فوجیں واپس بلائیں تو جزیہ واپس کر دیا۔

خراج کا حال بھی مختلف نہیں' چنانچہ جن عیسائیوں نے اس امر کی خواہش کی ان سے مسلمانوں کی طرح بجائے خراج کے زکوٰۃ لی جائے اس کو قبول کیا گیا' چنانچہ ڈاکٹر یوسف الدین لکھتے ہیں:

''حضرت عمرؓ نے بنو تغلب' تنوخ اور بہراء سے جو عیسائی تھے بجائے محصول جزیہ کے محصول زکوٰۃ لینے کا حکم دیا''۔(79)

یہاں اس امر کو دُہرانا ضروری ہے کہ یہ رعایت بخلاف دیگر غیر مسلموں کے صرف عیسائیوں کے ساتھ رکھی گئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عیسائی رضا کارانہ طور پر زکوٰۃ کی ادائیگی پر آمادہ ہوں تو ایک اسلامی مملکت میں انہیں بھی مسلم شہریوں کی طرح زکوٰۃ سے استفادہ کے مساوی حقوق مل جاتے ہیں۔ اس سے ایک اور حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ خراج اور جزیہ عیسائیوں کی کوئی قانونی وسیاسی نا قابلیت نہیں بلکہ ان کی ترجیحی حق کی نشانی ہے۔ مسلمان صرف زکوٰۃ ادا کرنے کے پابند ہیں' لیکن عیسائی زکوٰۃ اور خراج میں سے جو چاہیں ادا کر سکتے ہیں۔ اس طرح ان کو وہ حق انتخاب حاصل ہے جو مسلمانوں کو نہیں یہی حال جزیہ کے ہے۔ مسلمان فوجی خدمت انجام دینے کے پابند ہیں' لیکن عیسائی نہیں وہ اگر پسند کریں تو ایسا کر سکتے ہیں۔ ورنہ جزیہ ادا کر کے بطور حق اس سے بچ سکتے ہیں درآنحالیکہ مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں کی حالت ایک اسلامی ملک میں بلحاظ فرائض مسلمانوں سے بدتر نہیں بلکہ بہتر ہے۔

# خراج کی اصل حقیقت

خراج چونکہ عشر زکوۃ کے مقابلے میں دگنا ہوتا تھا اس لئے بعض لوگ بغیر پوری تحقیق کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ غیر مسلموں کے حق میں سختی ہے حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو مسلم شہریوں کے حق میں ناانصافی ہوتی کیونکہ مسلمان مملکت کی لازمی ضروریات (مثلاً جنگی خرچ) کیلئے چندہ دینے کے علاوہ اپنی نقدی بچت اور دیگر آمدنیوں پر بھی زکوۃ دینے پر مجبور تھے جو عشر کے علاوہ (جس کے مقابلے میں خراج تھا) تھا اور ظاہر ہے کہ اس طرح وہ قانوناً مملکت کو زیادہ محصول ادا کرتے تھے۔ پھر دیگر محاصل (نوائب وضرائب) بھی تھے جن کی ادائیگی کے مسلمان پابند تھے۔ الغرض ان وجوہ سے بحیثیت مجموعی مسلمان غیر مسلموں سے زیادہ رقوم حکومت کو ادا کرتے تھے۔ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ عیسائیوں کو خراج کے بجائے زکواۃ کی ادائیگی کا اختیار تمیزی حاصل تھا۔ یہ امر بلا خوف تردید ثابت ہوتا ہے کہ محصول اندازی کے مقابلے میں ایک اسلامی مملکت کی پالیسی بے مثال فیاضی پر مبنی ہے کیونکہ محصول وہندوؤں کے نقطۂ نظر سے اصلی اہمیت اس امر کی ہے کہ محصول وصول کرنے اور عائد کرنے والے سرکاری مفاد کے غلط تصور کے ماتحت زیادہ محصول نہ عائد کریں اور اسلامی مملکت میں اس کے انسداد کا بڑا اہتمام تھا چنانچہ کتاب الخراج کے حوالے سے مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ”حضرت عمرؓ کو یہ احتیاط تھی کہ ہر سال جب عراق کا خراج آتا تھا تو دس ثقہ اور معتمد اشخاص کوفے سے اور اسی قدر بصرے سے طلب کئے جاتے تھے اور حضرت عمرؓ چار دفعہ شرعی قسم دیا کرتے تھے کہ یہ مالگذاری کسی ذمی یا مسلمان پر ظلم کر کے تو نہیں لی گئی“۔(80)

اسی سلسلہ میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ فیاضانہ سلوک کی ایک اور صورت سنیئے۔

''شام اور مصر میں زمینداری منسوخ کی اور حضرت عمرؓ نے وہ تمام اراضیات جو شاہی جاگیر تھیں یا جن پر مصری افسر قابض تھے باشندگان ملک کے حوالے کردیں اور بجائے اس کے کہ وہ مسلمان افسروں یا فوجی سرداروں کو عنایت کی جائیں قاعدہ بنادیا کہ مسلمان کسی حالت میں ان زمینوں پر قابض نہیں ہو سکتے (یعنی مالکانِ اراضی کو قیمت دے کر خریدنا چاہیں تو خرید نہیں سکتے ہیں)۔ (81)

الغرض یہ محصول خراج اس قدر ہلکا تھا کہ یہ بھی اشاعتِ اسلام کا ایک بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوا' چنانچہ لکھا ہے کہ فرانس کے ایک نہایت لائق مصنف نے لکھا ہے کہ یہ بات مسلّم ہے کہ اسلام کی فتوحات میں خراج اور مالگذاری کا بہت بڑا دخل ہے۔ روم کی سلطنت میں باشندگان ملک کو جو سخت خراج ادا کرنا پڑتا تھا اس نے مسلمانوں کی فتوحات کو نہایت تیزی سے بڑھایا' مسلمانوں کو جو مقابلہ کیا گیا وہ اہل ملک کی طرف سے نہ تھا بلکہ حکومت کی طرف سے تھا۔ (82)

## صلیب وہلال کی آویزش کے اسباب

قرآن وحدیث کے احکام اور عہدِ رسالت اور عہدِ خلفاء میں عیسائیوں سے خصوصی برتاؤ کے باوجود بدقسمتی ہے مسلمانوں اور عیسائیوں میں ان بن ہوگئی اور صدیوں سے خونریز لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہے' اس لئے ان اسباب ومحرکات کا جائزہ لینا ضروری ہے' جو ان میں مخالفت اور جنگ وجدل کا باعث ہوئے تاکہ آئندہ کیلئے

عیسائیت

باہمی دوستی یا کم از کم باہمی مفاہمت کی مناسب فضا پیدا ہو کیونکہ مستقبل میں دنیا کے اس امن و امان اور نوع انسانی کی سلامتی و فلاح کا دارومدار اس لئے انہیں پر ہے کہ ان دونوں مذاہب کے پیروؤں کی مجموعی تعداد عالمی آبادی کا تقریباً ۵۳ فیصد ہے اور کرۂ ارض کا تقریباً تین چوتھائی سے زائد رقبہ ان کے قبضہ میں ہے۔

## جنگ کی ابتداء عیسائیوں نے کی

اسلام کی دوستی کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کے فیاضانہ طرز عمل کے باوجود ان عرب قبائل نے جو عیسائی ہو گئے تھے خصوصاً غسانیوں نے اس کو ناکام بنا دیا۔ غسانی بازنطینی حکومت کی سرحد پر اپنی باجگذار سلطنت رکھتے تھے۔ چنانچہ عہد رسالت میں عیسائیوں سے جو تین لڑائیاں ہوئی ان کا مستند تاریخی ریکارڈ حسب ذیل ہے:

۱۔ غزوہ دومۃ الجندل

یہ ایک قبیلہ تھا جو عرب اور شام وغیرہ کے تجارتی راستے پر رہتا تھا اور تجارتی قافلوں سے محصول کیا کرتا تھا۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی اشاعت اور مملکت اسلامیہ کی توسیع و استحکام کو دیکھ کر ان کو یہ اندیشہ ہوا کہ ان کا اقتدار خطرہ میں ہے اور وہ محصول مال تجارت سے محروم ہو جائیں گے۔ چنانچہ اسی اندیشہ کے تحت بلا کسی وجہ کے اپنی دانست میں اسلام کو ختم کرنے کیلئے جنگ کی ابتداء کی۔ چنانچہ عبدالمتین لصعیدی لکھتے ہیں:

''اہل دومۃ الجندل پہلے عیسائی ہیں جو مسلمانوں سے لڑے۔ یہ لوگ مسلمانوں سے لڑائی میں پہل کرنے والے تھے' ان سے مسلمان اس وقت تک نہیں لڑے جب تک انہوں نے زیادتی نہیں کی''۔(83)

## ۲۔ غزوۂ موتہ

عیسائیوں سے دوسری لڑائی (غزوۂ موتہ) ہوئی جس کی بنیاد یہ تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں کے پاس امن و دوستی کے جو وفود بھیجے تھے ان کے منجملہ ایک وفد شام کی عیسائی سلطنت کے حکمرانوں (قیصر) کے پاس بھی روانہ کیا تھا اس سفیر کو غزوۂ موتہ کا سبب یہ تھا کہ شرجیل بن عمرو نے جو شام میں قیصر کا ماتحت عیسائی سردار تھا اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حارث بن عمرو کو قتل کر دیا۔(84)

اسی طرح مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ناظم دارالعلوم دیو بند لکھتے ہیں:

> "شرجیل بن عمرو غسانی نے جو ہرقل کا ملک شام میں حاکم تھا حارث بن عمرو کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے ایلچی تھے قتل کروا دیا اور سفیر کو قتل کروانے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ اس بناء پر غزوۂ موتہ کا واقعہ پیش آیا"۔(85)

## ۳۔ غزوۂ تبوک

اس لڑائی کا سبب سنیئے۔

(۱) پھر عرب مستنصرہ (وہ عرب جو عیسائی ہو گئے تھے) اور غسانیوں نے ہرقل قیصر روم کو اطلاع دی کہ یہ شخص (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) جو دعوت نبوت کرتا تھا ہلاک ہو گیا اور اس کی امت پر قحط سالی نازل ہے۔ اس وقت سے بہتر کوئی دوسرا وقت ان کے استیصال کا نہ ملے گا۔ قیصر نے یہ سن کر لشکر عظیم شام میں جمع کیا اور مقدمہ الجیش کو بلغاء یعنی پایۂ تخت ملوک غسان میں بھیج دیا' اس خبر کو سن کر آپ نے بہ نفس نفیس مسلمانوں کی بھاری جمعیت کے ساتھ شام کا قصد فرمایا۔ اس غزوہ میں مقابلے کی نوبت نہیں آئی بلکہ تبوک پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ خبر بالکل بے اصل تھی۔(86)

عہدِ رسالت میں عیسائیوں سے جو تین لڑائیں ہوئیں ان کا حال بیان ہو چکا ' یہ تینوں عیسائی عربوں سے ہوئیں' تینوں کی ابتداء عیسائیوں نے کی' ان تینوں کا محرک شخصی اور نسلی غرور اور معاشی و سیاسی مفاد تھا' کیونکہ غسانی کفار قریش کی طرح اسلام کی اخوت اور مساوات کی تعلیم کو جو عرب وعجم کے امتیاز کو مٹاتی تھی اپنے لئے ایک زبردست خطرہ سمجھتے تھے' جس کے باعث ایک طرف ان کا نسلی امتیاز ختم ہو جاتا تھا تو دوسری طرف ان کا اقتدار بھی کیونکہ وہ بخوبی یہ دیکھ سکتے تھے کہ سلطنت اسلامیہ کے استحکام اور اس کی جمہوری تعلیم کے نتیجے کے طور پر ان کی رعایا بہت جلد نئے مذہب اور نئی مملکت میں شریک ہونے کو ترجیح دے گی۔ اس طرح وہ حکومت اور آمدنی کے اس زبردست ذریعہ (چنگی) سے محروم ہو جائیں گے جو تجارتی قافلوں سے انہیں ملتا تھا۔ اس طرح انہوں نے ہرقل کی عیسائی سلطنت کو جنگ کی ابتداء کر کے الجھایا' آنحضرت ﷺ کی زندگی میں جو تین لڑائیں ہوئیں ان کی ساری حقیقت یہ ہے جو اوپر بیان ہوئی' اس کی ابتداء عیسائیوں نے کی جو اپنے نسلی امتیاز' معاشی مفاد اور سیاسی منافعہ کو خطرہ میں سمجھتے تھے' لیکن حضور ﷺ کی وفات پر ان کی یہ کوششیں اور تیز ہو گئیں تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کا حاکمِ اعلیٰ (PARAMOUNT POWER) یعنی بیزنطینی شہنشاہ کے پاس ایک سفارت بھیجی جو ناکام بنادی گئی' چنانچہ ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں:

> ''قیصر کی سفارت کی ناکامی اور اتمام حجت کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے
> شام، فلسطین اور اردن پر الگ الگ فوجیں بھیجیں''۔

ان تاریخی شواہد سے اندازہ ہوگا کہ عیسائیوں سے اسلام کی جنگوں کا آغاز جو ہلال وصلیب کی تاریخی آویزش پر منتج ہوا دفاعی تھا' جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عیسائی مملکتوں کو پیغمبر اسلام نے جو تبلیغی سفارتیں بھیجی تھیں ان کے انکار کے نتیجے میں جہاد کیا گیا وہ صحیح

نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر حبش کی عیسائی سلطنت سے جہاد کیوں نہیں کیا گیا حالانکہ فوجی قوت کے اعتبار سے وہ رومی شہنشاہیت سے کمزور تھی' اگر کہا جائے کہ بیک وقت دو محاذوں پر جنگ مناسب نہ تھی تو پھر بعد کے دور میں بھی اس کو کیوں مفتوح نہ کیا گیا جبکہ وہ اسلامی عملداری سے گھر کر اور عیسائیوں سے کٹ کر بالکلیہ مسلمانوں کے اس طرح رحم وکرم پر رہ گئی تھی کہ خود عیسائی مصنفین کو اس کا اعتراف ہے۔

۱۔ ''چاہے کچھ بھی ہو ابتدائی جوش وخروش کے عظیم الشان زمانے میں جب کہ عرب ایک ملک کے بعد دوسرے ملک پر چھا رہے تھے حبش کے خلاف کوئی جہاد نہیں کیا گیا''۔(87)

۲۔ عربوں کی فتوحات کے نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت بالکلیہ الگ تھلگ ہوئی۔ صدیوں کیلئے جہاں تک یورپ کا تعلق ہے اس کا وجود اور جغرافیائی محل وقوع نامعلوم تھا۔ یہ چاروں طرف سے اپنے مذہب کے دشمنوں سے گھر گئی تھی گبن کہتا ہے' حبش کے باشندے ایک ہزار سال تک ساری دنیا کو بھول چکے تھے' اور دنیا نے بھی انہیں بھلا دیا تھا۔(88)

بنا برآں یہ واضح ہے کہ صلیب و ہلال کی تاریخی آویزش کے لئے مسلمان ذمہ دار نہیں ہیں لیکن جب ایک مرتبہ شروع ہوگئی تو پھر اس امر کے تجزیہ کا کوئی حاصل نہیں ہے کہ کس نے کس کا کتنا حصہ دبایا' جیسا کہ مغربی مورخین یا عیسائی پادری کیا کرتے ہیں جس کا ایک عمدہ نمونہ (Bridge to Islam) کے پادری صاحب نے اپنی کتاب کے صفحات ۱۹۶-۱۹۷ پر کیا ہے کہ کس طرح انیسویں اور بیسویں صدی میں عیسائیوں نے مسلم علاقوں پر قبضہ کیا۔

# صلیبی جنگوں کی کہانی عیسائیوں کی زبانی

البتہ قرون وسطیٰ میں صلیبی جنگوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ جن سے ظاہر ہوگا کہ آغازِ اسلام کی طرح ان کی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں بلکہ عیسائیوں پر عائد ہوتی ہے اور یہ بات خود عیسائی مصنفین کی تحریروں سے ثابت ہے۔ ع

جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے

ایک لبنانی عیسائی ایڈورڈ عطیہ لکھتا ہے:

''اسلام کی تاریخ کے عربوں کی طرح مذہبی جوش کے علاوہ دیگر محرکات نے اس عیسائی مہم پر آمادہ کیا جو یہ تھے' تجارتی فوائد اور اطالوی شہروں کی قسمت آزمائی' جاگیردار امیروں کی اولاد اصغر کیلئے تلاش روزگار کی ضرورت اور یہ حقیقت کہ بیرونی دشمن کے خلاف ایک متحدہ جدوجہد یورپ میں جاگیرداروں کے مقامی جھگڑوں کو ختم کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے''۔(89)

ایک اور پادری صاحب (Erich. W Bethman) اپنی کتاب میں اس سے زیادہ واضح تصور پیش کرتے ہیں:

''اسی زمانہ میں یورپ میں ایک ایسا تغیر پیدا ہوا جو جلد ہی یورپ پر اپنا سایہ ڈالنے والا تھا' روما میں پوپ کا اقتدار بتدریج لیکن یقینی طور پر بڑھ گیا' یہاں تک کہ ہیڈل برانڈ (گریگوری ہفتم) نے نہایت طمطراق سے اعلان کیا کہ روئے زمین کی تمام سلطنتیں مقدس بحر کی ماتحت ہیں' اس لئے اس کا حکم ایسا ہی عالمگیر ہے جیسا کہ وہ کلیسا جو اس کا نمائندہ ہے' رومی کلیسا کے اس قطعی اور عالمگیر اقتدار کے نظریہ کو بخوشی قبول نہیں کیا

گیا۔ اس کا نتیجہ شہنشاہ جرمنی سے زبردست تصادم تھا۔ اس کا ایک بدل اختیار کیا گیا اور ۱۰۸۵ء میں گریگوری کے انتقال کے بعد کلیسائے روما کے ذریعہ عالم پر حکمرانی کے دو پوپ دعویدار تھے جب (۱۰۸۸ء) میں اربن دوم منتخب ہوا تو اس کی حالت غیر محفوظ اور نازک تھی' اسکا طاقتور حریف کلیمنٹ سوم روم میں فروکش تھا' اور بادشاہ کی پارٹی کی حمایت اس کو حاصل تھی۔ اربن کو جس اقتدار کی خواہش تھی وہ کسی جرات مندانہ اقدام ہی سے حاصل ہوسکتا تھا' اپنے ٹوٹتے ہوئے حامیوں کو متحد کرنے کیلئے اس کو کوئی نہ کوئی تدبیر کرنی تھی۔

مزید برآں اس کو اپنے عہد کے مسائل میں سے ایک کو حل کرنے کا طریقہ دریافت کرنا تھا۔ جاگیرداروں اور امراء کی پیہم جنگ و جدال' لوٹ مار اور غارتگری کو روکنے کے ذرائع معلوم کرنے تھے' اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان امراء اور جاگیرداروں کی ایک نئی بصیرت عطا کرے اس نے کلبرمنٹ میں ایک کونسل بلائی اور اس میں فرانس کے امراء کو مدعو کیا' بذاتِ خود الپس کی پہاڑی کو عبور کر کے پہونچا اور کونسل کے دیگر کاروبار کو بنٹانے کیلئے کونسل کے اجلاس کے دسویں دن اس پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر جو خاص طور سے اسی غرض کیلئے تیار کیا گیا تھا حسبِ ذیل اہم اعلان کیا۔

> ''عیسائی جانبازو! تم جو نہ ختم ہونے والی جنگ کیلئے حیلے تلاش کرتے ہو خوش ہو جاؤ کہ تمہاری جاں سپاری کیلئے سچے مقاصد مہیا ہیں' تم جو اکثر اپنے ساتھی شہریوں کیلئے ایک خطرہ ہو' جاؤ اور وحشیوں کے خلاف لڑو اور مقدس مقامات کو دشمنوں کے ہاتھوں سے چھڑانے کیلئے لڑو' تم جو چند ٹکوں کیلئے اپنے ہتھیاروں کی قوت دوسروں کے انتقام کے لئے خرچ کرتے ہو جاؤ اور ایک لافانی انعام کے مستحق بن

جاؤ اگر تم اپنے دشمنوں پر غالب آ گئے تو مشرق کی حکومت تمہارا ورثہ ہو گی۔ اگر تم مغلوب ہو گئے تو تم کو شہادت نصیب ہو گی کہ تم اس سرزمین پر مرو گے جس پر حضرت عیسیٰؑ مرے تھے اور خدا اس امر کو فراموش نہ کرے گا کہ تم اس کی مقدس فوج میں شریک تھے۔ یہ ثابت کرنے کا وقت ہے کہ تم حقیقی شجاعت کے مظہر ہو یہ وہ وقت ہے جبکہ تم ان گناہوں کا کفارہ ادا کر سکتے ہو جو تم نے حالتِ امن میں کئے ہیں۔ ان متعدد فتوحات کا کفارہ ادا کر سکتے ہو جو تم نے انصاف اور انسانیت کو نقصان پہونچا کر حاصل کی ہیں۔ اگر تمہیں خون کی ضرورت ہے تو اپنے ہاتھوں کو بے دینوں کے خون سے رنگو میں تم سے درشت کلامی کر رہا ہوں کیونکہ میرا منصب مجھ سے اس کا متقاضی ہے' دوزخ کے سپاہیو! زندہ خدا کے سپاہی بنو۔ جب یسوع مسیح اپنی مدافعت کیلئے تمہیں آواز دیں تو پھر کوئی عذر لا طائل تمہیں اپنے گھروں میں نہ روک لے' تم عیسائیوں کی ذلت اور مصائب کے سوا کسی اور چیز کو نہ دیکھو بیت المقدس کی چیخوں کے سوا اور کسی آواز کو نہ سنو اور اپنے خدا کے اس قول کا یاد رکھو:

''وہ شخص میرے نام کیلئے اپنے مکان' یا باپ یا ماں' یا بیوی' یا اولاد' یا موروثی جائیداد کو تج دیتا ہے' اس کو کئی سو گنا زیادہ معاوضہ ملے گا اور ابدی زندگی پائے گا''۔

ابتداء میں تو شہزادوں' امراء اور جاگیرداروں کا کثیر مجمع مبہوت تھا' لیکن ایک آواز کا اُٹھنا تھا کہ سارا مجمع پکار اُٹھا ''یہ مشیتِ ایزدی'' ہے مذہبی جنگ مقدس کا

اعلان ہو گیا بالآخر عیسائیوں کو بھی جہاد مل گیا۔

اربن ثانی کو کلیر منٹ جاتے وقت کامیابی کا پورا یقین نہ تھا' لیکن بہرحال اس کو اپنے حریف کے مقابلے میں ایک آخری داؤ کرنا تھا لیکن جب اس نے لوگوں کی یہ آمادگی دیکھی تو وہ حیران رہ گیا۔ اگرچہ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کتنی زبردست شورش پیدا کر دی ہے یورپ پر ایک دیوانگی طاری ہو گئی' ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک یورپ کے دل و دماغ پر صرف مقدس جنگ کا خیال چھایا رہا کہ کس طرح نابکاروں (ترکوں اور مسلمانوں) کا صفایا کر دیا جائے' شہنشاہ' بادشاہ' امراء اور شہزادے غرض گلستان یورپ کے پھول مقدس باپ کی خاطر لڑنے کیلئے جاتے رہے۔(90)

''گلستان یورپ کے پھولوں'' کے رنگ و بو کو بھی دیکھ لیجئے۔

''لیکن ان مذہبی پیشواؤں کی ٹولیوں کی انتہائی اوہام پرستی' نفرت انگیز بے رحمی اور افسوسناک اکھاڑ پچھاڑ کا جب ہم چوتھے اور آخری ڈویژن (فوج) سے مقابلہ کرتے ہیں تو یہ سب ماند پڑ جاتے ہیں' فرانس' رہائن لینڈ کے صوبجات فلانڈرس اور برطانوی جزائر سے ایک انبوہ کثیر آگے آیا جو ان تمام اقوام کے رذیلوں' کوڑا کرکٹ اور جھاگ پر مشتمل تھا' سب سے پہلے ان بدمعاشوں نے رائن اور موسل کے یہودیوں پر حملہ کیا' ہزاروں بے دریغ قتل کیے گئے اور دوسروں نے اپنے ہم مذہبوں کے حشر سے بچنے کیلئے اپنے آپ کو اور اپنے بیوی بچوں کو آگ یا پانی میں جھونک دیا۔ قتل و غارت گری اور لوٹ مار سے اس طرح شکم سیر ہو کر ان بدمعاشوں نے ڈنیوب تک اپنا کوچ جاری رکھا' لیکن ہنگری کے باشندوں کے ہاتھوں ان کا صفایا ہو گیا۔ یہ قتل عام اس قدر دردناک تھا کہ دریا متعفن لاشوں سے پٹ گیا اور اس کا پانی مقتولوں کے خون سے

رنگین ہوگیا تھا"۔(91)

یہ ہے صلیب و ہلال کی تاریخی آویزش کی کہانی اور اس کے محرکات جس نے صدیوں تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے بے مقصد ایک دوسرے کا دشمن بنائے رکھا اور جس نے دوستی اور اتحاد کی اس تعلیم کے راستے میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کر دیں جو اسلامی تعلیمات کی روح تھی' اس صلیبی لڑائیوں کی تاریخ پر کتنا ہی رنج' افسوس ہو بحیثیت مسلمان ہم اس تعلیم سے انحراف نہیں کر سکتے جو قرآن کے جامع الفاظ میں:

> "دیگر غیر مسلموں کے مقابلے میں عیسائیوں کو مسلمانوں سے زیادہ قریب قرار دیا گیا ہے اور حدیث شریف کے الفاظ میں وہ مسلمانوں کو خصائل و عادات میں عیسائیوں سے زیادہ مشابہ کیا گیا ہے"

دراصل یہ احکام آخری دین کی بصیرت کی علامت ہے کیونکہ وہ علم الٰہی پر مبنی تھے جس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی (جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے) کہ انسانیت کی تاریخ میں انہیں دونوں مذاہب (اسلام اور عیسائیت) کو اصلی کردار ادا کرنا ہے۔ چنانچہ گذشتہ چودہ صدیوں کی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ قیادتِ عالم کا منصب انہی دونوں سامی اقوام اور الہامی مذاہب کے پیروؤں کو حاصل رہا ہے اور باوجود باہمی تنازعہ کے ان دونوں نے انسانیت کے قافلے کی منزل مقصود کی طرف رہنمائی کی ہے اور تہذیب کو ترقی دی ہے۔ اگر یہ دونوں باہمی غلط فہمیوں کو نظر انداز کر کے لکم دینکم ولی دین (تمہارا مذہب تمہیں مبارک اور ہمارا ہمیں) کے اصول رواداری پر عمل کریں تو کوئی شبہ نہیں کہ مستقبل میں بنی نوع انسان کی ترقی و تحفظ میں پوری اور بعجلت کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

---

# ذمیوں کا مسئلہ اور ایک شبہ کا ازالہ

اس مقام پر اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ اہل کتاب خصوصاً عیسائیوں کے بارے میں ترجیحی احکام کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہے کہ دیگر غیر مسلموں سے کوئی سختی برتی گئی ہے بلکہ ذمیوں سے ہمیشہ فیاضانہ سلوک کیا گیا۔ ذمیوں کا نام اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی غیر مطمئن یا ادنیٰ حیثیت کا ترجمان نہیں بلکہ اس کی نشانی ہے کہ ان کے جان و مال' مذہب و ثقافت' عزت و آبرو کی حفاظت حکومت کی مقدس ذمہ داری ہے۔ اس کا جس پابندی سے اہتمام کیا گیا اس کا اندازہ خلافت راشدہ کے حالات سے ہو سکتا ہے جس کے بارے میں تاریخ کی شہادت یہ ہے:

> ''حضرت عمرؓ نے وفات کے قریب خلیفہ ہونے والے شخص کیلئے ایک مفصّل وصیت فرمائی تھی' اس وصیت نامے کو امام بخاری' ابوبکر بیہقی' جاحظ اور بہت سے مورخین نے نقل کیا ہے۔ اس کا آخری فقرہ یہ ہے ''یعنی میں ان لوگوں کے حق میں وصیت کرتا ہوں جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے۔ یعنی ذمی کہ ان سے عہد پورا کیا جائے اور ان کی حمایت میں لڑا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے''۔(92)

جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں:

> '' عرب خصوصاً اپنی بیداری کے آغاز میں اپنے مذہب کیلئے زبردست جوش رکھتے تھے' تاہم وہ روادار قوم تھے اور مذہب میں ان کی اس رواداری کی متعدد مثالیں ہیں' بیت المقدس میں خلیفہ عمرؓ نے

خاص طور پر اس کو پیش نظر رکھا۔ اسپین میں عیسائیوں کی بڑی آبادی تھی جن کو پوری پوری آزادی ضمیر حاصل تھی۔ ہندوستان میں عربوں نے سوائے سندھ کے کبھی حکومت نہیں کی لیکن ان سے مسلسل ربط قائم رہا اور تعلقات دوستانہ رہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ تاریخ کے اس دور میں سب سے نمایاں وہ فرق ہے جو مسلمان عربوں کی رواداری اور یورپ کے عیسائیوں کی عدم رواداری میں پایا جاتے ہے"۔(93)

اسی طرح پادری سبٹھمین صاحب انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"اس کے برخلاف اس پر ہمیشہ زور دینے کی ضرورت ہے کہ جب تک عرب اسلام کا عصا استعمال کرتے رہے غیر مسلموں اور خصوصاً اہل کتاب کے بارے میں اسلام کی وسیع عملداری میں ایسی رواداری پھیلی ہوئی تھی جس کا ہم عصر عیسائی مملکت میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس ابتدائی دور میں غیر مسلموں کے برخلاف مذہبی تعصب کا کوئی سوال ہی نہیں ہے"۔

سردار پانیکر لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے دورِ حکومت میں ہندو مذہب کے ساتھ انتہائی واداری برتی گئی"۔

# CONFUCIANISM

# کنفیوشی مت

کنفیوشی مذہب چین کا سب سے بڑا اور مقامی مذہب ہے۔ کنفیوشی گروہ پچیس صدیوں کی مسلسل تاریخ رکھتا ہے۔ تقریباً دو ہزار سال تک یہ حکمران گروہ رہا ہے۔(94) کنفیوشی ازم (Confucianism) کا نام مغربی اقوام کا دیا ہوا ہے۔ اس کا اصلی چینی نام کنگ چیو Kingchio یا کنفیوشس (Confucius) کی تعلیمات ہے۔ یا پھر اس کو جیوشیو Juo-Chiao کہتے ہیں جس کے معنی علماء کی تعلیم ہے (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۶ China Hand Book)۔

کنفیوشی مذہب چین کا قدیم مذہب ہے۔ اس مذہب کی بنیاد کائنات کی پرستش پر ہے' اور یہ پرستش کائنات کے اجزاء اور مظاہر کی پرستش ہے۔(95)

## کنفیوشی مت کی تعریف

اس مذہب کا بانی علماء مغرب کے دیے ہوئے نام کے مطابق چین کا مشہور حاکم (Confucius) ہے۔ جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ 551 اور B.C. 478 قبل مسیح میں گذرا ہے۔ اس کا باپ شیولیان تھا' جو ایک ضلع کا حاکم تھا۔ جس کی بڑھاپے کی اولاد کنفیوشس تھا۔ اس کی عمر تین سال کی تھی کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور ۱۹ ویں سال میں اس کی شادی ہو گئی۔ جس سے ایک لڑکا اور دو لڑکیاں پیدا ہوئی۔ شادی کے فوراً بعد وہ اپنے ہی ضلع

میں سرکاری ملازم ہو گیا۔ بائیس سال کی عمر میں اس نے ایک مدرسہ قائم کیا۔ یہ بچوں کا مدرسہ نہ تھا بلکہ ان نوجوانوں کی تعلیم کیلئے تھا جو حکومت اور صحیح کردار کے اصول سیکھنا چاہتے ہیں۔ اس مدرسہ میں اس کے شاگردوں میں شہزادے بھی شامل تھے جن کے ساتھ اس نے دارالخلافہ کا سفر کیا اور وہاں اس نے شاہی کتب خانے کے علمی خزانوں کی تحقیق کی اور فن موسیقی کا مطالعہ کیا' جو اس زمانے میں دربار میں انتہائی عروج پر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں اس نے طاؤ مت کے بانی لاورزی (Laozi) سے مختلف ملاقاتیں کیں اور اس سے کافی متاثر ہوا۔ اسی سال حکومت میں بڑا انتشار بھی پیدا ہوا اور وزراء نے بادشاہ کو نکال باہر کیا۔ اس چیز کو کنفیوشس گوارا نہ کر سکا اور وہ بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ چل کھڑا ہوا راستہ میں اس نے ایک عورت کو روتے ہوئے پایا۔ عورت سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کے خسر' اس کے شوہر اور اس کے لڑکے کو اس مقام پر شیر نے پھاڑ کھایا ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ پھر وہ کیوں ایسے خطرناک مقام کو چھوڑ نہیں دیتی' تو اس نے جواب دیا کہ حکومت جابر اور ظالم نہیں' اس پر کنفیوشس نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ بچو! اس کو یاد رکھو کہ ظالم اور جابر حکومت شیر سے بھی زیادہ وحشی اور خوف ناک ہے۔ اس کے بعد بھی مزید پندرہ سال تک اس نے خاموش زندگی گزاردی اور مطالعہ میں مصروف رہا۔ اس کے بعد معتقدین کی تعداد بڑھتی رہی' وہ حکومت کی مختلف جماعتوں سے علیحدہ رہنے میں کامیاب ہوا' اور بالآخر اپنی عمر کے ۵۲ ویں سال شہر چنٹو کا اعلیٰ حاکم عدالت اور بالآخر وزیر عدالت مقرر ہوا جس کے زمانہ میں جرائم بالکل بند ہو گئے۔ اسی زمانے میں اس کے دو مرید اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ اور انہوں نے اس سے بڑا تعاون کیا اس نے ایک بڑے عہدہ دار کو بھی سزا دے کر اپنی انصاف پسندی کو چار چاند لگائے۔

---

اس نے سرکش اُمراء کو دبایا اور بادشاہ کو قوی بنایا' اس کے زمانے میں بے ایمانی غائب ہوگئی تھی۔ وفاداری اور نیک نیتی عوام کی خصوصیات' اور پاک دامنی اور عفت عورتوں کی خصوصیات ہوگئی تھیں۔ وہ عوام کا محبوب بن گیا اور لوگ اس کی تعریف میں قصیدے گانے لگے۔ بادشاہ نے یہ دیکھ کر کہ کنفیوشس کا اثر ترقی پا رہا ہے۔ اور وہ مملکت کے طول و عرض میں مقبول اور طاقتور ہو جائے گا۔ جس کا نقصان بادشاہ کے اقتدار کو اُٹھانے پڑے گا۔ کنفیوشش سے بے رُخی برتنی شروع کی' یہ دیکھ کر وہ علیحدہ ہو گیا اور مختلف ممالک کی سیاحت کرنے لگا۔

## کنفیوشی مذہب کی تعلیمات کی تفسیر

واقعہ تو یہ ہے کہ کنفیوشی مذہب کو ان معنی میں مذہب نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں خاص قسم کے اصول اور عبادات کی پابندی کی جاتی ہو' کیونکہ اس میں دوسرے مذاہب کی طرح مذہبی اعتقادات سے کوئی روحانی فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا' تاہم اجتماعی زندگی کے متعلق اخلاق اور حکمرانی کے دائرۂ عمل کے اندر اس میں ایسے اصول پائے جاتے ہیں جن کا بہت گہرا اثر چینیوں کی زندگی پر پڑا ہے۔

## اخلاق کا اُصول

کنفیوشس نے الہام کا کوئی دعویٰ نہیں کیا' اس کو صرف انسان کے اُن فرائض سے بحث ہے جو اس پر معاشرے کے فرد کی حیثیت سے عائد ہوتے ہیں۔ ان ہی فرائض کی ادائیگی میں ہم آہنگی' رضائے الٰہی کی پابندی ہے اور ان کی خلاف ورزی نافرمانی ہے' لیکن ایک اعلیٰ تر طاقت سے متعلق اس کے حوالے بہت ہی مبہم ہیں' کیونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ چار چیزیں ایسی ہیں جن کے متعلق اس نے بہت ہی کم اظہارِ خیال کیا

ہے۔ ان میں سے ایک روحانی شخصیتیں ہیں۔ اگرچہ وہ مُردوں کی ارواح اور ایصال ثواب کے اعمال انجام دیا کرتا تھا' لیکن ان کا کہنا تھا کہ اگر تم انسانوں کی خدمت نہیں کر سکتے تو پھر ارواح کی کس طرح کر سکتے ہو؟ اس کے ایک اور جملے سے آخرت یا حیات بعد مُمات کے مسئلہ کے متعلق اس کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے جو یہ ہے:

''جب تم زندگی کی حقیقت نہیں جانتے تو تم موت کو کیا سمجھ سکتے ہو؟''

اس بناء پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی تعلیمات خالص دنیاوی تھی' وہ انسان کو معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے اور اس کے اعمال کا سرچشمہ بعد میں آنے والی دنیا کا تصور نہیں سمجھتا۔ نیکی اور بدی کے نتائج مرتکب کو (خود اس کو) یا اس کے اخلاف کو ملتے ہیں' وہ تعدادِ ازواج کا مخالف نہیں تھا اور نہ عورتوں کے حقوق کا بڑا حامی تھا' اس کی تعلیمات بڑی حد تک قدامت پرستی پر مبنی ہیں۔

## حکومت کے متعلق اس کے تصورات ونظریات

ایک مرتبہ اس کے ایک پیرو نے پوچھا کہ اگر کسی شخص کو حکومت مل جائے تو اس کو پہلا کام کیا کرنا چاہیئے؟ تو اس کا جواب یہ تھا کہ نام کی لاج رکھے۔ جب یہ کہا گیا کہ یہ بات بہت ہی مبہم ہے تو پھر بھی وہ اس پر اصرار کرتا رہا۔ اور یہی بات اس کے تمام معاشرتی اور سیاسی نظام کی ترجمان ہے۔ کیونکہ اس نے ایک امیر سے کہا تھا کہ اچھی حکومت اس وقت قائم ہوتی ہے جب بادشاہ بادشاہ ہوا' اور وزیر وزیر' باپ باپ ہو اور بیٹا بیٹا۔ معاشرہ اس کے نزدیک حکم خداوندی تھا' جس کی ترکیب پانچ رشتوں سے ہوتی ہے: (۱) بادشاہ و رعایا (۲) شوہر و بیوی (۳) باپ اور بیٹا (۴) بڑے اور چھوٹے بھائی' اور (۵) احباب۔

The Great Religions of the Modern World اس کی بابت

کنفوشی مت

کا مقالہ نگار یوں لکھتا ہے:

(۱) اخلاقی زندگی کا تصور پانچ رشتوں میں کیا گیا ہے: (۱) راعی و رعایا' (۲) باپ بیٹا' (۳) میاں بیوی' (۴) بڑا بھائی اور چھوٹا بھائی اور (۵) ایک دوست اور دوسرا دوست۔

(۲) ''ان میں سے ہر ایک مملکت کے کچھ مراعات اور کچھ ذمہ داریاں رکھتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد ایسی وفاداریوں کے نظام میں منسلک ہے جو دوسروں کے حق میں ہوتی ہیں' اور اسی طرح دوسروں کی وفاداریاں ان کے مقابلہ میں ہوتی ہیں''۔

پہلے چار رشتوں کے متعلق اصول معین ہیں اور پانچویں کے متعلق تسلیم و رضا ہے وہ باوجود انسان کی بُری خواہشات کے (جو نزاع کا باعث ہوتی ہیں) انسانی فطرت پر بڑا اعتقاد رکھتا تھا اور اعلیٰ کردار کے اشخاص کے نمونوں کی طاقت کی غیر معمولی افادیت پر بھروسہ رکھتا تھا' اس لئے سمجھتا تھا کہ اگر مثالی حکمراں ہو تو مثالی رعایا بھی پیدا ہو جائے گی۔ اس لئے کہتا تھا کہ اگر کوئی بادشاہ بارہ مہینوں کے لئے مجھے اپنی حکومت کا نگران کار بنا دے تو میں یقیناً کامیابی حاصل کر لونگا اور تین سال میں میں ان توقعات کو پورا کر دونگا۔

## اس کے معتقدین

تین ہزار کے منجملہ ستر یا اسّی اس کے ایسے معتقدین تھے جن کو وہ غیر معمولی قابلیت کے علماء کہتا ہے جو ہمیشہ اس کے خدمت میں حاضر رہتے تھے' اور اس کے کردار کی جزئیات کو بھی بہ غور دیکھتے تھے اور اس کے ہر لفظ کو جمع کرتے تھے' ان کا بیان ہے کہ اس نے پرند' مچھلی اور کسی جانور کا کبھی شکار نہیں کیا۔

---

الغرض اس کے مریدوں نے اس کی معمولی معمولی سی حرکات وسکنات کا بھی ذکر کیا ہے' اس کو اپنے مریدوں سے جو محبت تھی اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب اس کا اکلوتا لڑکا کام آیا تو اُس نے صبر کیا' لیکن جب اس کا عزیز پیروین ہوئی ۴۸۱ قبل مسیح میں مرا تو وہ بِلک بِلک کر رونے لگا اور کہہ اُٹھا کہ خدا اسے تباہ کر رہا ہے۔ اس کی وفات سے ایک سال پہلے ۴۷۸ قبل مسیح میں جب اس کا دوسرا شاگرد زیلو (Zelu) مر گیا تو اس کے چار مہینے بعد وہ ایک دن اُٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے کے پاس آیا اور کہنے لگا ''فلک بوس تمام عظیم الشان پہاڑ گر جائیں گے۔ مضبوط شہتیریں ٹوٹ جائیں گی' دانشور ایک تنہ کی طرح سوکھ جائیں گے''۔ زیکو یہ الفاظ سن کر دوڑتا ہوا اس کے پاس گیا تو اُس نے اس کی پچھلی رات کا ایک خواب سنایا جو اس کی موت کا پیش خیمہ تھا اور کہا کوئی سمجھدار حکمران ایسا نہیں پیدا ہوا جو مجھے اپنا معلم بنائے۔ میری موت کا وقت آ چکا ہے' وہ بستر پر دراز ہو گیا اور ساتویں دن وفات پا گیا۔ اس نے کوئی دعا یا الحاح وزاری نہیں کی۔ اس کے شاگردوں نے بڑے تزک واحتشام سے اسے دفن کیا' اور بہتوں نے اس کی قبر کے پاس جھونپڑیاں بنائیں اور رہنے لگے۔ اور تین سال تک بیٹوں کی طرح اس کا ماتم کیا۔ جب سب چلے گئے تو زیکو (جو اس کے تین چہیتیوں میں سے ایک تھا) تنہا مزید تین سال تک قبر کے پاس رہا۔ اس کی موت کی خبر مختلف ممالک میں پہنچی' جس شخص کو زندگی میں نظر انداز کیا گیا تھا وہ موت کے بعد لوگوں کی اتھاہ اور غیر معمولی احترام کا مرکز بن گیا قبر شہر کیو کے باہر ہے جس کے سامنے سنگِ مرمر کا مجسمہ نصب ہے اور اس پر سنگ خاندان کے بادشاہوں کا دیا ہوا حسب ذیل خطاب کندہ ہے:

''بہترین قدیم وحکیم معلّم''

---

اس مقام پر مختلف بادشاہوں کے بے شمار کتبے نصب ہیں' جس میں کنفیوشس کو اعلیٰ خراج عطا کیا گیا ہے جس کے احترام میں China فخر محسوس کرتا ہے' اسی مقام سے قریب اس حکیم کی نسل کے چالیس پچاس ہزار افراد رہتے ہیں۔

## چین پر کنفیوشس مذہب کا اثر اور کتابیں

دو صدیوں کے بعد چین پر سُنگ بادشاہوں کا راج قائم ہوا' جنہوں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر ایک حکومت کو مغلوب کیا' لیکن وہ کنفیوشس کے پیروؤں کو ختم نہ کر سکے۔ اس کیلئے انہوں نے کنفیوشس مذہب کی سوائے ایک کے تمام کتابیں جلا دیں اور سینکڑوں علماء کو زندہ جلا دیا۔ پھر بھی کنفیوشس کو مٹا نہ سکے۔ اس کے بعد جو ھان حکمران آئے تو انہوں نے اس کے نام کی بڑی عزت کی' اور پرانی کتابوں کے واقعات کو جمع کیا۔ کنفیوشس نے کوئی ایسی تحریر نہیں چھوڑی تھی جس میں اپنے اخلاق اور معاشرتی نظام کے اصول بیان کئے ہوں' البتہ اس کے پوتے اور اس کے سب سے زیادہ لائق شاگرد نے دو کتابیں چھوڑی ہیں جن کے نام نظریہ طریق The Doctrine of the Mean, اور عظیم الشان علم Great Learing ہیں۔ جن میں اس مسلکہ کے اُصول اور کنفیوشس کے اقوال درج ہیں۔

''تقریریں اور مکالمات'' وہ مجموعہ ہے جو اس کے متعدد مریدوں نے جمع کیا۔ یہ دراصل اس کے طریقوں اور اقوال کا مجموعہ ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا اس نے اپنے مذہب کی کوئی کتاب نہیں لکھی' کیونکہ وہ الہام کا دعویدار نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں تو صرف ایک پیغام رساں ہوں نہ کہ کوئی معمار۔

لیکن کہا جاتا ہے کہ اس نے تاریخی دستاویزات کی ایک کتاب شوکنگ (Shuking) پر مقدمہ لکھا تھا۔ یہ اس زمانے کی پرانی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ بھی کہا

جاتا ہے کہ اس نے ایک اور کتاب بھی جس کا عنوان (Chunchio) یا بہار و خزاں ہے لکھنی شروع کی تھی۔ جس میں سال کے چار موسموں کے واقعات بیان کرنا مقصود تھا۔ اس کے چند سنہرے اقوال زبان زدِ خاص و عام ہیں:

## کنفیوشس کے سنہرے مقولے

(۱) ہر کہ بر خود مپسندی بر دیگراں مپسند (جو چیز تم اپنے لئے ناپسند کرتے ہو وہ دوسروں کیلئے بھی پسند نہ کرو)

(۲) اعلیٰ (برتر) آدمی جو شئے اپنی ذات میں تلاش کرتا ہے ادنیٰ آدمی وہ دوسروں میں تلاش کرتا ہے۔

(۳) علم بغیر تفکر کے ایک بیکار محبت ہے۔

(۴) وہ فکر جس کی تائید علم نہ کرے خطرناک ہے۔

(۵) آدمی اُصولوں پر غالب آ سکتا ہے لیکن اصول آدمی پر غالب نہیں آ سکتے۔

(۶) محتاط آدمی سے فاش غلطی نہیں ہوتی۔

## کنفیوشی مت کی اہم کتابیں

حکیم کنفیوشس اور اس کے متبعین کی تعلیمات اور ان کا فلسفہ چار کتابوں اور پانچ اعلیٰ صحیفوں میں مدوّن ہے۔(96)

اسی طرح لیوس ہاوڈوس (Lewis Hodous) اپنے مضمون میں لکھتا ہے:

"ہان شاہی خاندان (۲۰۶ قبل مسیح تا ۲۲۰ عیسوی) کے دورِ حکومت میں پانچ اعلیٰ صحیفے مرتب ہوئے ۲۵۲ء میں ان کو پتھر کی تختیوں پر کندہ کیا گیا اور

دار السلطنت میں رکھا گیا' اور اس طرح ایک معیاری اور مستند نسخہ مہیا کیا گیا۔ بعد میں ان پانچ صحیفوں پر چار کتابوں کا اضافہ کیا گیا۔ یہ دونوں مجموعے کنفیوشی مت کی انجیل کے قائم مقام ہیں۔(97)

# اجتماعی حالت

اب ہم ذیل میں کنفیوشی مت کی عام اجتماعی حالت کے جائزہ کے طور پر اس کے قوی اور کمزور پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے۔

## (الف) قوی پہلو

کنفیوشی مت کے قوی پہلو حسب ذیل ہیں:

### (۱) قدامت

یہودی مذہب کو چھوڑ کر بدھ مذہب اور تاؤ مت کی طرح یہ مشرق بعید کا قدیم ترین مذہب ہی نہیں' بلکہ تمام غیر سامی مذاہب میں سب سے زیادہ طاقتور مذہب ہے اور منگولی اقوام کے دائرۂ اثر میں اس کا اقتدار اور اثر غالب ہے۔

### (۲) سیاسی نظریہ

کنفیوشی مت اصل میں ایک سیاسی نظریہ ہے اس لئے اس کی تعلیمات کا اصلی حصہ اچھی حکومت اور اس کے اعمال سے متعلق احکامات اور تعلیمات پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی دائرہ میں اس کا اثر وسیع اور گہرا رہا ہے۔ وہ تقریباً دو ہزار سال تک چین کا سرکاری مذہب رہا' البتہ درمیانی عرصہ میں کچھ مدت کیلئے تاؤ مت اور بدھ مت نے اس کے اس منصب کے چھیننے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن کنفیوشی مت کے برتر سیاسی

فلسفہ کی طاقت سے یہ شکست پا گئے اور موجودہ صدی میں بھی جبکہ جمہوری نظام کے ماتحت لادینی نظریہ کی متابعت میں اس کو سرکاری مذہب کی گدی سے اُتار دیا گیا۔ اس کا چین کی سرکاری اور عوامی زندگی پر اثر ختم نہیں ہوگیا بلکہ حالہ باقی ہے۔

### (۳) تعلیمات کی سادگی

اس مذہب کی تعلیمات بہت سادہ اور لچکدار ہیں جس کا بیشتر حصہ فطری اُصولوں پر مبنی ہے۔

### (۴) اس کی عملداری وسیع ہے

کنفیوشی مت صرف چین کے طول و عرض ہی میں مقبول نہیں ہے بلکہ جاپان میں بھی مقبول ہے جہاں کم ازکم اس کے ایک کروڑ پیرو پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جاپان کے سرکاری مذہب (شنٹو) کی سیاسی تعلیم اور نظریات پر بھی اس مذہب کی سیاسی تعلیم کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہے۔ اس طرح کنفیوشی مت منگولی مذاہب کے خاندان میں بڑا وسیع اور گہرا اثر رکھتا ہے۔

## (ب) کمزور پہلو

اس کے کمزور پہلو حسب ذیل ہے۔

### (۱) مذہب کی کوئی معین اور جامع اساس نہیں

کنفیوشی مت کی کوئی معین اور مضبوط یا جامع اساس نہیں۔ یہ الہام پر مبنی نہیں اس لئے کسی اعلیٰ تر (غیر انسانی والٰہی) وجود کے ازلی و ابدی علم اور مکمل ہدایت کے سرچشمہ سے بھی سیراب نہیں۔

## (۲) تعلیمات کی لچک اور مصالحت پسندی

اپنے اُصولوں کی لچک کے باعث یہ مذہب دوسرے افکار اور عقائد کے مقابلے میں جھک جانے یا مصالحت کرنے پر مجبور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چین میں اسی کے پہلو بہ پہلو دو ہزار سال سے تاؤ مت اور اسلاف پرستی موجود ہیں۔ بعد کے دور میں بھی اولاً بدھ مت اور بعد ازاں اسلام اور عیسائیت چین میں اپنا اثر جما سکے۔ اس کا نتیجہ کنفیوشی مت کی اس لچکدار فطرت سے مل جل کر یہ نکلا کہ کنفیوشی مت کی اصل حقیقت خالص اور بے میل باقی نہ رہ سکی۔ چنانچہ حکومت چین کی وزارت معلومات کا بیان ہے کہ

> ''چینی بحیثیت قوم کے بہت زیادہ مذہبی نہیں ہے۔ بجز ایک چھوٹی اقلیت کے چینی قوم کا عظیم ترین حصہ مذہب کے بارے میں مرنجاں اور رواداری واقع ہوا ہے۔ چنانچہ ایک متوسط چینی اسلاف کی پرستش بھی کرے گا اور بدھ مت کے رسوم میں بھی حصہ لے گا' اور عیسائی عوائد کی بھی پیروی کرے گا' اور ایسا کرتے ہوئے اس کو ذرا بھی تضاد اور منافقت کا احساس نہ ہوگا''۔(98)

## (۳) اس میں روحانیت کا وجود نہیں

حقیقی معنوں میں کنفیوشی مت کوئی مذہب نہیں' کیونکہ اس میں روحانی سکون اور قلبی طمانیت کا وجود نہیں' اس میں ایسی مذہبی عبادات نہیں جو مذاہب کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے حکیم کنفیوشس کی پیش کردہ تعلیمات کی پیروی کر کے کسی قسم کی روحانی تسکین وطمانیت حاصل نہیں ہوسکتی۔

## (۴) اس میں سیاسی استحکام نہیں

اگرچہ کنفیوشی مت تاؤمت کی طرح چین کا مقامی اور قدیم مذہب ہے۔ لیکن اس کو چین میں سیاسی اتار چڑھاؤ کا شکار ہونا پڑا۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ کنفیوشی مت اصلاً ایک سیاسی فلسفہ ہے اس کا یہ حشر تعجب خیز ہے۔ چنانچہ پچھلی تاریخ میں وہ سیاسی حیثیت سے کبھی تاؤمت اور کبھی بدھ مت سے مغلوب ہوتا رہا ۱۹۱۲ء کے بعد پھر اس کو سیاسی زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ اور اب چین پر کمیونسٹ اقتدار کے بعد اس کی حالت مزید خستہ ہوگئی ہے۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب میں کنفیوشی مت ہی ایک ایسا مذہب ہے جو سو فی صد اپنی جنم بھومی میں کمیونزم کے سیاسی فلسفہ کے مقابلے میں کاملاً مفتوح ہو چکا ہے جاپان میں بھی وہ برسر اقتدار نہیں۔ حالانکہ عددی حیثیت سے وہ عیسائیت اور اسلام کے بعد دنیا کا تیسرا بڑا مذہب ہے۔ اس کی اس عددی حیثیت اور موجودہ بے بسی کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ ماننے بغیر چارہ نہیں کہ جس مذہب کی تعلیمات کی واحد بنیاد سیاست تھی وہی اب دنیا کا سیاسی لحاظ سے انتہائی کمزور اور ناقابل لحاظ ہے۔ کیونکہ اس کی لچکدار فطرت اس کے وجود کو دھمکا رہی ہے۔

> "کنفیوشی مت زبردست انجذابی وانضمامی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا ابتدائی مذہب سے ارتقاء ہوا اور اس نے خدائے برتر واعلیٰ شانگٹی قدرت وطن بحیثیت خدا اور اسلاف پرستی کو قبول کرلیا"۔ (۱۹)

## کنفیوشی مت کے پیرووں کی تعداد

اس مذہب کے پیرو چین اور جاپان میں پائے جاتے ہیں۔ چین کے بارے میں ہم آگے تفصیل سے غور کریں گے۔ اولاً جاپان کا تذکرہ کریں گے۔ جاپان میں شنتو

---

مذہب کے بعد بدھ مت' شنٹو مت' تاؤ مت' اسلاف پرستی' عیسائیت اور اسلام بھی پائے جاتے ہیں۔ان کے منجملہ بدھ مت اور کنفیوشی مت کے اثرات جاپان میں نمایاں ہیں' چنانچہ کنفیوشی مت کے اثر کے بارے میں ایک مستند بیان یہ ہے:

ڈاکٹر انووائی (Inowye) موجودہ جاپان پر کنفیوشی مت کے اثر کا یوں خلاصہ پیش کرتے ہیں کہ تیسرے دور کے اختتام کے قریب جو لوگ جاپان کی تعمیر میں حصہ دار تھے ان کی اکثریت کا کنفیوشیوں پر مشتمل ہونا ایک ناقابل تردید واقعہ ہے۔ کنفیوشی مت کی تمام شاخوں کے وانگ یانگ منگ چاؤ یا چنگسی (Chutsze) مکتب نے نئے دور کے اکثر بانیوں کو جنم دیا ہے۔اس امر کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ جس آمادگی سے ہماری قوم نے نئی مغربی تہذیب کو اپنایا ہے وہ زیادہ تر اسی ذہنی تربیت کا نتیجہ تھا جو انہیں کنفیوشی مت کے ٹوگوگاوا عہد میں مطالعہ سے حاصل ہوئی تھی۔(100)

الغرض تمام واقف کاروں کے بیانات کے مطابق جاپان میں کم از کم ایک کروڑ کنفیوشی پائے جاتے ہیں۔

## چین کی اکثریت کنفیوشی ہے

اب ہم ذیل میں متعدد آراء نقل کریں گے جن سے چین میں کنفیوشی مت کی طاقت کا اندازہ ہو سکے گا۔

(۱) چینی تہذیب اسلاف پرستی (یعنی نظام عائلی) کنفیوشی مت (جو اس کے اصولوں کا مجموعہ ہے) بدھ مت اور تاؤ مت پر مبنی ہے۔ان مذاہب کے کٹر طرفدار بھی بمشکل اس امر سے انکار کر سکتے ہیں کہ بدھ مت اور تاؤ مت اخلاقی قوتوں کی حیثیت سے چین میں بالکلیہ زوال پذیر ہیں' اور یہ سلسلہ ایک عرصہ سے جاری ہے۔(101)

(۲) تاہم اکثر چینی اور متعدد مشہور یورپی مصنفین اس عقیدے کے قائل ہیں کہ موجودہ بحران کنفیوشس کے احیاء اور نئی زندگی کا باعث ہوگا۔(102)

(۳) دوسری صدی عیسوی سے لے کر انیسویں اور بیسویں صدی کے اخیر تک چین کی گنجان آبادی کے فکری حلقے میں کنفیوشی مت غیر متزلزل وفاداری برقرار رکھ سکا۔ باوجود بیرونی اور نظری حیثیت سے غیر آہنگ طریقہ زندگی (مثلاً بدھ مذہب کے مہاتی طریقہ کے حملے کے بالآخر کنفیوشی مت اب تک ہمیشہ عوام کے قلوب پر اپنی گرفت کو دوبارہ حاصل کرنے میں ایسی صورت میں کامیاب ہوا ہے جبکہ وقتی طور پر وہ ڈانواڈول ہوگئے تھے۔(103)

## کنفیوشی مت دو ہزار سال تک چین کا سرکاری مذہب رہا

چین پر کنفیوشی مت کے مذکورۂ بالا اثر کا نتیجہ یہ تھا کہ انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ششم کے صفحہ ۲۳۶ کے بیان کے مطابق وہ ۱۹۱۲ء تک چین کا غالب اور سرکاری مذہب رہا جس کی تائید حسب ذیل حوالوں سے ہوتی ہے۔

(۱) شہنشاہ ووٹی (Woti) (۱۴۰ ق۔م تا ۸۷ ق۔م) کے مذہب کی حیثیت سے کنفیوشی مت سرکاری مذہب قرار پایا۔ اور اسی منصب پر ۱۹۱۱ء تک برقرار رہا۔(104)

دو ہزار سال کے دوران میں کنفیوشی مذہب کی مقبولیت اور سرکاری حیثیت کا اندازہ حسب ذیل اقتباس سے ہوگا:۔

(۱) ہان خانوادۂ شاہی کے پہلے شہنشاہ نے ۴۴۲ عیسوی میں کنفیوشی کے مقبرہ کی زیارت کی چوفو کے مقام پر ایک مندر تعمیر کیا گیا جو کنفیوشس کے مقبرہ کے پاس ہے۔ اور ۵۰۵ء میں دارالسلطنت میں ایک معبد بنایا گیا۔ ٹانگ خانوادہ کے ٹائی ٹو سنگ نے (۶۱۸ء) میں کنفیوشی مت کو ایک نئی اساس پر قائم کیا۔

کنفیوشی مت

۶۳۱ء میں اس نے فرمان جاری کیا کہ مملکت کے تمام اضلاع میں کنفیوشس کے مندر تعمیر کئے جائیں جن میں شاہی لباس سے مزین کنفیوشس کے مجسمے نصب ہوں اس نے اس مذہب کو عام بنا دیا۔ ۶۴۷ء میں اس نے کنفیوشی مناور کو طلباء اور سرکاری عہدہ داروں کیلئے شہرت کا ہال بنا دیا۔ دارالسلطنت میں اس نے شاہی کالج قائم کئے جن میں کنفیوشی مت کے مستند کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ان کالجوں کے امتحانات اور خاص امتحانات سرکاری خدمات میں داخل ہونے کا دروازہ تھے۔ اس کے باعث کنفیوشی مت نہ صرف کنفیوشی جماعت کیلئے مرتی بن گیا بلکہ حکومت اور قومیت کی بھی نشانی بن گیا۔ ۶۵۶ء میں کنفیوشس کو بادشاہ کا خطاب دیا گیا۔ ۱۰۱۳ء میں اس کو ''رہنمائے اعظم'' کا خطاب دیا گیا ۱۳۲۰ء میں اس کے اخلاف کو امارت کا درجہ دیا گیا۔ ۱۵۳۰ء کے بعد متعدد کنفیوشی مناور میں تصاویر کے بجائے کتبے نصب کئے گئے تا کہ بت پرستی کا شائبہ نہ ہو۔(105)

(۲) اگر چہ ۱۹۱۲ء میں جمہوریت کے قیام کے بعد کنفیوشی مت کی سرکاری حیثیت باقی نہ رہی لیکن ''حکیم کنفیوشس کی قدر دانی کا ایک اور دور شروع ہوا۔

(۳) صدر جمہوریہ یان شی کئی (Yan Shi Kai) کے تحت (۱۹۱۱ تا ۱۹۱۶) کنفیوشی مت کو مختصر عرصہ کیلئے احیاء نصیب ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں اس نے پیکنگ کے جنوب میں رسم قربانی ادا کی، اور دستور میں کنفیوشی مت کو چینی مملکت کے ساتھ تسلیم کیا گیا۔

(۴) کنفیوشس کے احترام میں جو تقریب منعقد ہوتی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں اس کو زندہ کیا گیا۔ اور کومنتانگ (سرکاری جماعت) کے اعلیٰ عہدہ داروں نے ''چوفو'' کے مقام پر رسومات ادا کئے۔

(۵) کنفیوشی مناور کی درستی عمل میں آئی' قدیم آلات موسیقی بحال کئے گئے' پرانی رسومات کو چین کی اس اسپرٹ کے مطابق تازہ کیا گیا جو موجودہ دنیا میں اپنے منصب کا شعور رکھتی ہے۔ پرانی مستند مذہبی کتابوں کی تعلیم از سر نو جاری ہوئی۔ ''چوفو'' کے مندر کے سرکاری خرچ پر درستی و ترمیم کی تجاویز مرتب ہوئیں۔ ۲۷ اگست کو جو کنفیوشس کی پیدائش کی مبینہ تاریخ ہے قومی تعطیل کا دن قرار دیا گیا۔ اور اس طرح کنفیوشس کے خاندان کے معمر ترین فرد کو سابقہ خطاب کی بجائے ایک نیا لقب عطا کیا گیا۔(106)

مذکورہ بالا شواہد کی روشنی میں حسب ذیل رائے کی تائید کے سوا چارہ نہیں۔

وائی۔ سی یانگ (Y.C.Yang) کے خیال کے مطابق تمام چینی بنیادی طور پر کنفیوشی ہیں' جن میں کسی حد تک بدھ مت اور تاؤ مت کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔

## سیاسی قوت

اگر چہ کثرت آبادی کے لحاظ سے چین کنفیوشی مت کا ملک تھا لیکن اب کمیونسٹ اقتدار کے بعد قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ پوزیشن کیا ہے اسلئے اس ملک کے سیاسی اقتدار کو کنفیوشی مت کے اقتدار کا مظہر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسی طرح چونکہ جاپان میں ان کی اقلیت ہے اور وہ شنٹو اکثریت کا نمائندہ ہے تاہم موجودہ غیر یقینی حالت میں محفوظ طریقہ یہی ہوگا کہ ہم چین کو کنفیوشی مت کا ملک قرار دیں خصوصاً جبکہ قوم پرست چین (فارموسا) کو متحدہ اقوام کی رکنیت حاصل ہے۔

# ہندو مذہب

# HINDUISM

# ہندو مذہب

## ہندو مذہب کی تعریف

اصطلاحی اور علمی زبان میں مذہب کی جو تعریف ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ہندو مذہب کیا ہے اور کن بنیادی عقائد پر یقین رکھنا اس مذہب کے ماننے والے کیلئے لازمی ہے' کیونکہ یہودیت' نصرانیت اور اسلام کی طرح نہ تو اس کے کسی پیغمبر کا وجود ہے نہ کسی ایک الہامی کتاب کا اور نہ کسی معین عقیدہ کا۔

چنانچہ جان کلارک آرچر (John Clark Archur) ہندو مذہب پر اپنے پُر مغز مقالہ میں لکھتا ہے:

"ہندو مذہب اپنے ابہام کے لحاظ سے اوّل تو عہدِ حجر کی ایک نشانی ہے یہ اتنا قدیم ہے"۔

"ہندو مذہب کا کوئی بانی نہیں جو اس کو ایک بنیادی پیغام دے' اس کا کوئی ابتدائی رہنما بھی نہیں جو زردتشت مسیح یا محمد ﷺ کے مقابلہ میں پیش ہو سکے' اگرچہ محمد ﷺ اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی کے زندہ کرنے والے کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ اپنے مشن کو قدیم مشن کی تکمیل کہتے ہیں۔ زردتشت نے اپنے سے پہلے کے قدیم مذہب کی صلاح اور اختصار کو کافی سمجھا۔ لیکن ان میں سے ہر ایک

نے کم از کم ایک ''کتاب حکمت'' انجیل اور قرآن مجید کو پیش کیا۔
ہندو تو حکیم کنفیوشس کی طرح کی بھی کوئی شخصیت نہیں رکھتے جو
پرانے قدیم وموروثی روایات کو پوری طرح مرتب کر سکے۔ واقعہ تو یہ
ہے کہ ہندوؤں کے پاس ایسی کوئی ہستی بھی نہیں ہے جیسی چینیوں
کے پاس وردھمان مہاویر کی ہستی ہے۔ یا بدھ متیوں کے پاس گوتم
ساکھیا منی کی ہے یا سکھوں کے پاس گرو نانک کی ہے۔ ایک معنی
میں ہندو مذہب کے بانی ایک فسانہ ہیں' ان کی مثال ان ابر کے
ٹکڑوں کی سی ہے جو آناً فاناً نظر سے گذر جاتے ہیں اور قوس قزح کا
سماں پیش کرتے ہیں''۔

ہندو مذہب کی تعریف کے سلسلہ میں اوپر جس ابہام اور اشکال کا ذکر کیا گیا ہے اور ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کی طرف ہندو مذہب پر لکھنے والے علماء نے (چاہے مشرقی ہوں یا مغربی' ہندو ہوں یا غیر ہندو) اشارہ کیا ہے۔ ذیل میں ہم بطور مشتے نمونہ از خروارے بعض رائے پیش کرتے ہیں:

(۱) مین (Maine) نے اپنی مشہور ومستند کتاب '' ہندو قانون اور رواج کے گیارھویں ایڈیشن مطبوعہ مدارس بابتہ ۱۹۵۰ء کے صفحہ ۵ پر لکھا ہے:

'' اس قیاس کی فی الحقیقت کوئی بنیاد نہیں ہے کہ ہندو
قانون صرف ان لوگوں سے متعلق ہے جو نہایت ہی تنگ اور محدود
معنی میں ہندو سمجھے جاتے ہیں۔ اس واقعہ سے قطع نظر کہ ہندو مذہب
نے عملاً یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اس میں اس سے زیادہ گنجائش اور لچک
موجود ہے جتنی کہ اس کے عقیدہ یا نظریہ میں پائی جاتی ہے۔ وہ ایسے

ایک دوسرے سے مختلف مذاہب کو باہم ملاتا ہے جیسے کہ ہندو' جین مذہب' اور بدھ مت کے پیرو ہیں اور جو بڑی حد تک ہندو قانون کے ان وسیع خصوصیات کی پیروی کرتے ہیں جو سمرتیوں میں بیان کئے گئے ہیں''۔

(۲) جان کلارک آرچس (John Clark Arches) ہندو مذہب پر اپنے مضمون میں لکھتا ہے:

''ہندو مذہب کی اصطلاح وسیع اور مبہم دونوں ہے۔لیکن کسی بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں ہم اس کو ہندوؤں کے مذہب کے ظاہر کرنے کیلئے استعمال کر سکتے ہیں''۔(107)

(۳) گپتے (Gupte) بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی۔ایڈووکیٹ اپنی کتاب کے صفحہ ۷ پر ''ہندو کون ہیں؟'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔(108)

''اب بڑی عملی اہمیت کا سوال یہ ہے جو مشکلات سے بالکل خالی نہیں ہے' کہ ہندو کون ہیں' ہندو کے نام کی ہیت کی حقیقت معین نہیں ہے۔گذشتہ صدی کے اینگلو انڈین قانون کی زبان میں اس کی بجائے ''جینٹو'' کا لفظ عام طور پر استعمال ہوا ہے۔(109) خود لفظ ہندو کسی قدیم سنسکرت کتاب میں استعمال نہیں ہوا ہے' یہ ایک بیرونی لفظ ہے۔کہا جاتا ہے کہ لفظ ''ہندو'' انڈس یا اندو سے نکلا ہے۔ہندو کا یہ لفظ مسلمانوں نے ان لوگوں کو دیا تھا' جو اس نام کے دریا (دریائے سندھ) کے مشرق میں رہتے تھے۔رفتہ رفتہ یہ لفظ ہندوستان کے ہر باشندے کیلئے استعمال ہونے لگا۔حرفی

حیثیت سے اب اس کے معنی ہندوستان کے ہر ایک باشندے کے ہیں۔ لیکن اس لفظ کی صرفی ترتیب سے ہمیں اس سوال کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم (مثلاً) ہندوستان کے مسلمان باشندوں پر بھی ہندوؤں کے قانون کو مسلّط کر دیں''۔

(۴) پنڈت جواہر لال نہرو (The Discovery of India) کے صفحہ ۳۷ پر لکھتے ہیں:

''عقیدہ اور مذہب کی حیثیت سے ہندو مذہب غیر معین اور مبہم بے شکل اور مختلف پہلو رکھتا ہے' ہر شخص اپنے مطلب کے مطابق ہر چیز پا سکتا ہے' اس کی تعریف کرنا (یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ لفظ کے معمولی معنی میں یہ کہنا کہ یہ مذہب ہے یا نہیں ہے) تقریباً ناممکن ہے۔ اس کی موجودہ شکل میں (بلکہ اس کی سابقہ شکل میں بھی) اس میں اعلیٰ ترین عقائد اور رسومات سے لے کر ادنیٰ ترین عقائد اور رسومات تک شامل تھے جو بیشتر صورتوں میں ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد تھے''۔

اصل یہ ہے کہ ہندو مذہب شدید اور متعصب قومیت کا دوسرا نام ہے' جو لوگ بھارت کے علاقے میں بستے' اس کو اپنا مقدس وطن سمجھتے ہیں اور اس کی ہر شئے سے (چاہے پہاڑ ہوں یا دریا ہوں' موسم ہو یا تاریخی شخصیتیں) والہانہ محبت رکھتے ہیں' وہ ہندو ہیں ان میں آریائی' غیر آریائی' بت پرست' دہریئے' تنویت کے قائل اور موحد سبھی شامل ہیں۔ اس لئے ہندو مذہب کا اصلی معیار اعتقادات یا عبادات نہیں' بلکہ تمدنی اور سیاسی زندگی کا وہ مخصوص نقطہ نظر ہے جس کی بنیاد آریائی نسل کی برتری' ورن آشرم

(ذات پات) اور مادرِ وطن سے مجنونانہ محبت کے جذبہ پر قائم ہے' جو شخص بھی بھارت کو اپنی غیر متزلزل عقیدت کا محور بنا لے' وہ ہندو ہے۔ شدید وطن پرستی کا یہی انتہا پسندانہ جذبہ ہندوستان کے قومی ترانے ''بندے ماترم'' (اے ماں میں تری پُوجا کرتا ہوں) میں ظاہر ہوا ہے چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب (The Discovery of India) کے صفحہ ۱۲۹ پر لکھتے ہیں۔

''ایک معمولی اور اوسط ہندوستانی کیلئے پورا ہندوستان ایک قسم کا ''پونیا بھومی'' مقدس سرزمین تھا' اور آنحالیکہ بقیہ دنیا بڑی حد تک ملیچھوں اور وحشیوں کی بستی تھی''۔

اسی مقدس سرزمین سے غیر معمولی عقیدت' وفاداری کی وضاحت کیلئے ان کی ایک تقریر سے بڑی مدد ملتی ہے:

''نئی دہلی ۱۶ اگست ۵۷ء آج رام لیلا کے میدان میں ۱۸۵۷ء کی تقریبات کے سلسلے میں پنڈت نہرو نے اپنی تقریر کے دوران میں حاضرین سے سوال کیا کہ آپ کی وفاداریاں کس سے ہیں' اپنے ذاتی مفاد سے' زبان سے' مذہب سے صوبہ سے یا اس عظیم ملک ہندوستان سے؟ اس کے جواب میں ہزاروں حاضرین جلسہ نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم ملک کے وفادار ہیں''۔

قومی زبان ۱۷۔ اگست ۱۹۵۷ء

چنانچہ ہندو مذہب کی پُرانی کتابوں گیتا وغیرہ کو دیکھنے سے بہ آسانی مذکورہ بالا خیال کی تائید ہوتی ہے' کہ کس طرح بتدریج یہ قومیت پرستی ایک کٹر عقیدہ کی صورت اختیار کر گئی' ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ قومیت پرستی کوئی

ہندو مذہب

بُری چیز نہیں ہے' لیکن انہیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ جب قوم پرستی یا نسل پرستی ایک مذہب کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ ایک ایسی چنگیزیت بن جاتی ہے جس کی خون آشامی کی ایک ادنیٰ مثال نازی جرمنی کی آریائی نسلی برتری کا فلسفہ تھا' لیکن سوائستکار (اس لفظ کی ہندوستانی اور آریائی نسبت پر غور کیجئے) کا نظریہ بہر حال عیسائی مذہب کی اخلاقی تعلیم سے کسی نہ کسی حد تک متاثر تھا اس لئے نسل پرستی کا یہ جنون ایک حد تک پابند تھا لیکن ہندوستانی قومیت پرستی کا یہ نظریہ کسی مذہب و اخلاق کے لازمی قیود و شرائط سے بے نیاز و بے پرواہ ہونے کے باعث انتہائی خطرناک اور جارحانہ بن جاتا ہے' اس لئے اس امر کا سمجھنا مشکل نہیں کہ ہندو مذہب دیگر مذاہب کی طرح اس اخلاقی اساس سے محروم ہے جو فرد اور جماعت کے جذبات اور خواہشات کو حد اعتدال پر رکھنے کی بڑی ضمانت ہوتا ہے' اس کی تائید میں ہم گائی وینٹ (Gay Wint) کی رائے پیش کریں گے جو بھارت کا بہت بڑا دوست ہے اور جس کی زیر حوالہ کتاب نے ہندوستان کے سیاسی مفاد کو بہت آگے بڑھایا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''ہندو مذہب ایسا نظامِ افکار ہے جس نے ہندو سوسائٹی میں نشوونما پائی اور جس میں صدی بصدی اضافہ ہوتا رہا' اس میں متعدد دبستانِ فکر شامل ہیں۔ ذیل میں ہم نے ان کے مشترک عناصر کی تفصیل پیش کی ہے''۔ (110)

چنانچہ آگے چل کر وہ اس کی یوں تفصیل پیش کرتا ہے:-

''عام طور پر ایک تیسرا نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے کہ ہندو مذہب ضابطہء اخلاق کو بالائے طاق رکھتا ہے' ہر چیز یہاں تک کہ بُری چیز بھی بھلائی کا حصہ ہے۔ برائیاں (جیسا کہ عام طور پر ان کو سمجھا جاتا ہے) بمشکل پائی جاتی ہیں۔ ضابطہء اخلاق کی طرف سے بے پرواہی ایسے عقیدہ کا قدرتی نتیجہ ہے کہ تمام خارجی دنیا ایک دھوکہ ہے' کیونکہ مایا کی دنیا

میں اخلاقی وجوب بذاتِ خود ایک سایہ ہے۔ اس صدی کے ایک کٹر قوم پرست ملک کے متعلق (جو مسٹر گاندھی کے پیش رو تھے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ سیاسیات مردانہ کھیلوں کی ایک قسم ہے جس کا کوئی تعلق اخلاق سے نہیں جیسا کہ مغرب میں سمجھا جاتا ہے"۔(111)

بہر حال خود ہندو مذہب کے عالی دماغ رہنماؤں مثلاً بھارت کے موجودہ نائب صدر جمہوریہ سر رادھا کرشنن کی تحریرات سے یہ امر ثابت ہے کہ وہ اس بدھ مت کو بھی ہندو مذہب میں داخل سمجھتے ہیں جس کا ہندوؤں نے دیس نکالا کیا۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ ہندوستان کے متعدد ہائی کورٹوں اور پریوی کونسل کا بے شمار فیصلوں میں طے کیا گیا ہے کہ بدھ مذہب' جین مت اور سکھ مذاہب کے پیرو دھرم شاستر کے پیرو سمجھے جاویں گے۔ اس تضاد سے ناظرین حیران نہ ہوں کیونکہ تضاد ہندو مذہب کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق ہندو اہل قلم یوں لکھتے ہیں:۔

> "اس حقیقت پر زور دینا ضروری نہیں کہ پورے' ویدک ادب میں جو سمتیوں' پرانوں اور اپنشدوں پر مشتمل ہے' ہم ایسے دو خیالات کی رو پاتے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف اور متوازی ہیں' کبھی ایک غالب رہتا ہے اور کبھی دوسرا ایک کے تحت حیوانوں کی قربانی کا حکم دیا جاتا ہے اور دوسرا اس کو منع کرتا ہے' اس بناء پر یہ امر واضح ہے کہ ہندو فکر کے بالکل آغاز ہی سے اہمسا دھرم اور اس کا مقابل خیال دونوں غلبہ کیلئے جدوجہد کرتے رہے ہیں"۔(112)

لیبل گرفن نے اپنی مشہور کتاب Ruler of India میں بڑی عمدہ بات کہی

ہے'' ہندو کسی قوم کا کیوں نہ ہو شاعر کی طرح مادرزاد ہندو ہوتا ہے۔ اس کی پیدائشی حیثیت میں کبھی فرق نہیں آتا''۔ کتاب رنجیت سنگھ مترجمہ نظیر حسین فاروقی شائع کردہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ ۱۹۲۲ء۔

ہندو مذہب کی اس وسیع تعریف سے گو اس امر کے سمجھنے میں مدد نہ ملے کہ ہندو مذہب کا چیستان کیا ہے' لیکن اس امر کے سمجھنے میں ضرور مدد ملتی ہے کہ اس وسیع ترین تعریف کے ہم رنگ ذہن جال میں مختلف عقائد کے ان تمام اشخاص کو داخل کرلیا ہے جو کامیاب مقاومت نہ کر سکے۔ انہیں معنی میں مورخین نے ہندو مذہب کو'' اکال الامم'' کہا ہے۔ چنانچہ خود پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب (The Discovery of India) کے صفحہ ۷۳ پر لکھتے ہیں:

> '' ڈاڈول (Dodwell) کے قول کے مطابق ہندوستان سمندر ہی کی طرح ہضم کرنے والا ہے''۔

لیبل گرفن اپنی مشہور کتاب رنجیت سنگھ (مترجمہ نظیر حسین فاروقی شائع کردہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن بابت ۱۹۲۲ء کے صفحہ ۱۶ پر لکھتا ہے۔

> '' اس کی (ہندو) تاثیر عشق پیچاں کے بیل کی سی ہے' جو ایک بار اس کی گرفت میں آ گیا' اسے جکڑ کے دبوچ لیا' اس نے تمام مذاہب کو جیسے سکھ اور بدھ مذہب یہ دونوں ہندو مذہب کی اتحادی صورتیں تھیں جب برسر مقابلہ ہوئیں تو تقریباً خاتمہ کر دیا۔ مغرب میں رومی کلیسا کی جو حالت ہے وہی مشرق میں ہندو دھرم کی ہے''۔

ہندو مذہب کی حقیقت کو سمجھنے کے سلسلے میں ہم جان کلارک آرچر (John Clark Archer) کی حسب ذیل رائے کے آخری اقتباس کا حوالہ کافی سمجھتے ہیں' جو

اس نے کتاب (The Great Religions of Modern World) کے صفحہ ۴۵ پر ظاہر کی ہے:۔

''ہندو مذہب اپنے ابہام میں اولاً تو حجری دور کی علامت ہے۔ ہندو مذہب کا کوئی بانی نہیں جو اس کو کوئی بنیادی پیغام عطا کرتا۔ ابتدائی دور میں اس کا کوئی قائد بھی نہ تھا جو لاوتے' حضرت عیسیٰ یا حضرت محمد ﷺ کے مماثل ہو۔ اگرچہ محمد ﷺ اپنے آپ کو دین حنیفی کو زندہ کرنے والے بتاتے ہیں اور حضرت عیسیٰ اپنے پیغام کی تکمیل کے داعی ہیں اور حکیم زردشت تو اپنے پیش رُو مذہب کو آلائشوں سے پاک کرنے کے دعویدار ہیں' لیکن ان میں سے ہر ایک اپنے وقت میں ''کتاب حکمت'' 'انجیل اور'' الکتاب'' سے فیضیاب رہا۔ ہندو تو کنفیوشیوں سے بھی گئے گذرے ہیں کیونکہ کنفیوشس قدیم روایات کو مدوّن کر سکا۔ حقیقت حال تو یہ ہے کہ ہندوؤں کو کوئی ایسی شخصیت بھی نہ مل سکی جیسی کہ چینیوں کو وردھمان مہاویر کی ذات میں اور بدھ متیوں کو ساکھیامتی گوتم بدھ کی صورت میں' یا سکھوں کو گرونانک کی صورت میں ملی۔ ایک معنی میں ہندو مذہب کے بانیوں کے ذات ایک فسانہ ہے۔ ان شخصیتیں'' بادل کے پیغامبروں'' کی طرح جو متغیر نوعیت اور بے قرار مزاج رکھتے ہیں' خود بھی سایہ اور سراب کی حیثیت رکھتے ہیں''۔

بہرحال تقسیم ہند سے پہلے جن لوگوں کو مردم شماری کی رپورٹوں میں ۱۸۸۱ء سے لے کر ۱۹۴۱ء تک ہندوؤں کی تعداد میں شامل کیا گیا تھا وہ سب کے سب حقیقی معنی

میں ہندو نہیں تھے، بلکہ انہیں وسیع معنوں میں صرف سیاسی اغراض کیلئے ان سب کو ہندو ظاہر کیا گیا تھا۔

## ہندوؤں کی تاریخ

جب ۲۰۰۰ ق م سے ہندوستان میں آریائی قبیلے آ کر آباد ہونے شروع ہوئے تو وہ اپنے ساتھ کچھ ایسے مذہبی عقائد بھی لائے جو یہاں کی قدیم آبادی کے مذہبی عقائد سے مختلف تھے۔ ۲۰۰۰ ق م سے ۵۰۰ ق م کے عرصے میں ان آریائی لوگوں نے اپنے مذہبی عقائد کو جن کے بنیادی عناصر قدرت کی عبادت پر رکھی گئی تھیں ایک ایسی مستقل شکل دے دی جو ہندو مذہب کہلائی اور جس نے ہندوستان کی سماجی اقتصادی اور سیاسی تاریخ پر بہت گہرے اثرات قائم کیے۔ ہندو مذہب کا کوئی ایک بانی نہیں تھا۔ جس طرح بدھ مت کے بانی گوتم بدھ، زردتشت مذہب کے بانی زردتشت تھے بلکہ اس کے عقائد اور تعلیمات کو بھجن اور گیتوں کے ذریعہ پھیلایا گیا اور جن کے لکھنے اور یاد رکھنے والے رشی (استاد) کہلائے "رگ وید" جس میں دیوتاؤں کی شان میں بھجن اور گیت لکھے گئے تھے کسی خاص رشی کی تصنیف نہیں تھی بلکہ وقتاً فوقتاً اس میں اضافہ ہوتا رہا تھا اور اس کی تصنیف میں مختلف رسیوں نے حصہ لیا تھا۔

## ویدک مذہب

وسط ایشیا میں آریائی نسل کے لوگ زمینوں کی کاشت کرنے لگے تھے اور بعد میں یہ زمینوں کی تلاش میں جنوبی ایشیا اور مغربی میں پھیل گئے تھے اس لئے یہ جہاں بھی گئے انہوں نے کاشتکاری کو ہی پیشہ کے طور پر اپنایا چنانچہ ہندوستان میں بھی جب یہ آریائی قبیلے پنجاب میں آباد ہو گئے تو ان کے مذہبی عقائد پر وہی عناصر قدرت چھائے

رہے تھے جو کاشتکاری کیلئے ضروری تھے۔ ورنہ آسمان کا دیوتا' اندرا بارش کا دیوتا' سوریہ سورج کا دیوتا' اور پرتھوی زمین کا دیوتا' خاص طور پر عبادت کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ لیکن جب آریائی لوگوں کو ہندوستان کے قدیم باشندوں سے مستقل جنگیں کرنی پڑیں تو انہوں نے اپنے سب سے اہم دیوتا اندرا کو جنگ کے دیوتا کی حیثیت سے بھی پوجنا شروع کر دیا۔ اور دشمنوں کو شکست دینے کیلئے اندرا کی تعریف اور شان میں بھجنوں اور گیتوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ اور طرح طرح کی قربانیں دی جانے لگیں۔ اس زمانے میں ویدک مذہب میں وہ تمام پیچیدگیاں نہیں تھیں جو بعد میں ہندو مذہب کا جزو بن گئی تھیں۔ شروع میں تو دیوتاؤں کو خوش رکھنے کیلئے قربانیاں دینے اور عبادت کرنے کی ذمہ داریاں ایک مخصوص گروہ کے سپرد ہو گئیں جو بعد میں برہمن کہلائے۔ اگرچہ ویدک مذہب میں دیوتاؤں کے متعلق یہ عقیدہ تھا کہ وہ انسانی شکل و صورت کے ہیں اور ان کی اکثر ضروریات انسانی ضروریات سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن یہ دیوتا چونکہ عناصر قدرت پر حاوی تھے اس لئے انسانوں سے برتر تھے۔ وہ انسانوں کو فائدے بھی پہنچا سکتے تھے اور نقصان بھی۔ اس لئے انہیں دنیاوی اطمینان' سکون اور کامیابی کی خاطر خوش رکھنا ضروری تھا۔ موت کے بعد کی زندگی کا تصور اس ابتدائی دور میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ تناسخ الارواح REINCARNATION OF SOUL کا عقیدہ جو بعد میں ہندو مذہب کے فلسفہ کی بنیاد بن گیا ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا۔ ویدک ادب سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ہندو مذہب کی ابتداء تو بہت سے دیوتاؤں پر عقیدہ رکھنے سے ہوئی۔ لیکن اس کی بتدریج ترقی کے ساتھ ساتھ کائنات کی تخلیق' خالق کا تصور اور زندگی کے مقاصد کی بھی وضاحت ہوتی گئی اور ان تصورات نے فلسفہ کی شکل اختیار کر لی۔ اس مذہب پر اور مذہب کے فلسفہ پر ایک مخصوص گروہ برہمنوں کی

اجارہ داری قائم رہی لہذا انہوں نے ان تصورات کو اپنے ذاتی مفادات' ترقی اور برتری کے لئے استعمال کیا۔ اور انہوں نے اپنی حیثیت خالق اور مخلوق کے درمیان ثالث کی سی بنالی' مذہب میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی گئیں اور مذہب کی ہر گرہ کھولنے کیلئے برہمنوں کی مدد کی ضرورت پڑنے لگی لیکن یہ بس بعد کی باتیں ہیں۔ ویدک زمانہ کے مذہبی عقیدوں کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اس زمانہ میں عناصر قدرت کی عبادت کی جاتی تھی اور انہیں دیوتاؤں کی حیثیت دی گئی تھی۔ ان دیوتاؤں میں درنا (آسمان کا دیوتا) اور پرتھوی (زمین کا دیوتا) خاص سمجھے جاتے تھے۔ ان کی تعریف میں اور انہیں خوش رکھنے کیلئے گھی دودھ' مکھن' اناج اور گوشت کی قربانیں دی جاتی تھیں۔

(۲) عبادت اور قربانیوں کی ذمہ داری خاندان یا قبیلے کے سربراہ کی تھی لیکن رفتہ رفتہ برہمنوں کی اہمیت بڑھ رہی تھی۔

(۳) پیشوں کے اعتبار سے آریائی لوگ فرقوں میں تقسیم ہونے شروع ہو گئے تھے لیکن یہ تقسیم بہت زیادہ سخت نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانہ میں جنگجو لوگوں کو برہمنوں پر فوقیت حاصل تھی لیکن ہندوستان کے اصل باشندوں کو غلام شودر بنا لیا گیا تھا جن کے لئے آریائی مذہب میں شامل ہونا ناممکن تھا۔

## اپنشد فلسفہ

یہ زمانہ چونکہ فتوحات کا زمانہ تھا اس لئے مذہبی عقائد میں باریکیاں نکالنے اور فلسفیانہ انداز میں پیدا کرنے کی فرصت نہیں تھی لیکن جب آریائی قبیلے پنجاب سے اُتر کر شمالی ہند میں آباد ہوئے اور انہوں نے اپنی ریاستوں کی بنیادیں ڈالیں اور

مقابلتاً امن وامان کی زندگی بسر کرنے لگے تو رفتہ رفتہ ویدک زمانہ کی سادگی ختم ہوگئی اور مذہب پر برہمنوں کی اجارہ داری قائم ہونے لگی۔ ویدک زمانہ میں دیوتاؤں کی عبادت کا مقصد دنیاوی خوش حالی اور زندگی میں دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ لیکن اب یہ تصور پیدا ہوا کہ کوئی ایسی ہستی بھی ہے جس نے انسان اور دیوتاؤں کی تخلیق کی ہے۔ جو انسان کی روح پر اس کے مرنے کے بعد بھی اختیار رکھتی ہے اور جو انسان کے اعمال پرکھ کر سزا و جزا دینے کی قوت رکھتی ہے (وہ مسائل جو انسان کی زندگی میں یا اس کے مرنے کے بعد اسے پیش کرتے ہیں کتابوں کی صورت میں نثر میں ۸۰۰ ق' م سے ۶۰۰ ق' م تک کے عرصے میں لکھے گئے اور ان کتابوں کو اپنشد کہا گیا[1] ان کتابوں میں دنیا کی تخلیق کے تخلیق کائنات کے خالق کے متعلق زندگی کی تکالیف اور مصائب کے متعلق اور ان غموں مشکلات اور مصائب کو ختم کرنے کے متعلق فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان کتابوں کا اندازِ تحریر ایسا ہے جیسے کوئی استاد (رشی) اپنے شاگرد کو سبق پڑھا رہا ہے۔ اور یہ مسائل سمجھا رہا ہے۔ یہ اُپنشد فلسفہ ہندو مذہب کی بنیاد بن گیا اور اس نے ویدک تصورات میں زبردست تبدیلیاں کر دیں۔ اس فلسفہ نے جن اہم خیالات کی اشاعت کی وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) ایک ایسی روح ضرور ہے جس نے کائنات کو دیوتاؤں کو اور تمام ارواح کو پیدا کیا' تمام روحیں اسی سے وجود میں آئیں ہیں اور آخر میں انہیں اسی سے مل جانا ہے۔ اسی پرآتما (سب کی روحیں کا نام برہما رکھا گیا اور اس طرح برہما کو کائنات کی ہر چیز اور ہر ہستی کا خالق مانا گیا)۔

(۲) برہما کا کام صرف تخلیق ہے' کائنات کی ہر شئے اور ہستی کو قائم رکھنا دوسرے بڑے دیوتا وشنو کے سپرد ہے۔ لہذا برہما کے ساتھ وشنو کی عبادت بھی لازمی

---

[1] ہندو مذہب

قرار دی گئی۔ برہما اور وشنو کے کام کو تباہ و برباد کرنا تیسرے بڑے دیوتا کا کام ہے یہ موت اور تباہی کا دیوتا شیو کہلایا اور اس طرح تین دیوتاؤں کا وجود زندگی اور کائنات کیلئے ضروری قرار دیا گیا۔ تخلیق کرنا تخلیق کو برقرار رکھنا اور تخلیق کو ختم کر دینا صرف ایک ہستی کے نہیں بلکہ تین مختلف ہستیوں کے کام قرار دیئے گئے لیکن سب سے زیادہ اہمیت تخلیق کے کام کی ہی رکھی گئی۔

۳) برہما' وشنو اور شیو کے علاوہ پرانے دیوتاؤں میں اندرا اور دیگر بہت سے دیوتاؤں کی عبادت برقرار رکھی گئی اور اس طرح ہندو مذہب میں بتوں کی شکل میں لاتعداد اور دیوتاؤں کی عبادت اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے قربانیاں دینے اور منتر پڑھوانے کو ضروری سمجھا گیا۔

۴) کائنات کی ہر ہستی اور روح کا آخری مقصد پرآتما یا برہما سے مل جانا قرار دیا گیا جب برہما نے کسی ہستی کو تخلیق کر دیا تو پھر یہ اس ہستی کے اعمال پر منحصر ہے کہ اس کی روح پرآتما سے جلد مل جائے یا مختلف جنم لینے کے بعد ملے اعمال اگر اچھے ہوں تو روح آئندہ جنم میں بہتر قالبِ ظہور میں آئے گی لیکن اگر اعمال خراب ہیں تو آئندہ جنم میں روح کو بھی خراب قالب دیا جائے گا اس طرح آواگون یا تناسخ الارواح (REINCRNATION OF THE SOUL) کے عقیدے کو ماننا لازمی قرار دیا گیا برہما سے سب سے زیادہ قریبی تعلق جن روحوں کا قرار دیا گیا وہ برہمنوں کی روحیں ہیں۔ برہمن کی روح زندگی کے چکر میں (WHEEL OF LIFE) میں سب سے اونچے مقام پر ہے اور شودر کی روح سب سے نیچے مقام پر۔ شودر اپنے گناہوں کی سزا دوسرے جنموں میں بھگت رہے ہیں اور برہمن اگلے جنم میں

پرآتما سے ملنے والے ہیں ویش اور کھشتری' برہمنوں اور شودروں کے درمیان ہیں اور انہیں پرآتما پہنچنے کیلئے زندگی کے کئی چکر کرنے ہیں۔ گناہوں سے معافی مانگنے اور زندگی کے ان چکروں سے جلد چھٹکارہ حاصل کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ دیوتاؤں پر قربانیں چڑھائیں۔ منتر پڑھے جائیں اور مندروں اور برہمنوں کی خدمت کی جائے۔

## ذات پات کی تقسیم

آواگون یا تناسخ الارواح کے نظریہ نے ہندو معاشرہ میں ذات پات کی بندشوں کو لازی قرار دیا۔ پہلے تو ذات پات کی تقسیم پیشوں کے اعتبار سے تھی۔ اب مذہبی ضروریات کی بناء پر یہ تقسیم ناگزیر سمجھی گئی۔ سب سے اعلیٰ طبقہ میں برہمن شمار کئے گئے جو مذہب اور تعلیم کے اجارہ دار تھے۔ ان کے بعد کھشتری تھے جو حکومت کرنے اور جنگوں میں حصہ لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن جنہیں اپنے اعمال سے اگلے جنم میں برہمن بننا تھا۔ ان کے بعد ویش قرار دیئے گئے جو زراعت' تجارت اور صنعت و حرفت کے پیشوں کو اختیار کئے ہوئے تھے۔ ویش کے بعد شودر جو انسانی زندگی کے چکر میں سب سے کمتر مقام پر ہیں اور جن کی حیثیت غلاموں سے بدتر ہے۔ ذات پات کی بندشوں کے مندرجہ ذیل اثرات ہوئے۔

(الف) ایک ذات کا آدمی دوسری ذات میں شادی نہیں کر سکتا۔

(ب) اونچی ذات کا آدمی کسی نیچی ذات کے آدمی کے یہاں نہ کچھ کھا سکتا ہے اور نہ پی سکتا ہے۔

(ج) اگر اونچی ذات کا آدمی کسی نیچی ذات کے آدمی سے ملاقات کرنے یا بات

---

کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ بعد میں اپنے آپ کو رسومات کے ذریعہ سے پاک اور پوتر کرے۔

(د) اگر کوئی شخص ذات پات کے قوانین کی پابندی نہ کرے تو اُسے ذات سے خارج کر دیا جاتا ہے اور معاشرہ میں اس کا کوئی مقام نہیں رہتا۔

اس ذات پات کی تقسیم کے اثرات ہندو مذہب اور قوم پر پڑنے لازمی تھے۔ پوری قوم مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کا کوئی قومی کردار نہیں رہا۔ اور عام لوگ برہمنوں کے رحم و کرم پر ہو گئے۔ مذہبی‘ سماجی اور سیاسی تقسیم نے ملک کی طاقت کو ختم کر دیا اور باہر کے حملہ آوروں کا ہمیشہ نیچی ذات کے لوگوں نے استقبال کیا۔ اور انہوں نے مذہبی اور سیاسی تبدیلی کو پسند کیا جب اس ذات پات کی تقسیم سے ہٹ کر بدھ مذہب کی اشاعت کی گئی تو وہ بہت جلد ہندوستان میں مقبول ہو گیا اور برہمنوں کے علاوہ اسے سب نے قبول کر لیا۔ ہندو مذہب کی بنیادی کمزوری اس ذات پات کی تقسیم میں تھی کہ جس نے ملک کے آبادی کو ایک بڑے حصہ کو معاشرہ میں کوئی مقام نہیں دیا تھا اور یہ شودر تھے۔ ویش ذات کے لوگ اگرچہ ملک کی اقتصادیات کے ذمہ دار تھے۔ وہی تمام اشیاء پیدا کرتے تھے اور ان کی تجارت کرتے تھے لیکن انہیں مذہبی اعتبار سے کمتر ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور وہ اعلیٰ ذات کے لوگوں سے معاشرتی اور مذہبی تعلقات نہیں رکھ سکتے تھے۔ موجودہ زمانے میں بھی ہندو مذہب میں یہ عقائد موجود ہیں ان میں تھوڑی بہت ترمیم بعض مذہبی رہنماؤں کی تعلیمات کی بناء پر ہوگئی ہے حتیٰ کہ اسے تبلیغی مذہب بنانے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور آریہ سماجی فرقہ نے ہندوستان میں شدھی کی تحریک چلا رکھی ہے لیکن ہندو مذہب کی اشاعت اور تبلیغ میں جبر اور طاقت کا زیادہ دخل ہے۔ یہ عیسائیت یا اسلام کی طرح اپنی

تعلیمات کے زور پر پھیلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ اس کی تعلیمات کا انجام ذات پات کی بندش پر ہے جو انسانی مساوات رواداری اور بھلائی کے اصولوں کے منافی ہے ہندو مذہب پر برہمنوں کی اجارہ داری قائم ہونے کا مطلب یہ تھا کہ مذہبی علوم پر عبادات اور رسومات پر برہمنوں کا اقتدار مستقل طور پر قائم ہو گیا۔ مندروں میں بہت سے دیوتاؤں کی پرستش عام ہو گئی اور زندگی کے چکر سے نجات حاصل کرنے کیلئے اور دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے رسومات اور قربانیوں کو مذہب کا لازمی جزو سمجھ لیا گیا اور یہ قربانیاں اور رسومات اس قدر بڑھیں کہ کئی کئی سال ان کے سلسلے قائم رہنے لگے۔ یوگا کی قربانیاں اور رسومات ۱۲ سال تک کی جانے لگیں جن میں سینکڑوں برہمن شرکت کرتے تھے اور جس میں ہزاروں من گھی اور جانوروں کا گوشت نذر آتش کیا جانے لگا۔ ان رسومات کے خلاف سب سے زیادہ موثر آواز کوروؤں اور پانڈوں کے زمانے میں کرشن جی نے بلند کی۔ کرشن جی کی تعلیمات جو بھگوت گیتا کی شکل میں موجود ہیں برہمنوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور لامتناہی رسومات کے خلاف ہیں اور جن میں قومی اور مذہبی اتحاد پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن کرشن کو اوتار بنا کر اور اس کی عبادت کر کے برہمنوں نے اس کی تعلیمات کے اثرات کو بالکل زائل کر دیا۔

ہندو مذہب کی پیچیدگیوں اور رسومات اور قربانیوں کی زیادتی نے اکثر لوگوں کو مذہب سے بغاوت پر اُکسایا۔ ہندو مذہب سے اختلافات اور بغاوت کے طور پر جو دو مذاہب ہندوستان میں کامیاب ہوئے وہ جینی اور بدھ مذاہب تھے۔ ان دونوں مذاہب کی سادگی اور اصول ان کی ترقی کا باعث ہوئے۔ بدھ مذہب تو ہندوستان کا قومی مذہب بن گیا اور اشوک اور کنشک جیسے راجاؤں کی سرپرستی میں نہ صرف ہندوستان میں پھیلا بلکہ تبت، لنکا اور چین تک اس کی اشاعت ہوئی اور تیسری

صدی ق م میں یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہندو مذہب کا نام ونشان ہندوستان سے ختم ہو جائے گا۔ لیکن بدھ مذہب کے اندر اختلافات رونما ہونے لگے اور گوتم بدھ کی تعلیمات سے انحراف کیا جانے لگا۔ برہمنوں کو بدھ مذہب کی کمزوری سے فائدہ اُٹھانے کا موقعہ مل گیا اور انہوں نے اپنے اثرات اس مذہب پر بھی قائم کر لئے۔ مہاتما بدھ کو اوتار مان کر ان کی عبادت کی جانے لگی اور برہمنوں نے بڑی حد تک بدھ مذہب کو ہندو مذہب میں جذب کر لیا۔ ہندوستان میں بدھ مذہب کے زوال کے بعد پھر برہمنوں کا اور ہندو مذہب کا عروج ہو گیا جو مسلمانوں کے حملہ تک قائم رہا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات آٹھویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ سے زیادہ سیاسی اقتدار اور فتوحات کی طرف توجہ دی پھر بھی ہندوستان میں اسلام کی اشاعت درویشوں' بزرگانِ دین اور مذہبی رہنماؤں نے کی جن کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی لیکن مسلمانوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد پھر ہندو مذہب کو ترقی کا موقع مل گیا اور مسلمانوں کے مقابلہ میں انگریزوں کی سرپرستی میں ہندو مذہب کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں۔ انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہندوستان کی تقسیم پر ہوا جو مذہبی اختلافات کی بناء پر کیا گیا۔ ہندوستان کی یہ تقسیم ہندو مذہب اور مسلمان حکمرانوں کی بنیادی کمزوریوں کے نتیجہ کے طور پر ہوئی۔

جو کچھ آج مسلمانوں یا دیگر مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ بھارت میں کیا جا رہا ہے' وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ پرانی تاریخ کا اعادہ ہے۔ ۱۹۴۷ء سے ہزاروں سال پہلے کی تاریخ میں جس طرح تنگ نظر پر برہمنی مذہب نے بدھ مذہب کا صفایا کیا' اس سے تاریخ کا ہر طالب علم اچھی طرح واقف ہے۔ گذشتہ ایک ہزار سال

میں وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے محکوم رہے' اس لئے ان کا تعصب دبا رہا' لیکن مسلمانوں کے آخری دور میں جبکہ سلطنت مغلیہ کمزور ہو گئی تھی' اور انگریزوں کا پورا عمل دخل ہندوستان پر نہ ہوا تھا' انہوں نے جو کچھ کیا اس کا ایک نمونہ یہ ہے:

''دہلی اور دیگر اسلامی بستیوں کی بربادی''

''بلہ بول کر ایک بڑی بھیڑ کے ساتھ باطمینان تمام دلّی کو لوٹا اور بہت دولت جمع کی' رات جب قریب ہوئی تو حضرت خواجہ قطب الدین (کاکی) کے مزار کے پاس شب گذار کے صبح بدھ کے دن جو عرفہ کا دن تھا' مینا بازار اور آبادی کی دکانوں کو آگ لگا کر بھسم کیا' اور سب کو لوٹ کھسوٹ لیا اور یہاں سے پلٹنے کے بعد قصبہ ریواڑی اور پالودی گئے اور دونوں قصبوں کو جیسا ان کے جی میں آیا لوٹا اور غارت کیا' اور ان آبادیوں کی بیخ و بنیاد اکھاڑ دی''۔ (مولانا مناظر احسن گیلانی۔ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ۱۲۲)

ان کے اندرونی منصوبے کے بارے میں علامہ غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

''می خواہند کہ مالک تمام روئے زمین شوند'' (یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے مالک بن جائیں''۔ (الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ۱۲۰۔ مضمون مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم)

## ہندوؤں کی متعصّبانہ اور جارحانہ پالیسی کے اسباب

ایک ہزار سال کی غلامی کے بعد ہندوؤں کو کانگریس اقتدار کی صورت میں

جونہی طاقت ملی' اس کے فوراً بعد جس اندھا دھند طریقے سے وہ دیگر مذاہب کو فنا کرنے کی تیاری کر رہے ہیں' وہ مستقبل میں خود ہندوؤں کیلئے ایک بہت بڑی مصیبت ثابت ہوگا۔ غیر مذہبی حکومت کا ڈھونگ زیادہ دنوں تک نہ چل سکے گا۔ ہندوستان ہی کے ساتھ تو پاکستان بھی آزاد ہوا۔ بھارت یہ کہہ کر عارضی طور پر لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکتا ہے کہ پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ اور مذہبی حکومت ہے لیکن تا بہ کے لُطف یہ ہے؟ کہ اس مذہبی حکومت میں اقلیتیں محفوظ ہیں۔ عیسائی مشنریوں کو تبلیغ مذہب کی پوری آزادی ہے۔ اس کے مقابلہ میں بھارت کی غیر مذہبی حکومت کا حال سنیئے :۔

"بمبئی ۱۸ جولائی ۵۶ء۔ وسطی ہندو کی مدھیا پردیش ریاست سے عیسائی مبلغ پادریوں کے اخراج کی ایک رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے جو ریاستی حکومت کی ایک تحقیقاتی کمیٹی نے شب گذشتہ شائع کی ہے۔ یہ کمیٹی ۱۹۵۴ء میں قائم کی گئی تھی اور اس نے بھارت میں لوگوں کو عیسائی بنانے کی مذمت کی ہے' اور اس کو ایک ایسی متحدہ عالمی پالیسی کا جزو قرار دیا ہے جس کا منشاء مغربی برتری کو دوبارہ قائم کرنے کیلئے عیسائیت کو زندہ کرنا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ مشنریوں کے مدارس' شفا خانے اور یتیم خانوں کو عیسائی بنانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ سفارش کی ہے کہ طبّی اور دیگر پیشہ وارانہ خدمات کے ذریعہ بالراست مراعات دینے کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے"۔ (ڈان ۱۹- جولائی ۱۹۵۶ء)

اس پالیسی کے قدرتی نتائج کا اندازہ ذیل کے ایک واقعہ سے ہوسکتا ہے :۔

"رائے پور ۱۷- اگست۔ کل ایک آدمی قتل اور سات مجروح ہوئے'

جبکہ پولیس نے رائے پور کے مقام پر جو مدھیا پردیش میں واقع ہے، گولی چلائی، حکام نے بعد میں رات میں کرفیو نافذ کر دیا"۔

"یہ تصادم پولیس اور مجمع کے درمیان ہوا جس کی بیشتر تعداد طلباء پر مشتمل تھی، جو ایک امریکی مشنری مرکز کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے"۔

"پولیس نے دو مرتبہ لاٹھیوں سے مجمع پر حملہ کیا، اور ہوا میں خالی فائر کیے۔ بعد میں اس نے گولی چلائی۔ لاٹھی کے حملے سے ۳۵ مظاہرین زخمی ہوئے"۔

"سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ متعدد پولیس کے عہدہ دار جن میں ڈپٹی انسپکٹر جنرل اور ایک سپرنٹنڈنٹ شامل ہیں، مجمع کی سنگباری سے زخمی ہوئے"۔

"مظاہرہ امریکی مشنری مرکز کے سپرنٹنڈنٹ کے "درشت طرز عمل" کے الزام کے سلسلہ میں تھا، یہ مرکز ایک دارالاقامہ ایک کلب اور کتب خانہ چلاتا ہے"۔

جھگڑے کی بنیاد یہ بیان کی جاتی ہے کہ کلب کے ایک ڈرامے کے اس منظر پر سپرنٹنڈنٹ نے اعتراض کیا جس میں شیوا کی مورتی دکھلائی گئی جو ایک ہندو دیوتا ہے۔ پادری صاحب کا خیال تھا کہ شیوا کی مورتی کی یہ نمائش عیسائی مذہب کی تعلیم کے مطابق نہیں ہے۔ یہ واقعہ ۱۶ اگست کا بیان کہا جاتا ہے جو ہندوستان کی دسویں سالگرہ آزادی کا دوسرا دن اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی سالگرہ کا دن تھا۔

"شہر کے طلباء نے کل مشنری مرکز کے خلاف ایک زبردست جلوس

---

ہندو مذہب

نکالا۔ جب جلوس جا رہا تھا تو طلباء کا الزام یہ ہے کہ ایک عمارت سے ان پر پتھر پھینکے گئے۔ مجمع میں سے کچھ لوگوں نے اس عمارت کو آگ لگانے کی کوشش کی"۔

"مسلح پولیس کی ایک طاقتور کمک موقع واردات پر روانہ کی گئی۔ مظاہرین سے مسلسل جھڑپیں ہوئیں۔ پولیس کا بیان ہے کہ اس نے اس وقت گولی چلائی جبکہ مجمع نے ایک عہدہ دار کو نرغے میں لے لیا اور اس کو مار ڈالنے کی دھمکی دی۔ گولی چلانے کے بعد بھی مشتعل اور انکاری مجمع نے امریکی مشنری مرکز کو گھیرے میں رکھا۔ حکام نے بعد میں احکام جاری کیے جن کی رُو سے ہر قسم کے جلسوں اور جلوسوں کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سرکاری طور پر گذشتہ شب تک صورت حال کو ہنوز خطرناک بتلایا گیا ہے"۔

(ڈان۔ مورخہ ۲۸- اگست ۱۹۵۷ء)

عیسائی مذہب کے خلاف مہم کی یہ کوئی تنہا مثال نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی جہاں بھی انہیں موقع ملتا ہے' اس تعصب کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ آسام کے ناگا قبائل کی آزادی کی بے مثال جدوجہد جو کئی سال سے جاری ہے' اس پالیسی کے خلاف ہے' جس کے اثرات اخباری اطلاعات کے مطابق اب چھوٹا ناگپور کے علاقے میں بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔

بھارت کی اس تنگ نظر اور جارحانہ پالیسی کی اصلی وجہ وہ نفسیاتی ذہن ہے جو ہندوستان کی آزادی کی پیداوار ہے جیسا کہ اوپر بالصراحت بیان کیا گیا ہے۔ ہندو مذہب کی ۹۹ فی صد آبادی برصغیر ہند میں پائی جاتی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا نتیجہ

یہ ہوا کہ ہندوستان کی ہندو آبادی کا تقریباً ۹۹ فی صد حصہ یکایک آزاد ہو گیا اس آبادی کا ۹۲ فی صد حصہ بھارتی یونین میں شامل ہے اور جس کو وہ اپنا ایک آزاد وطن سمجھتا ہے۔

ایک نقطۂ نظر سے مذاہبِ عالم میں کنفیوشی مت' تاؤ مت' اور شنٹو مت کی طرح ہندو مذہب کی اس خوش نصیبی سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ایک ہی علاقے میں مرکز ہے۔ اس علاقے (بھارت) کی آزادی کا اثر یہ ہوا کہ ہندو مذہب کی تقریباً پوری آبادی اچانک ایک ہزار سال کی غلامی کے بعد آزاد ہو گئی یہ ہندوؤں کے حوصلوں کی بلندی کیلئے کافی تھا' لیکن بدقسمتی سے کچھ انہیں ایسے دوست بھی ملے جنہوں نے اس علاقے سے باہر کے خانہ خالی کی نشاندھی کی نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مشرق اور مغرب اور جنوب کے علاقوں پر نظریں ڈالنی شروع کیں۔

گم کی تھی میں نے راہِ مصیبت یہی تھی سخت
پھر یہ غضب ہوا کہ تم ایسے خضر ملے

حوصلوں کی بلندی کے ساتھ اگر حکمرانی کا کوئی تجربہ بھی ہوتا تو وہ اپنی ترقی اور استحکام کیلئے دوسرے مذاہب اور اقوام سے عدم رواداری نہ برتتے ایک ہزار سال کی غلامی کے ذہن اور مزاج نے یہ سمجھایا کہ پہلے گھر کو صاف کرو اس مقصد کیلئے البتہ ان کی قدیم تاریخ اور قومی خصوصیات ان کیلئے ممد ثابت ہوئیں عالمی پریس نے حالیہ زمانہ میں پنڈت جواہر لعل نہرو کی دُہری پالیسی کو بہت اچھالا ہے۔ لیکن یہ ان کے ساتھ اور ان کی قوم کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ہندو دیوتا ہمیشہ کئی چہروں اور کئی سروں کا مظہر رہا ہے۔ اس لئے یہ امر تعجب انگیز نہیں کہ جہاں ہندوؤں میں جن سنگھ' آریا سماج' مہا سبھا' راشٹریہ سیوا سنگھ جیسی متعصب انتہا پسند جماعتیں ہیں' وہاں کانگریس جیسی میٹھی زبان کی

جماعت بھی موجود ہے۔ لیکن یہ سب زبانیں ایک ہی خیال کو ظاہر کرتی ہیں کہ بھارت ہندوؤں کا مقدس وطن ہے اور صرف ہندوؤں کا ہے جس میں کسی اور طاقت اور فرقہ کے وجود کو گوارا نہیں کیا جائے گا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان پنڈت جواہر لعل نہرو نے کانگریس کے ترجمان کی حیثیت سے ہمیشہ اس امر کا اعلان کیا کہ مسلمانوں کے علیحدہ وجود اور مسلم لیگ کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں انگریز کو چھوڑ کر (جس کو چلا جانا چاہیئے) صرف کانگریس ہی ایک قوت ہے اور کانگریس وہ قوت تھی جو ہندو مہاتما جی کو پروردہ تھی اور پنڈٹ جواہر لعل نہرو خود مہاتما جی کے الفاظ میں ان کے روحانی فرزند تھے۔ مہاتما گاندھی کی یہ روحانی وراثت (کانگریسی دراصل درپردہ ہندو فرقہ پرست جماعتوں کا قدرتی تتمہ تھی۔ ہندوؤں کا نظریہ حیات علیحدگی پسندی کی تاریخی اور مذہبی روایات پر قائم ہے۔ جس کی ایک بہترین مثال ہمیں حالیہ تاریخ میں ملتی ہے پنڈت مالویہ جو بنارس یونیورسٹی کے بانی اور ہندوستان کے چوٹی کے کانگریسی لیڈر رتھے جب (گول میز کانفرس) میں شرکت کیلئے لندن جانے پر مجبور ہوئے تو ہندوستان واپس آ کر انہوں نے اس امر کیلئے پرائسچت (کفارۂ گناہ) کے رسوم ادا کئے کہ انہوں نے ہندوستان کے حدود کے باہر قدم رکھنے کا گناہ کیا تھا۔ لیکن اب اگر ہندو قوم علیحدگی پسندی کے اس ہندوانہ عقیدہ کو ترک کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے تو پھر اسے ایک عالمی نقطۂ نظر کو صدق دل سے اپنانا پڑے گا۔ جس کی اوّلین شرط یہی ہے کہ وہ اپنی اس پچھلی عدم رواداری سے دست بردار ہو۔ جس کے دباؤ کے تحت انہوں نے ماضی بعید میں بدھ مذہب کا دیس نکالا کیا اور ماضی قریب میں ہندوستان کے حدود میں کسی اور عقیدہ کو برداشت کرنے کیلئے آمادہ نظر نہیں آتے۔

# ہندوؤں کا تعصب اور علیحدگی پسندی

ان کے بین الاقوامی برتاؤ کی روح رہی ہے

۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں جو کچھ ہندوستان کے مختلف مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ کیا گیا اور اب بھی کیا جارہا ہے اس کا کچھ حال اوپر بیان ہو چکا ہے۔ جس کے خلاصے کیلئے ہمیں وزیراعظم پاکستان فیروز خان صاحب کی اس تقریر سے بہتر اور مکمل کوئی بیان نہیں ملتا۔ جو انہوں نے پاکستان کی پارلیمان میں ۸ مارچ ۵۸ء کو دیا:

> ''انہوں (شیخ عبداللہ) نے اس صداقت کو محسوس کر لیا ہے کہ ہندو تسلّط کے تحت کسی شخص کو آزادی حاصل نہیں ہو سکتی۔ عیسائی۔ نیچ ذات کے ہندو اور دیگر نیچ ذاتیں بہت جلد محسوس کر لیں گی کہ بھارت میں ان کے ساتھ کیا پیش آرہا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ذات پات کے نظام میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی مساوات نہیں اور ہندو انسانی مساوات کے قائل نہیں اس لئے کوئی شخصی آزادی نہیں حاصل ہو سکتی، یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے بعد سے بھارت میں بے شمار فرقہ وارانہ فسادات ہوئے باوجودیکہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ۱۹۵۰ء میں جو معاہدہ ہوا اس کے بعد پاکستان میں کوئی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا''۔
>
> (ڈان مورخہ ۱۰۔ مارچ ۱۹۵۸ء)

ہندوؤں کی متعصبانہ روایات اور علیحدگی پسندی کا یہ جذبہ عالمی مسائل میں بھی ان کے طرزعمل پر اثر انداز ہے چنانچہ عالمی سطح پر مختلف مذاہب کے ساتھ اس کے طرزعمل کا ایک سرسری جائزہ ذیل میں پیش ہے۔

## (الف) عیسائی اقوام کے ساتھ برتاؤ

جہاں تک عیسائی اقوام کا تعلق ہے ہندوؤں کے عدم تعاون کی پالیسی ظاہر ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا (فلپائن) کی عیسائی حکومت کو جو جاندار اور فوری خطرہ لاحق ہے وہ ظاہر ہے عیسائیت کے لئے اس خطرہ کے دوررس نتائج پر یہاں تفصیلی بحث غیر متعلق ہوگی۔ البتہ اس قدر اشارہ کافی ہے کہ اس علاقہ میں کمیونسٹ حملہ سے جو خطرہ عیسائیت کو لاحق ہے۔ اس کے مقابلے کیلئے اس علاقہ کے ممالک اور مذاہب نے عیسائی اقوام سے ملکر سیٹو کے معاہدہ کے ذریعہ جو بندوبست کیا ہے اس میں یہی نہیں کہ بھارتی یا ہندو شریک نہیں ہیں بلکہ اس کو ناکام بنانے کیلئے (تمام دیگر بڑے مذاہب کے طرز عمل کے برخلاف) ہندو دن رات کوشش کر رہے ہیں۔ اسی طرح کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں عیسائی اقوام اپنے تحفظ کے لئے جن نزاعات اور معاہدات سے دوچار ہیں، چاہے وہ کوریا کا مسئلہ ہو، انڈوچائنا کا مسئلہ ہو، فارموسا کا مسئلہ ہو یا بغداد کا معاہدہ ہو، اس میں ہندو رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔

## (ب) عالم اسلام کے ساتھ برتاؤ

بین الاقوامی سطح پر عالم اسلام کے ساتھ بھی ان کا یہی حال ہے۔ کشمیر اور پاکستان کے ساتھ دشمنی ظاہر ہے۔ عالم اسلام کی چوٹی کے مسائل میں فلسطین اور الجزائر داخل ہیں۔ ان معاملات میں یا تو بھارت فلسطین کے یہودیوں کی عملاً تائید میں ہے یا پھر اپنے سلوک کے ذریعہ عالم اسلام کی مخالفانہ قوتوں سے تعاون کر رہا ہے۔ اسی طرح نہر سوئز کے قضیہ میں گومگو بیانات یا بغداد پیکٹ کی مخالفت سے اس مخالفانہ طرز عمل کی کوئی تردید نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کا منشاء عالم اسلام کے مفاد کی تائید نہیں بلکہ ایک

طرف عالم اسلام میں پھوٹ ڈالنا اور دوسری طرف عیسائی اور مسلم اقوام میں منافرت پھیلانا ہے۔

## (ج) بدھ مت کے پیروؤں کے ساتھ سلوک

عالمی سطح پر بدھ مذہب کے پیروؤں کے ساتھ اس کے سلوک کی سب سے بڑی کسوٹی سیلون کا مسئلہ ہے۔

سیلون کے ساتھ حقیقی دوستی کا معیار یہ ہے کہ ان لاکھوں جنوبی ہند کے باشندوں کے ناجائز مطالبات اور طرزِ عمل کے متعلق بھارت کا رویہ منصفانہ ہو جو غیر قانونی طور پر ملک میں موجود ہیں۔ اور جو اپنی زبان کو سیلون کے اصلی باشندوں (سنہالیوں) پر ٹھونسنا چاہتے ہیں۔ اس مسئلہ کا ابھی تک کوئی قابل اطمینان حل نہیں ہوا' لیکن بھارت کے طرزِ عمل کو دیکھنے والے ہم اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بھارت اس مسئلہ میں سیلون کی حکومت کے برخلاف بھارتی تارکان وطن کی حمایت سے دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اسی طرح وہ سیلون کو اپنی پالیسی کا متبع بنا سکتا ہے۔

# ہندوؤں کی اجتماعی حالت اور ان کے قوی و کمزور پہلو

## ا۔ قوی پہلو

ہندوؤں کے قوی پہلو حسبِ ذیل ہیں:

### ا۔ ہندو دنیا کی آبادی کا بارہ فی صد ہیں

تعداد کے لحاظ سے ہندو مذہب دنیا کا چوتھا مذہب ہے۔ عیسائیت' اسلام اور کنفیوشی مت کے پیروؤں کو چھوڑ کر ہندوؤں کی تعداد دیگر مذاہب کے مقابلہ میں زیادہ

ہے۔ اس مذہب کے پیروؤں کی ننانوے فی صدی آبادی اب ہندوستان و پاکستان اور کشمیر میں منقسم ہے لیکن اس ننانوے فیصدی آبادی کا بڑا حصہ یعنی تقریباً پچانوے فیصد حصہ ہندوستانی یونین میں شامل ہے' پانچ فی صدی حصہ پاکستان اور کشمیر میں ہے' ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کی وجہ سے اب ہندوؤں کا ننانوے حصہ آزاد ہے۔ بقیہ ایک فیصدی آبادی بھی جو جنوب مشرقی ایشیا کے مختلف ممالک میں بستی ہے۔ آزاد ہو چکی ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوؤں کی پوری آبادی اب آزاد اور ایک سیاسی قوت ہے ایک حیثیت سے ہندوؤں کی یہ بہت بڑی خوش نصیبی ہے۔ ہندوؤں کی تعداد جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا دنیا کی آبادی کا تقریباً بارہ فیصدی ہے۔

## ۲۔ جغرافیائی موقف

ہندو چونکہ ہندوستان میں پائے جاتے ہیں' جو ان کا قومی وطن ہے' اسی لئے ہندوستان کا جغرافیائی محل وقوع ان کی اہمیت کا بڑا سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ (Gay wint) لکھتا ہے'' ہندوستان جنوب مشرقی ایشیا کا قلب ہے۔ یہ بحر ہند کے وسط میں واقع ہے اور براعظم ایشیا کے جنوب میں عظیم الشان اور وسیع ملک ہے۔ جس کے مشرق' مغرب اور شمال میں چھوٹے ممالک واقع ہیں جو کسی طرح اس کے حریف ثابت نہیں ہو سکتے۔ جبکہ ہندوستان طاقتور ہو جائے۔ (114)

## ۳۔ ہندو مذہب کی تعلیمات اور عقائد

ہندو مذہب کی تعلیمات اور عقائد کے معین نہ ہونے کے باعث اس میں ایسی غیر معمولی لچک موجود ہے جس کے باعث وہ دوسرے مذہبی افکار و معتقدات سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو مخالف حالات سے سازگار بنا لیتا ہے۔ چنانچہ ہندو عقائد کی رنگارنگی

---

ہندو مذہب

دراصل ان بے شمار مقامی اور بیرونی مذاہب کی تعلیمات کی نشانی ہے جو غیر اہم اور قبل تاریخی دور کے تھے' شاید یہی وہ حقیقت ہے جس کا پنڈت جواہر لعل نہرو یوں اظہار کرتے ہیں:

''ہندوستان ڈاڈول (Dodwell) کے قول کے مطابق سمندر کی طرح مختتم طور پر جذب کرنے والا ہے''۔(115)

### ۴۔ ہندوؤں کی طاقت

ہندوؤں کی طاقت کی ایک بڑی علامت ہندوستان کا رقبہ اور آبادی ہے دنیا میں چین کے بعد بلحاظ آبادی اسی کا درجہ ہے۔ اور رقبہ میں چین کے علاوہ نئی دنیا کے مما لک کینڈا' مما لک متحدہ امریکہ اور برازیل کو چھوڑ کر یہ سب سے بڑا ہے۔ رقبہ اور آبادی کی وسعت کا ملک کے اثر اور طاقت میں بڑا دخل ہے۔ الغرض ہندوستان کی آبادی' رقبہ اس کے قدرتی و معدنی ذرائع اور اس کی بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی اس کیلئے ایک قوت کا خزانہ ہوسکتی ہے' بشرطیکہ اس کی دانشمندی سے حفاظت ہو' ورنہ تاریخ کے پچھلے دور میں ہندوستان کی اس قدرتی طاقت کے باوجود وہ بیرونی طاقتوں کا محکوم بنا رہا۔

## ۲۔ کمزور پہلو

ہندوؤں کے کمزور پہلو حسبِ ذیل ہیں

### ۱۔ منقسم ہندوستان کے جغرافیہ میں بھارت کی کوئی اہمیت نہیں

ہندوستان کی اہمیت کے متعلق اُوپر جس اقتباس کا حوالہ دیا گیا' وہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے برصغیر ہندوستان کی تقسیم کے بعد دراصل ہندوستان کے جغرافیائی محل

وقوع کا کوئی فائدہ ہندوستان کو حاصل نہیں ہوتا' اسی طرح اب یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے پڑوس میں چھوٹے چھوٹے ممالک واقع ہیں' جیسا کہ سیلون' یا برما تقسیم سے پہلے موجود تھے۔ اب تبت کے جمہوریہ چین کے زیرنگین ہونے کے بعد چین و پاکستان اس کے پڑوسی ہیں۔

## ۲۔ ہندو مذہب کی کوئی معین اساس نہیں

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہندو مذہب کا کوئی معین مفہوم نہیں اور وہ بہت لچکدار ہے' ہندو مذہب کی یہ لچک اس کی قوت سے زیادہ اس کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے۔ ہندو مذہب کی جس قوت انجذاب کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے اس کے تنقیدی جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل وہ انفعالی کیفیت اور نظریاتی شکست ہے۔ جب کبھی ہندو مذہب کو کسی برتر و اعلیٰ تر نظریہ سے دوچار ہونا پڑا تو اس نے اس سے مصالحت کر لی۔ خود بدھ مذہب کی تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ چنانچہ پنڈت جواہر لعل نہرو اپنی کتابوں اور مضامین میں بار بار اس امر کو دہراتے ہیں کہ خود برہمنی مذہب بدھ مذہب سے متاثر ہوا' اور اپنے اُصول کو بدلنے پر مجبور ہوا ہے۔

وہ ہندو مذہب پر بدھ مذہب کے اثر کے تحت لکھتے ہیں:

"بدھ مذہب نے ہندوستانی زندگی کو سینکڑوں طرح متاثر کیا ہے' اور ایسا ہونا ناگزیر تھا' کیونکہ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ بدھ مذہب ہندوستان میں ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک ایک زندہ' متحرک اور مقبول عام مذہب رہا ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستان نے اپنے تنزل کے طویل زمانہ میں اور بعد کے دور میں بھی (جبکہ عملاً ایک علیحدہ مذہب کی حیثیت سے اس کا شمار نہیں ہوتا تھا) بدھ مذہب کا بڑا

حصہ ہندو عقیدے اور زندگی وفکر کے قومی طریقوں کے جزو کی حیثیت سے باقی رہا۔ اور اس نے ہندو نسل کے ارتقاء پر بڑا زبردست اثر ڈالا۔ اس دوامی اثر کا مذہبی عوائد یا فلسفیانہ نظریے یا مذہبی عقیدے سے کم تعلق ہے۔ بدھ کے اخلاقی معاشری اور عملی مطمع نظر اور اس کے مذہب نے ہماری قوم کو متاثر کیا' اور ہم پر اپنے غیر فانی اثرات چھوڑے ہیں''۔(116)

اسی طرح آگے چل کر ''کس طرح ہندو مذہب نے ہندوستان میں بدھ مذہب کو اپنے اندر جذب کرلیا؟'' کے عنوان پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں' لیکن برہمنی مذہب اور بدھ مت دونوں میں تنزل پیدا ہوا' اور ان دونوں میں ذلت آمیز رسومات پیدا ہو گئے دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا۔ اگر برہمنی مذہب نے بدھ مذہب کو جذب کرلیا تو اس عمل میں مختلف طریقوں سے خود برہمنی مذہب بھی بدل گیا۔

اسی ضمن میں سردار پانیکر کی رائے کا معلوم کرنا بھی بصیرت افروز ہوگا:

''واقعہ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں بدھ متی فکر کے زبردست احیاء میں جس کا آغاز نگر جونا اور اسنگا سے ہوا تھا ہندو اور بدھ مذہب کے عقائد میں باہمی فرق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بتدریج مبہم ہو گیا''۔(117)

ہندوستان کی قدیم تاریخ میں بدھ مذہب کے سوا کسی اور قابل اعتبار مذہب کا پتہ چلانا مشکل ہے جس کو ہندو مذہب نے شکست دی ہو' یا اپنے اندر جذب کرلیا ہو۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شمالی اور مغربی ایشیا سے جو اقوام اور مذاہب ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہاں بس گئے' انہوں نے ہندو مذہب کی تعلیمات کو

متاثر کیا اور اس کے مذہبی نقطۂ نظر پر اثر ڈالا۔ مثلاً مسلمان جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہوں نے ہندوؤں کی بڑی تعداد کو مسلمان بنالیا' اور وہ غیر منقسم ہندوستان کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ بن گئے۔ نیز اپنے عقیدۂ توحید کو اس طرح مقبول بنایا کہ خود ہندوؤں کے اندر سکھ مذہب کے علاوہ برہمو سماج اور آریا سماج جیسے فرقے پیدا ہوئے جو بت پرستی کے مخالف اور توحید کے قائل ہیں۔

سکھ مذہب پر اسلام کے عقیدۂ توحید کے گہرے اور مستقل اثر کا حال اب سکھ مذہب کے باب میں پڑھیں گے۔ اب ہم ذیل میں برہمو سماج اور آریا سماج پر اسلام کے عقیدۂ توحید کا جو اثر پڑا اس کے بارے میں ذیل میں ہندو اہل قلم کی مرتبہ اس مشہور کتاب کے اقتباسات پیش کرتے ہیں جو تین جلدوں میں "ہندوستان کا تہذیبی ورثہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے اور جس میں سر رادھا کرشنن جیسے ہندو شریک ہیں۔

(۱)' رام موہن رائے اپنی رائے نوشت سوانح عمری کے خاکہ میں کہتے ہیں کہ:

"تقریباً سولہ سال کی عمر میں میں نے ایک کتاب لکھی جس میں میں نے بت پرستی کے طریقہ کے جواز پر اعتراض کیا"۔ اگرچہ اس کتاب کی صحت کو بعض تسلیم کرتے اور بعض انکار کرتے ہیں۔ لیکن یہ امر بے حد اہم ہے کہ ان کی اس وقت تک جو قدیم ترین تحریر ثابت ہوئی ہے یعنی "تحفۃ الموحدین" نامی کتاب رام موہن رائے کو ہمارے سامنے اگر ایک مذہبی مصلح کی حیثیت سے نہیں تو ایک مشہور اور تاریخی آزاد خیال مفکر کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ (صفحہ ۳۹۹ جلد دوم)

The cultural heritage of India Published by Swami Arnash nanda, Secretary Sri Ram Krishna Central Committee

ہندو مذہب

Belar nath, Calcutt

(۲) آریہ سماجیوں کا ان دیوی دیوتاؤں کے بارے میں ناقابل مفاہمت طرزِعمل جن کو وہ ''جھوٹے خدا'' کہتے ہیں'ان کو ''جنگجو فرقہ'' ثابت کرتے ہیں۔(صفحہ۴۲۳ جلد دوم)

اس کی تائید ایک اور قابل اہل قلم کی حسب ذیل رائے سے ہوتی ہے:

''بہر حال ہندو مذہب اس قاعدہ کا کوئی استثنٰی نہیں ہے کہ ہر ایک قوم کا قومی کردار اس وقت منقلب ہو جاتا ہے' جب افق پر ہلال نمودار ہوتا ہے۔مختلف نسلوں اور تہذیبوں کے مابین ایک درمیانی عامل کی حیثیت سے زیادہ کہیں اور اسلام کی تشکیلی طاقت کا موثر ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ جو ان حدود اور رکاوٹوں کو پاش پاش کر دیتی ہے جو انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتے ہیں (صفحہ ۲۱۳)

The Great Religions of Modern World

اسی طرح عیسائیت نے بھی ہندوستان سے تقریباً ایک کروڑ باشندوں کو اپنے عقیدے میں داخل کرلیا ہے۔مسلمانوں اور عیسائیوں کی یہ تعداد ہندو مذہب کے انجذابی نظریہ کی تردید کرتی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ یہ سیاسی غلبہ کا نتیجہ نہیں ہے کیونکہ مثلاً پچھلے اسّی سال (۱۸۱۸ء سے لے کر ۱۹۵۱ء) میں جبکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہندوستان میں انگریز کے محکوم تھے اور سیاسی اسباب کی بناء پر مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو زیادہ بہتر حالت میں تھے۔ پنڈت جواہر لعل کا قول ہے''ہندو انگریزوں کے چہیتے تھے'' (118) مسلمانوں کی تعداد مسلسل بڑھتی رہی اور دگنی سے زائد ہوگئی۔لیکن ہندو مسلسل گھٹتے رہے' اور ان کی مجموعی آبادی میں ٹھیراؤ پیدا ہوگیا۔

## ۳۔ ہندوؤں کی تنگ نظر قومیت پرستی اور علیحدگی پسندی

ہندوؤں کی تیسری بڑی کمزوری ان کی تنگ نظر قومیت پرستی ہے جس کا نتیجہ علیحدگی پسندی کا وہ مذہبی نظریہ ہے جس کی مثال پنڈت مالویہ کے پرانشچت میں ملتی ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔

ہندو مذہب کی یہ تنگ نظر قومیت پرستی اس کی ایسی بڑی اور اہم خصوصیت ہے جو اس کے تمام اجتماعی اعمال کی بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بدھ مذہب کا دیس نکالا کیا جو اس تنگ نظری کے خلاف ایک قسم کا احتجاج تھا۔ اس ضمن میں پنڈت جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں ''لیکن بدھ مذہب اصلاً بین الاقوامی اور ایک عالمی مذہب تھا۔ اور جوں جوں وہ ترقی کرتا گیا اور پھیلتا گیا وہ اور زیادہ بین الاقوامی ہوتا گیا۔ اس طرح قدیم برہمنی مذہب کیلئے یہ قدرتی تھا کہ وہ قومی احیاء کا بار بار نمونہ بن جائے''۔

## ہندوستان کے حدود سے باہر ہندو نو آبادیوں کا وجود حقیقی نہیں

ہندوستان کے حدود سے باہر خصوصاً جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے میں ہندوؤں کی سلطنت اور نو آبادیوں کے وجود کا حالیہ زمانہ میں جو پتہ چلایا گیا ہے اور جس پر ہندو مصنفین کی جدید العصر کتابوں میں بہت زور دیا گیا ہے وہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو بھی جونئی ہندو قومیت کے بڑے طاقتور مظہر اور ترجمان ہیں اپنی کتابوں مثلاً (The Glimpes of World History) اور (The Discovery of India) میں بار بار تفصیل کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی حال پانیکر کا ہے۔ یہ دراصل بدھ مذہب کے پیروؤں کی نو آبادیاں تھیں یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے چنانچہ مشہور ملائی عالم سید اسمٰعیل العطاس حاضر العالم الاسلامی کی جلد اوّل کے صفحہ ۳۶۶ پر

---

ہندو مذہب

اپنے پُر مغز اور تحقیقی مقالہ میں لکھتے ہیں :

''ماجافاہت (Modjapahat) کی مشرقی جاوا میں جو سلطنت تھی
وہ بدھ متی تھی''

اسی طرح کتاب "The Great Religions of Modern World" میں
(August Karl Reischaure) بدھ مذہب پر اپنے مقالہ میں لکھتا ہے :۔

''بدھ مذہب نے ملائی جزیرہ نما میں عمل دخل حاصل کیا خصوصاً جزیرہ
جاوا میں جہاں اس کے عظیم الشان تعمیری نشانیوں میں سے ایک پائی
جاتی ہے۔ جس کو بار بوڈاور کہتے ہیں۔ اس عظیم الشان تعمیر کے
باقیات وآثار دراصل پتھر کے تراشے ہیں جن میں بدھ متیوں کو بدھ
مت کی تعلیم دی جاتی تھی جس کو اس جزیرہ میں ہندو آباد کار لائے
تھے۔ جن میں سے اکثر ظاہر ہے کہ ان علاقوں سے آئے تھے جہاں
مہایانہ بدھ مت رائج تھا۔ اس لئے جاوی بدھ مت دراصل مہایانہ
بدھ مت اور ہندو مت کا ایک معجون مرکب تھا۔ اگر چہ مہایانہ بدھ
مت کی خصوصیات بھی معدوم نہ تھیں۔ اسلام کی آمد نے بتدریج بدھ
مت کو اس منظر سے نکال باہر کیا''۔ (صفحہ ۱۱۷)

یہی صحیح تعبیر ہے کیونکہ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی دفعہ بدھ مذہب کے پیرو
ہی ہندوستان سے باہر گئے ہیں۔ صرف ناموں کی مشابہت کی وجہ سے یا تہذیبی آثار کی
مماثلت کی بناء پر ان کو ہندو کہنا مشکل ہے کیونکہ کسی معتبر اور مستند شہادت سے یہ امر
ثابت نہیں کہ بدھ مت کے پیروؤں اور قدیم ڈراوڑی مذہب کے پیروؤں کے ناموں
اور تہذیب میں اور ہندو مت کے ناموں اور تہذیب میں کوئی امتیازی فرق تھا۔

### ۴۔ ہندو مذہب مقامی نوعیت رکھتا ہے

ہندو مذہب کے ننانوے فیصد پیرو صرف برصغیر ہندو پاک کے علاقے میں پائے جاتے ہیں جو جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے کا ایک جزو ہے۔ ایشیا کے دوسرے علاقوں سے ہندوؤں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

### ۵۔ ہندوؤں کی دنیا میں صرف ایک مملکت ہے

جنوب مشرقی ایشیا کے اس خطہ میں ان کی صرف ایک ہی آزاد مملکت ہے جس طرح عیسائیوں کی ایک آزاد مملکت (فلپائن) اس علاقے میں پائی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اس علاقے میں مسلمانوں کی تین آزاد مملکتیں پاکستان' انڈونیشیا اور ملایا ہیں اور بدھ مذہب کی سات سے زیادہ ریاستیں ہیں۔

### ۶۔ جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے

ہندوؤں کی آزاد حکومت سے باہر جو ہندو پائے جاتے ہیں ان کی تعداد (Life) کے اندازہ کے مطابق بائیس لاکھ ہے اس کے مقابلے میں اس علاقے کے دیگر ممالک میں بدھ مذہب' عیسائیت اور اسلام کے جو پیرو پائے جاتے ہیں ان کی تعداد کئی گنا زیادہ ہے۔

اس طرح ہندو مذہب کے پیروؤں کی سو فیصدی تعداد صرف براعظم ایشیا کے ایک محدود حصے (جنوب مشرقی ایشیا کے ایک ملک) میں پائی جاتی ہے۔ اس براعظم کے دیگر حصوں یا دنیا کے بقیہ پانچ براعظموں میں ان کی کوئی قابل لحاظ تعداد یا اثر موجود نہیں ہے۔

## ۷۔ ہندوستان دنیا میں ہندوؤں کا تنہا وطن ہے

لیکن اس مملکت میں اقلیتیں تقریباً ایک تہائی سے زائد ہیں جن سے اس کا سلوک انتہائی غیر رواداران اور اشتعال انگیز ہے درآنحالیکہ دنیا کے دیگر مذاہب اسلام' عیسائیت اور بدھ مذہب کے متعدد ایسے قومی وطن اور آزاد مملکتیں ہیں جہاں دیگر مذاہب کے پیروؤں کا برائے نام وجود ہے۔

## ۸۔ ہندو مذہب جمہوری نہیں

ہندو مذہب (جو برہمن طبقے کی نسلی سیادت و برتری کا قائل ہے) ایک ترقی پذیر معاشرہ کیلئے ناسازگار ہے۔ ہندو قوم کی بیداری میں گاندھی جی کی قیادت کا مقام مسلّم ہے ان کی تعلیم و فلسفہ کا اصلی سرچشمہ بدھ کی تعلیم تھی۔ آج بھی ان کے جانشین اپنے اصولوں کے لئے نہ صرف پنج شیلا بدھ متی اصطلاح) استعمال کر رہے ہیں' بلکہ ہندوستان کے قومی جھنڈے پر اشوک کا چکر اور اپنی حکومت کے مہر کیلئے اشوک کے شیر کی علامت استعمال کر رہے ہیں۔ اور جس طرح باوجود حکومتی اور قانونی دباؤ کے ہندوستان کے نیچ ذات کے ہندو بڑی تعداد میں بدھ مت اختیار کر رہے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہ مانے بغیر چارہ نہیں رہتا کہ ہندو مذہب بدھ مذہب کے مقابلے میں جگہ چھوڑتا جا رہا ہے۔ خود حکومت ہند کی شائع کردہ کتاب (The 2500 Years of Buddhism) کی رائے سنیئے:

> ''بدھ مت کا احیاء جو گذشتہ ساٹھ سال سے جاری تھا اور جو خصوصیت سے گذشتہ عشرہ میں نمایاں رہا ہے وہ مذاہب کی تاریخ میں انتہائی عجیب اور نمایاں واقعات میں سے ہے۔ دنیا میں کہیں اور

کسی شخص کو کسی ایسے مذہب کی نظیر میں نہ ملے گی کہ معدوم ہو جانے کے صدیوں بعد وہ دوبارہ زندہ ہوا ہو' کسی مستبد و حکمران کے حکم سے نہیں بیرونی فتح کے نتیجے میں نہیں بلکہ صرف اس لئے کہ یہ لوگوں کی مرضی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو ہندوستان میں واقع ہو رہی ہے۔ ایک صدی سے کم عرصہ پہلے بدھ مذہب کا اصلی مقام پیدائش میں تذکرہ بھی نہ ہوتا تھا۔ اگر یاد بھی آتا تو ایک ایسے قابل اعتراض و برائی کے طور پر جس نے تھوڑے عرصہ کیلئے برہمنی مذہب کے خاموش سمندر کو متلاطم کر دیا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے فنا ہو گیا' لیکن آج بدھ مذہب ہر شخص کی زبان پر ہے۔ ہندوستان کے صدر جمہوریہ (راشٹر پتی) کی کرسی کے اوپر لوک سبھا میں دھرم ٹکرا پراورتنا ''دھرم کا پہیہ کا چکر'' کا پیام عوام کے نمائندوں کو بجلی کی روشنی میں نظر آیا ہے۔ جو قومی جھنڈا دس ہزار سے زائد سرکاری عمارات پر لہراتا ہے اس کے وسط میں یہی تاریخی علامت قوم کو نہ صرف گوتم بدھ کے اعلیٰ نظریہ کی یاد دلاتی ہے بلکہ دھرم و حیا یعنی نیکی کے ذریعہ اشوک کی فتح کی یاد تازہ کرتی ہے۔ اسی طرح اشوک کا شیر ببر جو العباد اربعہ میں دھرم کے بیباک اعلان کی ترجمانی کرتا ہے' اس کو جمہوریہ کی سرکاری مہر کے طور پر اختیار کر لیا گیا ہے''۔ (صفحات ۴۲۳-۴۲۰)

۱۰۔ ہندوستان تین سمت میں سمندر سے گھرا ہوا ہے اور اس کا ساحل تقریباً دو ہزار میل لمبا ہے کسی طاقتور بحریہ کی عدم موجودگی میں جس کا بڑے عرصہ تک کوئی امکان نہیں اس کی آزادی خطرہ میں ہے گذشتہ چار صدیوں کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ اس کیلئے حقیقی

خطرہ بحری ہے جیسا کہ سردار پانیکر اپنی کتاب India and Indian Occean میں لکھتے ہیں:

(۱) خلیج بنگال کے جزائر' سنگاپور' ماریشیس' اور سقوطرہ کو جب اچھی طرح لیس کرلیا جائے اور ان کی اس بحریہ سے حفاظت ہو جس کا پڑاؤ سیلون میں ہو تو ہندوستانی سمندر کے اس حصہ کا تحفظ ہوگا جو ہندوستان کیلئے بے حد اہم ہے۔ (صفحہ ۱۵)

(۲) بنا برآں جب تک سنگاپور' ماریشیس' عدن' سقوطرہ جیسے دور دراز کے بحری اڈوں کو مضبوطی سے اپنے قبضے میں نہ رکھا جائے اور بحری اور ہوائی طاقت کو اس مقصد سے ترقی نہ دی جائے کہ ان مقامات کو کافی تحفظ عطا کیا جائے گا اس وقت تک ہندوستان کو سلامتی اور عیسائیت نصیب نہ ہوگی۔ (صفحہ ۹۱)

## ۱۱۔ ہندو مذہب کی نظریاتی کمزوری

بحیثیت ایک سیاسی اور نظریاتی طاقت کے وہ ابھی تک اپنی کامیابی کا کوئی مستقل ثبوت فراہم نہ کرسکی۔ تاریخ کے معلوم دور میں وہ بدھ مت' اسلام' اور عیسائیت کی محکوم رہی۔ دس سال کی آزادی کے اندر ہی وہ کمیونزم سے اپنے ایک حصہ میں بحیثیت سیاسی طاقت کے ہزیمت پا گئی چونکہ کرالا میں کمیونسٹ حکومت کا قیام کمیونزم کی پوری تاریخ میں پُرامن اقتدار کی پہلی مثال ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی اور معنی لینا مشکل ہے کہ کمیونزم کے مقابل کی طاقت (ہندو نظریہ اور سیاسی فلسفہ) کی قوت مدافعت ناکام ثابت ہوئی۔

## ۱۲۔ ہندوستان ہمیشہ بیرونی طاقتوں کا محکوم رہا

ہندوستان کی ہزاروں سال کی تاریخ کا ایک ہی سبق ہے کہ وہ ہمیشہ بیرونی

حملہ آور طاقتوں اور جہانگیر اقوام کا محکوم رہا۔ ہندوستان کی محفوظ تاریخ کے گذشتہ ایک ہزار سال میں وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کا زیرنگیں رہا۔ مستقبل کے بارے میں ابھی یہ پیشین گوئی مشکل ہے کہ آیا ہندوستان کی محکومی کی یہ قدیم تاریخ ایک استثناء تھی یا اس کا مزاج؟ اسی تاریخ سے ہندوستانی رہنماؤں کا وہ ذہن تیار ہوا ہے جو اس کی موجودہ خارجی اور داخلی پالیسی کی رہنما ہے۔ اس پالیسی کی بنیاد وہ خطرناک جانبازی (Desperatencess) ہے جو مایوسی کی غمازی کرتی ہے جو حسب ذیل اقتباس سے ظاہر ہے:

> ''ہندوستان جس طرح واقع ہوا ہے وہ دنیا میں ثانوی پارٹ نہیں ادا کرسکتا۔ یا تو وہ بڑی اہمیت کا حامل ہوگا یا پھر کوئی بھی مقام نہ رکھے گا' کوئی درمیانی مقام مجھے نہیں بھاتا اور نہ میں کسی ایسے درمیانی مقام کو ممکن خیال کرتا ہوں''۔ (119)

بہر حال یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ ماضی قریب کی ایک ہزار سالہ تاریخ میں ہندو سو فیصد دوسروں کے محتاج رہے' ان کے سوا کوئی اور عالمی مذہب (سوائے یہودیت کے) اس طرح کاملاً محکوم نہیں رہا۔ شاید یہی تاریخی مماثلت آج ہندوستان اور اسرائیل کی دوستی کی نفسیاتی بنیاد ہے۔ ان دونوں اقوام کے قومی خصائص میں گہری مماثلت و یگانگت کی سلبی بنیاد ہے۔

# یہودی مذہب

# JUDAISM

# یہودی مذہب

سامی النسل قبیلے وادی، دجلہ وفرات، شام، فلسطین اور عرب کے علاقوں میں آباد تھے۔ ان قبائل میں جن مذاہب کی اشاعت ہوئی ان میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام سب سے زیادہ اہم مذاہب ثابت ہوئے۔ ان سامی مذاہب میں سب سے قدیم مذہب یہودیت ہے۔ جس کی اشاعت مختلف پیغمبروں کے ذریعہ بنی اسرائیل کے قبیلے میں ہوئی۔ بنی اسرائیل قبیلے کے جدِ امجد حضرت ابراہیم تھے جو عرب میں رہتے تھے اور گلہ بانی ان کا پیشہ تھا۔ جب وہ اپنے گلے کو لیکر اس علاقہ سے گذر رہے تھے جس کا نام کنعان تھا اور وہ جسے بعد میں فلسطین کہا گیا تو ان کے خدا نے ان سے وعدہ کیا کہ وہ کنعان کے زرخیز علاقہ کا حاکم انہیں اور انکے قبیلے کے افراد کو بنا دے گا۔ حضرت ابراہیم کے اس وقت تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اس لئے انہوں نے اپنے خدا سے دعا مانگی کہ وہ انہیں صاحب اولاد کر دے۔ حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی ولادت سے بنی اسرائیل کے قبیلے کی داغ بیل پڑی۔ حضرت ابراہیم کے خاندان کے افراد کی تعداد بڑھنے لگی اور ان کے پوتے حضرت یعقوبؑ (جو اسرائیل کے نام سے مشہور تھے) کے بارہ بیٹوں کی اولاد بارہ قبائل میں منقسم ہوئی۔ اسرائیل کے کچھ قبائل کنعان (فلسطین میں آباد ہوئے اور کچھ قبائل اٹھارویں صدی ق م میں مصر ہجرت کر گئے اور انہوں نے وہاں رہائش اختیار کی اسرائیل کے ان قبائل میں ایک خدا کا تصور تو موجود تھا مگر جس پیغمبر نے انہیں مذہبی نظام عطا کیا وہ حضرت موسیٰؑ تھے جو مصر میں پیدا ہوئے تھے۔

بنی اسرائیل کے جو قبائل مصر میں منتقل ہو گئے تھے۔ انہوں نے ابتداء میں تو

یہودی مذہب.

آزاد زندگی بسر کی، اپنی زبان اور پیشوں کو محفوظ رکھا اور اپنی انفرادیت کو باقی رکھا۔ لیکن مصر کے فراعین زیادہ عرصہ تک انہیں آزاد نہ دیکھ سکے۔ اور انہوں نے مظالم کرنے شروع کیے۔ ان سے غلاموں کا سا برتاؤ کیا جانے لگا اور ان سے زبردستی مزدوری کرائی جانے لگی۔ بنی اسرائیل کے لوگ اپنی زبوں حالی سے عاجز آ گئے اور اپنی نجات کی دعائیں مانگنے لگے جس فرعون کے زمانہ میں بنی اسرائیل پر بہت زیادہ مظالم ہوئے وہ غالباً رعمیس دوئم تھا جس کی حکومت کا زمانہ ۱۲۹۷ سے ۱۲۲۵ ق م تک رہا۔ اسی کے زمانہ میں نجومیوں کے ایک خاص گروہ نے پیشنگوئی کی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے جو فرعون مصر کی تباہی کا باعث ہوگا۔ چنانچہ فرعون نے حکم دیا کہ اس سال بنی اسرائیل کے یہاں جتنے بچے پیدا ہوں انہیں قتل کر دیا جائے۔

## حضرت موسیٰؑ

قرآن کے ارشاد کے مطابق جب بنی اسرائیل کے ایک خاندان میں حضرت موسیٰؑ کی ولادت ہوئی تو ان کی والدہ نے انہیں ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل میں ڈال دیا۔ جب ملکہ نے دریا میں ایک صندوق تیرتے ہوئے دیکھا تو اسے نکلوایا۔ صندوق کے اندر ایک بچہ کو دیکھکر ملکہ کا جذبہ رحم جوش میں آ گیا اور اس نے بچہ کی پرورش کی ذمہ داری اُٹھالی۔ اس طرح حضرت موسیٰؑ کی پرورش فرعون کے گھر میں ہوئی۔ آپ کی والدہ نے دایہ کے فرائض انجام دیئے۔ جوانی میں حضرت موسیٰؑ نے دو آدمیوں کو جھگڑتے ہوئے دیکھا جن میں سے ایک آدمی بنی اسرائیل کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے حضرت موسیٰؑ سے مدد طلب کی۔ حضرت موسیٰؑ نے ایک دوسرے آدمی کے ایسا مکہ مارا کہ وہ مر گیا اس ڈر سے کہیں وہ ایک آدمی کے قتل کے جرم میں نہ پکڑے جائیں حضرت موسیٰؑ شہر سے نکل گئے اور مدین کے میدان میں پہنچ گئے۔ وہاں آپ نے دو لڑکیوں کو دیکھا جو پانی لینے کیلئے ایک کنویں پر کھڑی تھیں لیکن مردوں

کی موجودگی میں وہ پانی نہیں لے پاتی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ نے ان لڑکیوں کی مدد کی اور پانی سے انکے برتن بھر دیئے وہ لڑکیاں حضرت موسیٰؑ کو اپنے گھر لے گئیں۔ لڑکیوں کے باپ حضرت شعیبؑ نے حضرت موسیٰؑ کو اپنے گھر میں جگہ دی۔ اپنی ایک لڑکی کی شادی ان کے ساتھ اس شرط پر کر دی کہ وہ آٹھ سال تک ان کی خدمت کرتے رہیں گے۔ آٹھ سال خدمت کرنے کے بعد حضرت موسیٰؑ اپنی بیوی اور گلے کو لے کر حضرت شعیب کے گھر سے رخصت ہوئے' رات کے وقت' سردی کے موسم میں انہیں آگ کی ضرورت پیش آئی۔ کوہ طور پر حضرت موسیٰؑ نے آگ کو روشن دیکھا جب وہ آگ لینے کوہ طور پر پہونچے تو اس درخت نے جس پر آگ روشن تھی یہ آواز ائی۔ ''اے موسیٰؑ دیکھو ہم اللہ ہیں۔ تمام کائنات کے خالق اور اس طرح حضرت موسیٰؑ سے خود خدا نے خطاب فرمایا اور انہیں نبوت عطا کی گئی۔ نبوت کی نشانیوں کے طور پر انہیں عصا اور بیضا سے نوازا گیا اور فرعون مصر اور اس کی رعایا کی اصلاح کا کام سپرد کیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی مدد کیلئے اپنے بھائی ہارون کو اپنی نبوت میں شریک کرنا چاہا اور خداوند کریم نے ان کی یہ درخواست منظور کر لی کیونکہ حضرت موسیٰؑ سے زیادہ فصیح زبان میں گفتگو کر سکتے تھے حضرت موسیٰؑ فرعون کے دربار میں گئے اور آپ نے ایک خدا کی اطاعت کی تلقین کی لیکن فرعون پر حضرت موسیٰ کی تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ حضرت موسیٰ کا اور ان کے قبیلے والوں کا زبردست دشمن بن گیا اور یہودی قوم کو ختم کرنے پر تل گیا۔

حضرت موسیٰ اپنی قوم کو فرعون کے مظالم سے بچانے کیلئے مصر سے ہجرت کرنا چاہتے تھے اور جب وہ تمام بنی اسرائیل کو اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوئے تو فرعون نے آپ کا پیچھا کیا۔ حضرت موسیٰ اور ان کی امت نے تو سمندر پار کر لیا مگر فرعون معہ اپنی فوج کے سمندر میں ڈوب گی اور اس طرح خداوند کریم نے حضرت موسیٰ کے ہمراہ بنی

اسرائیل کو فرعون کے مظالم سے نجات دلوائی اور وہ مصر سے ہجرت کر کے جنوبی شام کے علاقہ میں آ گئے۔ اسی زمانہ میں حضرت موسیٰ پر توریت کی شکل میں جو احکامت خداوندی نازل ہوئے وہ ان کی قوم کی ہدایت کے لئے تھے ان حکامات کے ذریعہ مذہبی' معاشرتی اور اخلاقی قوانین کی تشریح کی گئی تھی جن پر بنی اسرائیل کو عمل کرنا تھا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اکثر حضرت موسیٰ کے احکامات اور تعلیمات کی خلاف ورزی کی جس کے نتیجہ میں طور پر وہ چالیس سال تک خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے رہے اور عذاب الٰہی میں مبتلا رہے اس خانہ بدوشی کے زمانہ میں ہی حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا انتقال ہوگیا۔ چالیس سال بعد یہودی یوشع (JOSHUA) کی رہبری میں فلسطین میں داخل ہوئے اور وہاں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔ انہوں نے فلسطین میں فتوحات ۱۳۰۰ ق'م سے ۱۱۰۰ ق'م کے درمیان کیں۔ جب کہ شام اور فلسطین پر سے مصر کے اثرات ختم ہو چکے تھے۔

بنی اسرائیل نے مفتوحہ علاقہ کو بارہ قبائل میں تقسیم کر دیا تھا جو اپنا مذہبی تعلق حضرت یعقوب سے بتاتے تھے۔ ان علاقوں میں بادشاہتیں قائم نہیں ہوئیں بلکہ قبیلہ کے بزرگوں نے انتظامی اختیارات سنبھالے اور حکمرانی کرنے لگے لیکن یہ صورت حال زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی اور ایک مضبوط ریاست کے قیام کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کیونکہ فلسطین کا وہ علاقہ جس پر بنی اسرائیل قابض ہو چکے تھے چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ ۱۰۳۰ ق'م میں بنی اسرائیل کے پیغمبر حضرت سیموئیل (SAMUEAL) نے ساؤل (SAUL) کو تمام بنی اسرائیل پہلا بادشا نامزد کیا اور اس طرح بنی اسرائیل کی بادشاہت قائم ہوگئی۔ ساول نے شروع میں فلسطینیوں کے مقابلہ میں فتوحات حاصل کیں لیکن آخر میں اسے زبردست شکست ہوئی اور اس نے خودکشی کر لی۔

# حضرت داؤد اور حضرت سلیمان

ساول کے بعد حضرت داؤد بنی اسرائیل کے بادشاہ ہوئے جو پہلے تو یہود قبیلے کے سردار تھے۔ لیکن بعد میں شمالی قبیلوں نے بھی ان کی اطاعت قبول کر لی تھی اور ۱۰۱۰ ق م میں پورے فلسطین پر ان کی بادشاہت قائم ہو گئی تھی۔ حضرت داؤد نے ۱۰۱۰ ق م سے ۹۶۰ ق م تک حکومت کی۔ ان کے دورِ حکومت میں فلسطینیوں کو مکمل شکست دی گئی۔ قرب و جوار کے قبیلوں پر قبضہ کیا گیا اور یروشلم کو فتح کر کے اس سلطنت کا دارالحکومت بنایا گیا۔ حضرت داؤد نے یروشلم میں ''بیت المقدس'' کی تعمیر شروع کرائی۔ جس کی تکمیل حضرت سلیمان کے زمانہ میں ہوئی۔ حضرت داؤد کے زمانے میں فوجی طاقت بڑھ گئی تھی۔ اور یہودی سلطنت مشرق بعید میں سب سے زیادہ طاقتور بن گئی تھی۔ حضرت داؤ کے بعد ان کے لڑکے حضرت سلیمان یروشلم کے تخت پر بیٹھے۔ وہ عقل و دانش اور شان و شوکت میں سب سے ممتاز بن گئے اور ان کا تیس سالہ دور حکومت (۹۶۰ سے ۹۳۰ ق م) یہودی سلطنت کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ میں یروشلم کی دولت تک اور عظمت میں اضافہ ہوا اور فتوحات و تجارت کے ذریعہ بنی اسرائیل طاقتور اور دولت مند قوم سمجھے جانے لگے۔ حضرت سلیمان نے قرب و جوار کی ریاستوں سے تجارت اور سیاسی تعلقات قائم کئے۔ دولت کی فراوانی کی وجہ سے بنی اسرائیل کے اندر سے سادگی ختم ہوئی اور وہ ایک ایسی قوم میں تبدیل ہو گئے جو دنیاوی عزو جاہ کی خواہشمند تھی۔

حضرت سلیمان کے بعد بنی اسرائیل کی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ شمال میں جو حکومت قائم ہوئی اس کا نام ''اسرائیل'' پڑا۔ اور جنوب میں جو حکومت قائم ہوئی وہ ''یہودی'' کہلائی جس کا دارالحکومت یروشلم رہا۔ دو سلطنتوں کے قیام نے یہودیوں کی طاقت کو ختم کر دیا اور آپس میں ان کے درمیان جنگوں کا سلسلہ شروع ہو

گیا۔ دونوں حکومتیں اس قدر کمزور ہو گئیں کہ بیرونی حملہ آوروں کا علیحدہ علیحدہ مقابلہ نہ کر سکیں۔ ۷۲۲ ق م میں آشوریوں نے شمالی حکومت پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لیا۔ لیکن جب آشوریوں کے حکمران سینا چرب نے جنوب کی یہودی حکومت کو فتح کرنا چاہا اور یروشلم کا محاصرہ کیا تو اس کی فوج میں طاعون کی بیماری پھیل گئی اور اسے محاصرہ اٹھانا پڑا۔ لیکن ۵۸۶ ق م میں کلدانی سلطنت کے حکمراں بخت نصر نے نہ صرف یروشلم کو فتح کر لیا بلکہ یہودی سلطنت کا بھی خاتمہ کر دیا اور یہودیوں کو جلاوطن کر دیا۔ ہزاروں یہودی غلام بنا کر بابل لے جائے گئے اور وہ کلدانی سلطنت کے زوال تک بابل میں غلامانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ جب بابل پر ایران کے بادشاہ سائرس اوّل نے قبضہ کیا تو اس نے یہودیوں کو بابلیوں کی غلامی سے نجات دلائی۔ ان کے نبی حضرت دانیال کی عزت افزائی کی اور انہیں یروشلم واپس جانے کی اجازت دی۔ یروشلم میں یہودیوں کی بادشاہت تو قائم نہ رہ سکی۔ لیکن ان کے مذہبی رہنما یروشلم پر قابض رہے اور حکومت کرتے رہے۔ ایرانی سلطنت کے زوال کے بعد فلسطین پر یونانیوں کا اور یونانیوں کے بعد رومیوں کا قبضہ ہو گیا۔ عرصہ تک فلسطین رومن سلطنت کا ایک صوبہ بنا رہا اور یہودیوں کی حیثیت رعایا قوم کی رہی۔ انہوں نے ۷۰ء کے قریب رومن شہنشاہ ٹی ٹس کے خلاف بغاوت کی جس کی پاداش میں یروشلم کو بالکل غارت کر دیا گیا۔ یہودیوں کا قتل عام کیا گیا یا انہیں غلام بنا لیا گیا جو باقی بچے وہ عرصہ تک مظلومانہ زندگی بسر کرتے رہے حالانکہ یروشلم کو یہودیت کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی تھی لیکن یہودیوں نے دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی رہائش اختیار کر لی تھی وہ زیادہ تر سود پر روپیہ کی لین دین کرتے تھے اور رومن سلطنت میں بھی وہ اسی کاروبار میں مشغول رہے۔ بخت نصر کے زمانہ سے یہودی ایک مظلوم قوم رہے ان کے اکثر قبیلوں کو ملک بدر کر دیا گیا اور ٹی ٹس نے جب ۷۰ء میں یروشلم کو تباہ کر دیا تو یہودیوں کو اپنے مرکزی شہر سے بھی نکلنا پڑا اور

جس ملک میں بھی انہوں نے قیام کیا وہاں سے کچھ عرصہ بعد ملک بدر کر دیا گیا۔ یہودی دنیا کے مختلف ملکوں میں رہے لیکن ہمیشہ یروشلم پر قبضہ کرنے اور فلسطین میں اپنی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھتے رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اور امریکہ کی مدد سے فلسطین کے ایک حصہ پر اسرائیل کی حکومت تو قائم تو ہوگئی مگر اس کی ہمسایہ عرب ریاستیں اس کی سخت دشمن ہیں اور وہ اسے ختم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔

یہودی مذہب کی حقیقت اور اس کی تعلیم اور تاریخ کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد ۱۳ اور Encyclopadia of Religions and Ethics, Vol-VII سے مدد لی گئی ہے۔

## یہودی مذہب کی تعریف

بنی اسرائیل میں سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے توحید کے تصور کو پیش کیا ان کے زمانہ تک عرب اور وادی دجلہ وفرات میں مختلف عناصر قدرت کی عبادت ہوتی تھی اور ان کو بتوں کی شکل دے دی گئی تھی ار کے حکمراں ارنمو (جسے مذہبی کتابوں میں نمرود کہا گیا ہے) کے زمانہ میں حضرت ابراہیمؑ نے عناصر قدرت کے بجائے عناصر قدرت کے خالق کی عبادت پر زور دیا۔ یہ تصور ان کے قبیلے کے لوگوں کیلئے بالکل نیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس تصور کو جلد قبول نہیں کیا ان میں اکثر بتوں کی عبادت بھی کرتے رہے اور اکثر خدا کی عبادت کرنے لگے۔ اس عرصہ میں حضرت ابراہیم کا قبیلہ بڑھنے لگا اور ان کے پوتے حضرت یعقوبؑ کے زمانہ تک بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ہو گئے جنہوں نے مصر میں ہجرت کی اور مصر کو اپنا وطن بنانا چاہا۔ مصر میں بنی اسرائیل نے اپنے آپکو مصریوں مین مدغم نہیں کر دیا بلکہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ اپنے قبیلوں سے اپنی زبان اور اپنے آبائی مذہب سے ان کی عقیدت باقی رہی مصر میں حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل کا رہبر بنا دیا گیا اور وہ اپنی امت کو فرعون کے مظالم سے نجات دلا کر

---

شام کے علاقے میں لے آئے۔ یہودیوں[1] کے نزدیک حضرت موسیٰ کی تعلیمات اور ان کے بعد کے پیغمبروں کی تعلیمات جن کتابوں میں محفوظ ہیں انہیں توریت کہا جاتا ہے۔توریت کے انتالیس حصہ ہیں جو ۸۰۷ ق م سے ۱۵۰ ق م تک کے زمانہ میں مرتب ہوئے ان حصوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ' مذہبی تعلیمات' مذہبی دعائیں اور قوانین شامل ہیں۔غرضیکہ توریت میں شاعری' فلسفہ دینیات' تاریخ اور قوانین کا نہایت اعلیٰ امتزاج موجود ہے لیکن حضرت موسیٰ اور دیگر پیغمبروں کی تعلیمات کی روح غائب ہے۔توریت کی یہ کتابیں انجیل کا پہلا حصہ قرار پائیں۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے یہودیوں کو ان کے آبائی مذہب پر چلنے کی دعوت دی تھی لیکن کچھ عرصہ بعد حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کو یہودیت سے علیحدہ سمجھا جانے لگا اور عیسائیت کے بعض بنیادی عقائد یہودیت سے مختلف ہوگئے۔

یہودی مذہب کو عقیدۂ توحید کی ایک خاص صورت کہا جاتا ہے۔ یہودی مذہب عقیدہ سے زیادہ ایک ایسی طاقت ہے جو انسان کی کفر اور کردار پر اثر انداز ہوتی ہے''۔ یہ وہ مذہب ہے جس کی تلقین ابتداء حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی۔ یہ دنیا کے موجودہ مذاہب میں سب سے پرانا (قدیم) مذہب ہے کہا جاتا ہے کہ یہودی مذہب ان دو عظیم الشان مذاہب اسلام اور عیسائیت کا پیش رو ہے جو کرۂ ارض کے بیشتر حصہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور جن کی تعلیمات میں ابراہیمی مذہب کے وہ اصول اور عقائد بھی پائے جاتے ہیں جن پر یہودی مذہب کا بڑی حد تک دارومدار ہے۔

ابراہیم اے نیومن کتاب The Great Religions of the Modern World میں یہودیت پر اپنے مضمون میں لکھتا ہے:

> ''یہودیت ایک ایسا مذہب ہے جس پر ایک چھوٹی قوم یعنی یہودی قوم اعتقاد رکھتی ہے جو دوسری جنگ عظیم سے پہلے اپنی عددی ترقی

---

[1] یہودی مذہب

کی انتہا پر تھی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ اور اب گھٹ کر ایک کروڑ یا ایک کروڑ دس لاکھ ہوگئی ہے جو ایک مجنون ٹولی کا نتیجہ ہے جو اس مذہب اور یہودی قوم کا ملاً صفایا کرنا چاہتی تھی''۔ (صفحہ ۲۲۴)

لیکن یہودیت کی رسمی اور معین تعریف کیا ہے؟ اس کے بارے میں انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

''یہودیت کی کوئی معین اور معروف تعریف کرنا مشکل ہے کیونکہ اس ضمن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کم سے کم اور قطعی طور پر کس چیز کا اقرار ضروری ہے تاہم یہودیت دو اصولوں پر مبنی ہے خدا کی وحدانیت اور بنی اسرائیل کی پسندیدہ اور منتخب امت ہونا' یہودیت' بت پرستی اور متعدد خداؤں کی پوجا یعنی شرک کو مسترد کرتی ہے۔ وہ ایک رب العالمین پر عقیدہ رکھتی ہے''۔ (صفحہ ۵۸۱)

اسی طرح انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا کے مقالہ نگار کی رائے یہ ہے کہ:

''یہودیت کی یوں تعریف کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک ایسا عقیدہ ہے جو توحید خالص پر اعتقاد رکھتا اور اس عقیدہ کے زندگی پر عملی اثر کو تسلیم کرتا ہے'' (جلد ۱۳ صفحہ ۱۰۵) لیکن وہ اس میں تنہا نہیں ہے۔ وہ عالم کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ اچھی جگہ ہے۔ انسان تکمیل ذات کا اہل اور اپنے ارادے کا مختار ہے اس لئے وہ اپنے افعال کا جواب دہ ہے وہ کسی درمیانی واسطے نیز بدی کی طاقت کا بھی منکر ہے انسان آزاد ہے وہ شیطان کا تابع نہیں۔ اور زندگی کی مادی نعمتیں بذات خود بری نہیں۔ اس لئے دولت ایک نعمت بھی ہوسکتی ہے اور لعنت بھی۔ انسان خدا کی صورت پر بنایا گیا ہے۔ اس لئے وہ دیگر

خدائی تخلیقات کی طرح معزز اور محترم ہے نیز اسی وجہ سے تمام انسان مثالی طور پر بھائی بھائی ہیں کیونکہ وہ ابتدا (ازل) میں متحد تھے اور وہ ابد میں بھی باہم متحد ہو جائیں گے اور اسرائیل کی مدد سے آسمانی بادشاہت میں ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں گے یہودی مذہب کا منصب یہ ہے کہ وہ سارے عالم میں امن اور مفاہمت پھیلائے''۔

ایک اور مستند ماہر کی رائے یہ ہے:

''انجیل کی بنیادوں پر بڑے بڑے پہاڑ کھڑے کر دیئے گئے ہیں' لیکن کسی انجیل میں کسی مابعدالطبیعاتی عقیدہ دراصل اسرائیلی مابعدالطبیعاتی عقیدہ کسی معین صورت کی نشاندہی مشکل ہے۔ سوائے اس کے اے بنی اسرائیل سنو' خدا ہمارا الہٰ ہے اور خدا ایک ہے'' یہ عقیدہ دراصل اسرائیلی مابعدالطبیعاتی عقائد کا سنگ بنیاد ہے۔ توحید کا یہ اعلان دراصل ابتداء میں ایک ایسا اقرار تھا جو تعدد الہٰ (متعدد خداؤں کے عقیدہ) کے خلاف تھا اور ایرانیوں کے عقیدہ ثنویت (خیر وشر) کے خلاف ایک چیلنج تھا۔ اور آج تک تثلیث یا کسی ایسے تصور کے خلاف ہے جس میں خدا کا ایسا پیغمبرانہ خیال داخل ہے کہ خدا صرف ایک ہے''۔(120)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ:

''اگرچہ یہودی مذہب میں تبلیغ مذہب کا دروازہ کھلا ہوا ہے تاہم اس میں قربانی ذات کا مطالبہ کیا جاتا ہے اس کے باعث اب وہ غیر تبلیغی مذہب ہو گیا اور دنیا کی اقلیت کا مذہب ہے''۔

# یہودی مذہب کی تعلیمات اور قانون

یہودی مذہب میں دو اصول بہت پہلے سے کارفرما ہے اور یہودیوں کا ان پر عقیدہ رہا۔ پہلا عقیدہ خدا کی وحدانیت کا ہے جس کی بناء پر بت پرستی اوہام پرستی اور شرک کی دیگر تمام صورتوں کو مسترد کر دیا گیا۔ لہذا ان کا عقیدہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی پسندیدہ اور منتخب امت ہیں اور خدا کی نعمتیں صرف ان ہی کیلئے مخصوص ہیں۔ اس عقیدہ کی بناء پر یہودی مذہب کی تبلیغ بنی اسرائیل کے علاوہ دیگر قوموں میں نہیں کی گئی اور یہودیوں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ دنیا کی رہبری اس کیلئے مخصوص ہے اور ایک نہ ایک دن انہیں یہ فرض پورا کرنا ہے۔ یہودی مذہب میں سزا و جزا کا عقیدہ بھی موجود ہے اس عقیدہ کی رُو سے انسان کو اپنے افعال کا جواب دہ ہونا ہے کیونکہ اسے آزاد پیدا کیا گیا ہے لہذا اچھائی یا برائی کا راستہ اختیار کرنے کی اسے مکمل آزادی ہے اگر وہ اچھائی کا راستہ اختیار کرے گا تو موت کے بعد اسے اس کا عوض ملے گا اور اگر وہ زندگی میں وہ راہ اختیار کرے گا جس کی مذہب میں ممانعت ہے تو اس بے راہ روی کی سزا اسے آخرت میں ملے گی۔

حضرت موسیٰ کے احکام عشرہ (Ten-commandments) سے جو انہیں طورِ سینا پر عطا ہوئے۔ یہودی مذہب کی اصلی تعلیمات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ احکام عشری مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ خدا کے سوا کی دوسرے کو معبود نہ بنانا۔

۲۔ کسی جاندار کی صورت نہ بنانا اور نہ اسے سجدہ کرنا۔

۳۔ خدا کے نام کی تعظیم کرنا' بے فائدہ اس کا نام نہ لینا۔

۴۔ ''سبت'' کے دن کی تعظیم کرنا' چھ دن کام اور ساتویں دن کوئی کام نہ کرنا۔

۵۔ خون نہ بہانا

---

یہودی مذہب

۶۔ ماں باپ کی عزت کرنا۔

۷۔ زنا نہ کرنا۔

۸۔ چوری نہ کرنا۔

۹۔ اپنے پڑوسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہ دینا۔

۱۰۔ اپنے پڑوسی کے مکان' بیوی' خادم' خادمہ' مویشی اور چیز کی طرف لالچ کی نگاہ نہ ڈالنا۔

یہ احکامات عشرہ سادہ تھے اور ان پر عمل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ خدا کی وحدانیت کو قائم کیا جاتا اور ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی جاتی جس میں انسان کی عزت اور پڑوسی کے حقوق کی حفاظت ہوتی۔ ابتداء میں یہودیت میں قربانیاں اور مذہبی رسومات پر زور نہیں تھا لیکن بعد میں مذہب کے اندر رسومات داخل ہونے لگیں' خاص خاص موقعوں پر قربانیں دی جانے لگیں اور جب یہودیوں نے کنعان (فلسطین) پر قبضہ کیا تو کنعانیوں کی بعض رسومات اور عقائد کو اپنے مذہب میں داخل کرلیا۔ کچھ عرصہ تک یہودیوں نے کنعانیوں کے دیوتا بال (بچھڑا) کی بھی عبادت کی لیکن جب یہودیوں کے پیغمبروں نے انہیں خدا کے قہر سے ڈرایا تو وہ اس شرک سے باز آئے۔ اکثر و بیشتر یہودیوں کے مختلف پیغمبر انہیں خدا کے قہر اور ناراضگی سے آگاہ کرنے کیلئے مذہب کی سادہ تعلیمات پر زور دیتے رہے۔ حضرت موسیٰ کے احکام عشرہ کی جگہ 'ہفت قوانین' (SABATH) نے لے لی جن میں یہودیوں کو سات باتوں سے منع کیا گیا۔

۱۔ بت پرستی

۲۔ زناکاری

۳۔ قتل کرنا

۴۔ چوری کرنا

۵۔ زندہ جانوروں کے اعضاء کو جسموں سے کاٹ کر کھانا

۶۔ جانوروں کو آختہ کرنا

۷۔ عجیب الخلقت جانوروں کی افزائش نسل کرنا

یہودیت میں ان ہفت قوانین کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی اور اس کی نسبت سے سات کے ہندسہ کو بھی بہت اہمیت حاصل ہو گئی اور چھ دن کام کرنے کے بعد ساتویں دن کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ دشمنوں سے اس دن لڑنا بھی ممنوع قرار دیا گیا۔ ہفتہ کے آخری دن کی رسوامات میں آقا اور غلام یکساں شریک ہوتے تھے اور جانوروں تک کو آرام دیا جاتا تھا۔ ہر چھ سال بعد ساتویں سال نہ زمین پر کاشت کی جاتی تھی اور نہ غلہ اور انگوروں کو جمع کیا جاتا تھا۔ قرضوں کو معاف کر دیا جاتا تھا تاکہ لوگوں کو غربت کی مصیبت سے نجات ملے سات مرتبہ سات سال کے بعد ایک جوبلی سال منایا جاتا تھا جس میں تمام غلام آزاد کر دیئے جاتے تھے زمینوں پر سے افراد کی ملکیت ختم سمجھی جاتی تھی اور وہ قبیلوں کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور انہیں نئے سرے سے افراد میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ تصور یہ تھا کہ زمین پر خدا کی ملکیت ہے انسان زمین کی پیداوار کو بڑھا تو سکتا ہے لیکن زمین کو فروخت نہیں کر سکتا۔ مندرجہ بالا اصولوں پر پوری طرح تو عمل نہیں ہوا مگر جو تھوڑا بہت عمل ہوا اس کا مقصد یہی تھا کہ یہودیوں میں دولت کی مساویانہ تقسیم ہو سکے۔

مذہبی تعلیمات کی رُو سے قرض دی ہوئی رقم پر کسی قسم کا سود لینا یہودیوں کے لئے جائز نہیں تھا۔ لیکن یہودی جب ایک تاجر پیشہ قوم بن گئے اور روپیہ کی لین دین زیادہ ہونے لگی تو انہوں نے ایسے قوانین بنا لئے جن کی رُو سے وہ روپیہ کی لین دین کے سلسلے میں معاہدے کر سکیں اور منافع کما سکیں کچھ ہی عرصہ بعد یہودی ایک سود خور قوم سمجھی جانے لگی۔ اور یہودی کا لفظ کنجوس' ظالم اور سود خور کے معنوں میں استعمال کیا

ہا نے لگا۔

"یہودی مذہب کی تعلیمات اور قانون کے دو حصے ہیں۔ ایک تحریری قانون، دوسرا زبانی قانون حضرت موسٰیؑ پر وادی سینا میں جس قانون کا الہام ہوا تھا اس کے احکامات پورے طور پر واضح نہیں ہیں حضرت موسٰیؑ کوہ طور پر چالیس دن تک مقیم رہے اور اس حالت میں ان کو ہدایات ملتی رہیں۔ جو تحریری (مکتوبی) قانون کی تشریح ہیں۔ یہ زبانی قانون کہلاتی ہیں اور ان کو وادی سینا میں حضرت موسٰیؑ پر عطا شدہ قانون کہا جاتا ہے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ زبانی قانون بعد کے مذہبی رہنماؤں کی من گھڑت باتیں ہیں اور کسی حد تک یہ قول صحیح ہے کیونکہ واقعہ تو یہ ہے کہ زبانی قانون کا بڑا حصہ قدیم یہودی روایات ہیں جن کا ایک حصہ بلاشبہ سامی یہودیوں نے سامی نسل کے مشترکہ رسوم و قانون سے حاصل کیا تھا"۔

(انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا صفحہ ۱۶۶ جلد ۱۳)

## یہودی مذہب کی تعلیمات دنیاوی معاملات پر بھی حاوی ہیں

ابراہیم اے نیومن لکھتا ہے:

"مذہب اور قوم کے درمیان نا قابل شکست رشتہ یہودیت کا بنیادی حصہ ہے"۔(121) "اس سلسلہ میں اسرائیل مذہب کا محافظ ہے، جس کی روح دنیا سے تعلق رکھتی ہے"۔(122)

مذکورہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہے کہ یہودی مذہب تین سامی مذاہب، اسلام عیسائیت اور یہودیت کے منجملہ ہے۔ ان تینوں مذاہب کا سلسلہ ابراہیمی مذہب سے ملتا ہے جس کی تعلیم حضرت ابراہیمؑ نے دی تھی۔ یہودی مذہب کی تعلیم حضرت موسٰیؑ

نے خدا کے حکم کے مطابق دی۔ وہ خدا کے جلیل القدر پیغمبر تھے جن کو توریت (صحیفہ، آسمانی) دی گئی تھی۔ اس طرح یہ مذہب غیر سامی مذاہب کے برخلاف ایک الہامی مذہب ہے جو سامی مذاہب کی ایک مشترکہ خصوصیت ہے۔ بلحاظِ قدامت زمانہ یہ نہ صرف اپنے ہم خاندان مذاہب (عیسائیت اور اسلام) سے مقدم ہے بلکہ وہ مشرق کے دیگر غیر الہامی مذاہب سے بھی قدیم ہے۔ چاہے وہ آریائی ہوں یا منگولی۔ چنانچہ بیان ہو چکا ہے کہ یہودی مذہب کی بناء آٹھ صدی قبل مسیح میں پڑی لیکن مشرق کے قدیم مسیح میں ہوئی تھی جس کے معنی یہ ہیں کہ ان قدیم مذہب سے بھی یہودی مذہب تقریباً سو سال پُرانا ہے۔

## یہودیوں کی اجتماعی حالت

توریت کے احکام اور خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ کی نافرمانی، نیز حضرت موسیٰ کی تکذیب کی بناء پر یہودی دنیاوی اقتدار سے محروم اور غضب الٰہی میں مبتلا ہو گئے۔

وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ وباء وا بغضب من اللہ (آلم بقرہ آیت ۶۱)

(ترجمہ) ان پر ذلت و بے چارگی طاری کی گئی اور وہ خدا کے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔

چنانچہ ۱۷ عیسوی میں جب (Titus) ٹیٹس نے ان کو فلسطین سے نکال باہر کیا اور ان کا معبد تباہ کر دیا تو پھر وہ در بدر کی خاک چھاننے لگے۔ اور ہزاروں سال سے دنیا کے دور دراز ممالک میں منتشر اور بسے ہوئے ہیں۔ پھر بھی انہیں بمشکل کہیں چین نصیب ہوا۔ ہر جگہ وہ دیگر اقوام اور مذاہب کے مظالم اور تشدد کا شکار ہوئے۔ مثلاً ڈاکٹر آرنلڈ اپنی کتاب ''دعوت اسلام'' کے صفحہ ۹۳ پر لکھتے ہیں:۔

''ساڑھے تین سو برس تک سلطنتِ انگلستان نے یہودیوں کو اپنے

ملک میں داخل ہونے نہیں دیا۔ لیکن یہودیت کی قوم بڑی سخت جان تھی کہ دیگر مذاہب اور خصوصاً عیسائیت کے تشدد کے باوجود اپنے آپ کو باقی رکھ سکی' اس کوشش میں ان کو مسلمان کی رواداری سے کافی سہارا ملا''۔

تمام مصنفین غیر جانبدار مصنفین (جن میں عیسائی مصنفین بھی داخل ہیں) اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ مغرب کی نشاۃ ثانیہ سے پہلے عیسائیوں کے متعصّبانہ اور متشددانہ برتاؤ کے مقابلے میں صدیوں تک انہیں صرف اسلامی مملکتوں میں پناہ مل سکی۔ چنانچہ ایک عیسائی اڈورڈ عطیہ اپنی کتاب The Arabs کے صفحہ ۱۲۵ پر لکھتا ہے:

''جیسا کہ ہم اس کتاب کے پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں یہودیوں نے ان علمی اور سائنٹیفک مساعی میں بڑا خوش آئند اور ممتاز حصہ لیا تھا' جنہوں نے بغداد اور اسپین کے خلفاء کے تحت عرب تہذیب کو پیدا کی تھا۔ عربوں اور ترکوں کی حکومت کی پوری تاریخ میں عرب ممالک میں یہودی اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا گیا۔ جب یورپ میں یہودیوں کو ہدفِ ظلم وستم بنایا جا رہا تھا تو انہیں صرف مسلمانوں کی حکومت میں پناہ ملی''۔

## اسلام کا اثر

یہودیوں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری کا طرزِ عمل ہی مسلمانوں کا یہودیوں پر تنہا احسان نہیں ہے' بلکہ یہودی مذہب کے ارتقاء میں بھی اس نے بڑا حصہ لیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک یہودی عالم کی شہادت یہ ہے:۔

''مسلمانوں کے اثر کے ماتحت اور بعد ازاں عیسائی مدرسیت کے برخلاف یہودیت اپنے نقطۂ نظر کو مسلمہ طریقے کے مطابق منظّم

کرنے پر مجبور ہوئی۔ جس کے باعث بآسانی وہ مقابل کے غالب اور حریف ادیان سے اپنے موافق و مخالف پہلوؤں کو نمایاں کر سکی"۔(123)

لیکن جب عیسائیت کا جوشِ انتقام کم ہوا تم اپنی ذہنی برتری اور کاروباری صلاحیت کے باعث یہودی' عیسائی ممالک میں بھی با اثر ہو گئے۔ دوسری طرف عالم اسلام کے سیاسی زوال کے باعث مغرب کا اس پر معاشی اور سیاسی تسلّط عام اور مستحکم ہو گیا نیز مغرب میں قومیت کا غلبہ ہو گیا' تو یہودیوں کی سیاسی اُمنگیں تازہ ہو گئیں' اور انہوں نے اولاً ایک قومی وطن اور پھر ایک قومی مملکت کا خیال پکانا شروع کیا۔ چنانچہ "بیتھ من" اپنی کتاب (BRIDE TO ISLAM) میں لکھتا ہے:

"یہودیت کی پہلی چنگاریاں (LEOPINS KER) لیوپنسکر نے ۱۸۸۲ء میں روشن کیں' جو ایک روسی یہودی تھا۔ اور یہ ۱۸۸۱ء میں الگزنڈر دوم' زار روس کے قتل کے بعد پیش آیا۔ Pensker نے ایک کتاب لکھی جو "خود مختاری" (Auto Emanspation) کے نام سے موسوم ہے۔ تھیوڈر ہرزل نے اپنی کتاب یہودی مملکت کے ذریعہ ان چنگاریوں کو ۱۸۹۶ء میں باسل کے مقام پر پہلی صیہونی کانفرنس منعقد ہوئی۔ ہرزل نے اپنی تجاویز کو بروئے کار لانے کیلئے وقت وسعی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ پہلے پہلے یہودیوں کی آبادکاری کیلئے کوئی مخصوص ملک میں پیشِ نظر نہ تھا۔ ارجنٹائن' یوگنڈا' اور کینیا کے بارے میں خیال آرائی تھی۔ لیکن بہت جلد مشرقی یہودیوں کا اثر محسوس کیا جانے لگا۔ جنہوں نے اپنے قدیم وطن فلسطین کا مطالبہ شروع کیا۔ وہ کسی اور ملک پر راضی نہ تھے۔ لیکن ۱۹۱۱ء تک صیہونیوں کا خیال صرف ایک صیہونی گھر (وطن) کا قیام تھا نہ کہ صیہونی مملکت۔ بارسل کے مقام پر ۱۹۱۱ء میں جو دسویں کانفرنس ہوئی تو صدر نے حسبِ ذیل بیان دیا:

---

یہودی مذہب

''صیہونیت کا مدعا یہودی قوم کیلئے سرکاری طور پر تسلیم شدہ اور قانونی طور پر حاصل شدہ فلسطین میں ایک وطن کا قیام ہے۔ یہودی مملکت کا نہیں بلکہ ہمارے آباواجداد کی قدیم سرزمین پر ایک گھر بنانا ہے جہاں ہم بغیر کسی جبروتعدی کے ایک یہودی زندگی گزار سکیں۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ فلسطین میں داخل ہونے والے تارک الوطن کو بغیر کسی تحدید کے ایک شہری کے حقوق حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ اور اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ یہودی رسم ورواج کے مطابق بغیر کسی رکاوٹ کے زندگی گذار سکیں' یہی اور صرف یہی ہمارا مقصد ہے''۔

ان توقعات کی حقیقی تکمیل کا پہلا قدم اٹھایا گیا' جبکہ ڈاکٹر چیم ویزمن سے انگلستان کے حق میں اس کی قیمتی خدمت کے معاوضہ میں (یعنی کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں ایجاد) برطانوی حکومت کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ برطانوی حکومت فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کی ہمدردی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہ نومبر ۱۹۱۷ء کا مشہور اعلان بالغور ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

''ملک معظم کی حکومت یہودی قوم کیلئے فلسطین میں ایک قومی وطن کے قیام کو ہمدردی سے دیکھتی ہے اور اس مقصد کے حصول میں سہولت پیدا کرنے کیلئے اپنی بہترین کوششوں کو استعمال کرے گی۔ لیکن یہ صاف طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی ایسی بات نہ کی جائے گی جو فلسطین کے موجودہ غیر یہودیوں قوموں کے موجودہ دیوانی اور مذہبی حقوق یا دوسرے ملک میں یہودی کو حاصل شدہ حقوق یا سیاسی مرتبہ کے خلاف ہو''۔

کہا جاتا ہے کہ یہ اعلان امریکہ کے مشورہ اور رضامندی سے ہوا تھا

''صدر امریکہ نے اعلان بالفور کے وجود میں لانے میں کافی حصہ لیا ور ۱۹۴۸ء میں صدر ٹرومین کے تحت ممالک متحدہ امریکہ نے اسرائیل کی آزاد مملکت کے وجود میں لانے میں کافی امداد کی''۔

(Muslim on the March, P-488)

اعلان بالفور کے ذریعہ یہودی قوم کیلئے فلسطین میں ایک قومی وطن کے قیام کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ قطع نظر اس امر کے کہ عربوں کے ساتھ ''میک موہن وعدہ (MACK MOHAN PLEDGE) اور متحدہ برطانوی و فرانسیسی اعلان مورخہ ۷-نومبر ۱۹۱۸ء کے مطابق نہیں سمجھا جا سکتا' وہ صدر ولسن کے ''چودہ نکات'' کے پہلے اصول کے بھی خلاف تھا۔ نیز اس میں کہیں بھی یہودی سلطنت کے قیام کا صراحتاً وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔ لیکن ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۴۸ء عیسوی تک تیس سال کی مدت میں ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ مقامی آبادی (مسلمانوں اور عیسائیوں) کی مرضی کے خلاف یہودی سلطنت قائم کی گئی' اس تیس سالہ دور میں کس طرح یہودی سلطنت کے قیام کا راستہ صاف کرنے کیلئے یہودیوں کی آبادی کو فلسطین میں ٹھونسا گیا' اس کا یوں اندازہ ہوگا کہ اعلان بالفور سے پہلے یہودی فلسطین کی آبادی میں ایک لاکھ تھے۔

''فلسطین عرب دنیا کا ایک غیر منفک جزو تھا جو شام سے غیر ممیز تھا اور اس کی آبادی نوے فی صد عرب آبادی تھی''۔

(The Arabs, صفحہ ۹۴)

لیکن آج حال یہ ہے کہ یہ تناسب معکوس ہوگیا اور یہودی نوے فی صد سے زائد اور عرب دس فی صد سے کم ہیں۔ یہ نتیجہ خلافِ توقع نہیں' کیونکہ شروع ہی سے صیہونی یہودیوں کے عزائم یہی تھے کہ فلسطین میں بیرونی یہودیوں کو لا کر بسایا جائے اور مقامی آبادی پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں جو کمیشن (کنگ کرین کمیشن (King

(Crane Commission بٹھایا گیا تھا وہ اس سے واقف ہو چکا تھا۔ اسی طرح ۱۹۲۲ء میں جو (HAYCRAFT COMMISSION) ہیکرافٹ کمیشن برطانوی حکومت نے بٹھایا تھا' اس کے سامنے بھی یہودی گواہوں نے ان عزائم کا اظہار کر دیا تھا۔ اس طرح یہودیوں سے فلسطین میں ''قومی وطن'' کے قیام کا جو وعدہ کیا گیا تھا وہ بداہتا عربوں کے فطری اور قومی حقوق کے معارض تھا' اور اس طرح یہودیوں اور عربوں کے متضاد مفادات اور حقوق میں مصالحت کی کوشش خود فریبی اور دھوکہ تھا جس کو محسوس نہ کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۹۲۹ء تک عربوں اور یہودیوں میں مسلسل فسادات ہوتے رہے۔ بالآخر ۱۹۳۹ء میں جونریز لڑائی ہوئی۔ اس کے مدِنظر ۱۹۳۰ء میں مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی مزدور حکومت کو اس مسئلہ کے متعلق دوسری مرتبہ برطانوی حکومت کی پالیسی کا اعلان کرنا پڑا' جو یہودیوں کے خلاف تھی لیکن برطانیہ میں یہودیوں کے اثر کے باعث یہودیوں کو مزدور حکومت سے اپنے رویہ میں تبدیلی اور یہودیوں کے حق میں اس نئی دستاویز کے حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی جس کو عرب ''سیاہ دستاویز'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اس کے بعد چونکہ جرمنی میں نازی برسر اقتدار آ گئے اور انہوں نے یہودیوں کی خبر لینی شروع کی اس لئے یہودی جرمنی سے بھاگ کر فلسطین میں جمع ہونے شروع ہوئے اور یہ رفتار یوماً فیوماً ترقی کرتی گئی' تا آنکہ سالانہ ساٹھ ہزار کی خطرناک حد پر پہونچ گئی۔ یہ سلسلہ چار سال (۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء) تک جاری رہا' اور اس طرح چار سال کی قلیل مدت میں دو لاکھ سے زائد یہودی فلسطین کے چھوٹے سے ملک میں جس کی آبادی تقریباً بارہ لاکھ تھی داخل ہو گئے اور انہوں نے اپنی قوت کو مستحکم کر لیا۔ اس خطرناک صورتِ حال سے مجبور ہو کر ۱۹۳۶ء میں عربوں نے مقاطعہ کا آغاز کیا' جو وہ ماہ جاری رہا اور عرب مجاہدین نے یہودیوں کا مسلح مقابلہ شروع کیا جس کو دبانے

کیلئے بیس ہزار برطانوی فوج موجود تھی۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم کے آغاز تک عربوں کی مسلح مقاومت کو کچلا نہ جا سکا۔ کیونکہ عرب صاف طور پر یہ دیکھ رہے تھے کہ کس طرح یہودی فلسفہ میں اپنی آبادی کے غلبے کا سامان کر رہے ہیں' اس مقصد کے لئے کس طرح نازیوں کے مظالم کے واقعات اور افسانوں سے عالمی رائے عامہ کو دھوکہ دے رہے ہیں' یہودیوں کی معاشی ترقی ہے ملک کے معیار زندگی میں اضافہ کے فائدے کو اچھال رہے ہیں' اور اس طرح بتدریج فلسطین میں اپنے اثر کو بڑھا کر اپنے سیاسی اقتدار کا سامان کر رہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک عربوں کی اس مقابت کے نتیجے میں ۲۹ برطانوی' ۹۲ یہودی' ۴۸۶ عرب سویلین اور ۱۱۳۸ عرب مجاہدین کی جانیں ضائع ہوئیں۔ (The Arabs صفحہ ۱۳۰)۔

اس صورتِ حال کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے ایک رائل کمیشن اس غرض روانہ کیا کہ فلسطین کے فسادات کے اسباب کی دوبارہ تحقیقات کرے اور ان کا حل پیش کرے کیونکہ اب برطانوی حکومت پر پورے طور پر سے یہ واضح ہو چکا تھا کہ صیہونی آرزوؤں اور عربوں میں مصالحت ناممکن ہے جس پر وہ اعلان بالفور کے بعد سے کاربند تھی' کمیشن نے فلسطین کی دو حصوں میں تقسیم کی تجویز پیش کی۔ جس کو یہودیوں کے طاقتور دعایہ نے منصفانہ ثابت کرنے کیلئے مغرب میں بڑا کام کیا اور یہی بالآخر ۱۹۴۸ء میں متحدہ اقوام کی تجویز تقسیم کی بنیاد بنا۔ عربوں نے اس کی سخت ناراضی سے مخالفت کی۔ کیونکہ انہیں یہودی وطن کے بارے میں اپنے بدترین مگر مبہم اندیشے پورے ہوتے نظر آئے۔ کہ ان کے قلب میں ایک بیرونی مملکت قائم ہو گی۔ تمام عرب ممالک اور حکومتوں میں اس تجویز کے خلاف ایک طوفان برپا ہوا اور مجاہدین کی جدوجہد آزادی اور بڑھ گئی۔ عربوں کے دو مطالبات تھے:

(۱) یہودیوں کا داخلہ بند کیا جائے۔ اور

(۲) تقسیم کی تجویز مسترد کر کے مقامی آبادی کو آزادی دی جائے۔

چونکہ ۱۹۳۹ء کے اوّاخر میں یورپ پر دوسری جنگ عظیم کے بادل منڈلا رہے تھے اور مغربی طاقتیں عربوں کو اپنا دشمن نہ بنانا چاہتی تھیں' اس لئے انہوں نے اس تجویز کو ملتوی کر دیا۔ ۱۹۳۹ء کی جنگ کے بعد برطانوی حکومت نے تقسیم فلسطین کی تجویز پیش کی اور یہودیوں کے قومی وطن کے ادعاء کی تردید کی۔ اس کے بعد وُڈ ہیڈ کمیشن (Wood Head Commission) قائم کیا گیا۔ تاکہ وہ تقسیم کے متعلق معین تجاویز پیش کرے۔ اس کے نتیجہ میں ۱۹۳۹ء میں حکومت نے ایک قرطاس ابیض شائع کیا جس میں حکومتِ برطانیہ نے اپنے اس ارادہ کا اعلان کیا کہ وہ اندرون دس سال ایک آزاد فلسطینی مملکت قائم کرے گی' جس میں عربوں اور یہودیوں کو اس طرح حکومت میں حصہ دیا جائے گا کہ وہ ہر قوم کے مفادات کی ضامن ہو۔ نیز دس سال کے درمیان میں ڈیڑھ لاکھ یہودیوں کو ملک میں داخل کیا جائے گا۔ اس طرح تقسیم کے ذریعہ فلسطین میں یہودی سلطنت کے قیام کے ارادے کو ۱۹۳۹ء تک مسترد کیا جاتا رہا۔ لیکن یہودیوں کے دباؤ کے تحت یہ وعدہ بھی پورا نہ ہوا۔ اس اثناء میں چونکہ دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی تھی اس لئے اس سے یہودیوں نے پورا فائدہ اٹھایا' اور ۱۹۴۴ء میں اتحادیوں کی مدد کے بہانے یہودی اپنی ایک مستقل بریگیڈ بنانے میں کامیاب ہو گئے' جن کا اپنا جداگانہ جھنڈا تھا۔ اور اسکو برطانوی افواج کا جز بنا دیا گیا۔ جب جنگ ختم ہوئی تو صدر ٹرومن کے اصرار پر برطانوی حکومت' یورپ کے مزید ایک لاکھ یہودی کو فلسطین میں داخل کرنے پر مجبور ہوئی کیونکہ:

> ''برطانیہ میں صیہونی طاقتور تھے' لیکن وہ ممالک متحدہ امریکہ میں زیادہ طاقتور تھے جہاں نیویارک اور ایلینائس (Illinois) میں انتخابی رائے میں ان کا فیصلہ کن حصہ تھا' جو صدارت کے انتخاب کو

بدل سکتا تھا' اس لئے وہاں ان کے درپردہ مذاکرات ارکان کانگریس اور دونوں پارٹیوں کے گورنروں پر دباؤ ڈال سکتے تھے"۔

(The Arabs, P-172)

لیکن دوسری جنگ عظیم کے اختتام سے کچھ پہلے لیبر پارٹی انگلستان میں برسرِ اقتدار آ گئی جس نے فلسطین میں یہودیوں کے غیر محدود داخلہ کی قرارداد منظور کی اور کہا کہ "یہودیوں کے فلسطین میں داخل ہونے اور عربوں کے فلسطین سے باہر جانے کی ہمت افزائی ہونی چاہیئے"۔ (صفحہ ۲۷۴ The Arabs.)

اس کے بعد ایک مشترکہ (برطانوی اور امریکی کمیٹی) قائم ہوئی جس نے مزید یہودیوں کے داخلہ کی سفارش کی' گو اس کا بھی اظہار کیا گیا کہ "آبادی کے دوسرے طبقات کے حقوق اور موقف کو متاثر نہیں ہونے دیا جائے گا"۔ اس کے بعد عربوں نے انتداب کے ختم کرنے' انگریزوں کے چلے جانے اور جمہوری بنیادوں پر ایک آزاد فلسطینی حکومت کا مطالبہ کیا۔ اسی دوران میں برطانوی حکومت نے اصرار کیا کہ "برطانوی اور امریکی حکومتوں کی مقرر کردہ کمیٹی کی سفارش کے مطابق مزید یہودیوں کے فلسطین میں داخلہ کی شرط یہ ہے کہ یہودی دہشت پسندی ختم کی جائے اور ان کی زیرزمین تنظیمیں ختم کی جائیں"۔ اس پر یہودیوں نے ایک طرف غیر قانونی داخلہ جاری رکھا اور دوسری طرف دہشت پسندی میں شدت پیدا کی۔ چنانچہ بیت المقدس کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل (King David Hotel) کے ایک بازو کو اُڑا دیا۔ اس کے بعد پھر برطانوی اور امریکی حکومتوں نے ایک اور تجویز پیش کی کہ "یہودیوں اور عربوں کی دو آزاد مگر وفاقی حکومتیں بنائی جائیں"۔ لیکن یہودیوں نے اس کو بھی مسترد کر دیا' کیونکہ وہ ملک کا بہترین اور ۶۵ فیصدی حصہ چاہتے تھے اس کے بعد برطانوی حکومت نے ۱۹۴۷ء میں ایک کانفرنس میں عرب حکومتوں کو مدعو کیا۔ لیکن اس کا بھی کوئی خوشگوار نتیجہ نہیں نکلا۔ بلکہ

اس دوران میں یہودیوں کا غیر آئینی داخلہ اور خفیہ فوجی تیاریاں جاری رہیں۔ ۱۹۴۷ء کے موسم بہار میں متحدہ اقوام نے ایک کمیٹی بٹھائی۔ جس کی اکثریت نے تقسیم فلسطین اور ایک یہودی اور ایک عرب مملکت کے قیام کی سفارش کی۔ جس میں ملک کی ایک تہائی یہودی آبادی کو ملک کا بڑا اور زیادہ زرخیز حصہ دیا گیا نیز ساحلی میدانوں کا مفید ترین حصہ اور تنہا عمدہ بندرگاہ دی گئی' اور اس طرح عرب موثر بحری مواصلات سے کٹ گئے۔ نیز ان کی آبادی کا نصف یعنی ۵ لاکھ عرب یہودی سلطنت میں چھوڑ دیئے گئے۔ (The Arabs. صفحہ ۱۷۷)

لیکن برطانیہ نے اس اسکیم کے تعمیل کنندہ کے منصب کو ادا کرنے پر رضا مندی سے انکار کیا اور انتداب سے دست برداری کا اعلان کیا' اور اپنی غیر جانبداری ظاہر کرنے کیلئے اس اسکیم کے مباحث میں حصہ لینے سے انکار کیا۔ لیکن متحدہ اقوام کی اسمبلی نے ۲۹- نومبر ۱۹۴۷ء کو تقسیم فلسطین کی قرارداد منظور کی جس میں ممالک متحدہ امریکہ بڑا حصہ ہے۔ اس واقعہ کو مانچسٹر گارڈین نے بھی تسلیم کیا ہے جو ہمیشہ سے صیہونیت کا کھلا مویئد ہے اسی طرح "Time" نے یہ تنقید کی:

> ''نمائندوں کا عام احساس یہ تھا کہ تقسیم کی تجویز سوائے نیویارک کے کسی اور شہر میں منظور نہ کی جاسکتی تھی' کیونکہ اس شہر میں یہودیوں کا اثر ہے''۔ (صفحہ ۱۷۹)

انگلستان کے اس اصرار کے بعد کہ ۱۵- مئی ۱۹۴۸ء کو وہ اپنا انتداب ختم کر کے فلسطین سے اپنی فوجیں واپس بلا لے گا' متحدہ اقوام کی طرف سے فلسطین میں امن برقرار رکھنے کیلئے کوئی بندوبست نہ کرنے کے باعث یہودیوں کو اس امر کا موقع مل گیا کہ وہ بزورِ قوت ۱۹۴۸ء میں فلسطین میں اپنی حکومت قائم کریں۔

'' چنانچہ ۱۴- مئی ۱۹۴۸ء کو انتداب کے ختم ہونے سے چند گھنٹے پہلے

یہودیوں نے مملکت اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا اور صدر ٹرومن نے فوراً اسکو تسلیم کر لیا''۔(صفحہ ۱۸۰)

یہودیوں کی اس ناجائز حکومت کے قیام اور اس کے اقتدار سے بچنے کیلئے عربوں نے جو مقاومت کی اس کی ناکامی کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے۔ الغرض اس طرح تمام سابقہ بین الاقوامی مواعید کے برخلاف یہودیوں نے اپنے بین الاقوامی اثر' مالی قوت' اور بہتر اسلحہ کی مدد سے مقامی عرب آبادی کی مرضی کے خلاف فلسطین میں اسرائیلی حکومت قائم کر لی۔ جس میں یہودیوں کو متحدہ اقوام کے جنگ بند کرنے کے فیصلہ سے بڑی مدد ملی کیونکہ عربوں کو ہوائی برتری حاصل تھی اور یہودی بیت المقدس کے نئے حصہ میں ہتھیار ڈالنے کو تھے''۔(صفحہ ۱۸۱ (The Arabs.

یہودی سلطنت کے قیام کے افسوسناک تاریخ کا خلاصہ اڈورڈ عطیہ کے الفاظ میں یہ ہے:

''اس طرح وقتی طور پر تاریخ کا المناک ترین باب ختم ہوا' ایک ایسا باب جو اس کے تمام شرکاء پر (بشمول عربوں کے جو اس کا ہدف ہیں) بُری روشنی ڈالتا ہے۔ صیہونیوں نے ایک مجنونانہ خواب کو آگے بڑھایا جو صرف عربوں کو کاری زخم پہنچا کر پورا کیا جا سکتا تھا۔ برطانیہ نے تیس سال تک اس خواب کی تکمیل کیلئے مسلسل اعانت کی' اور اس کے لئے مسلسل عربوں کو طفل تسلی دیتا رہا اور ان سے وعدہ خلافی کرتا رہا۔ امریکہ نے متحدہ اقوام سے تقسیم کی تجویز منظور کرانے کیلئے قابل اعتراض محرکات اختیار کئے۔ ثالث کی حیثیت سے خود متحدہ اقوام کی ناکامی الم نشرح ہے جس نے اسرائیل کو اپنی قراردادوں کو بغیر کسی عقوبت کے توڑنے کی اجازت دی۔ ان

سب پر مستزاد مغرب میں عربوں کے ایک سچے دوست کے الفاظ میں عرب اپنے مفاد کی حفاظت کے اہل ثابت نہ ہوئے کیونکہ کسی مفاد کا اخلاقی حیثیت سے ناقابل شکست ہونا نہایت خود فتح کی ضمانت نہیں' اور باوجود ان تمام بین الاقوامی اثرات کے جو ان کے خلاف مجتمع ہو گئے تھے۔ عرب فلسطین کی لڑائی جیت سکتے تھے بشرطیکہ خود ان کے اندر کوئی خرابی یا نقص موجود نہ ہوتا"۔

(The Arabs. صفحہ ۱۸۵)

## اسرائیل مملکت کا قیام بین الاقوامی مواعید کے خلاف تھا

اعلان بالفور کے بعد ۱۵- مئی ۱۹۴۸ء تک جبکہ برطانوی انتداب ختم ہوا۔ برطانوی حکومت کی طرف سے ذمہ دارانہ طور پر مسلسل یہی کہا جاتا رہا کہ اعلان بالفور کے ذریعہ یہودی سلطنت کے قیام کا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔ قدامت پرست پارٹی کے مسٹر چرچل نے حکومت کی طرف سے صیہونیوں کے اس ادعاء کی تردید کی کہ "فلسطین ایسا ہی یہودی ہونا چاہیئے جیسا کہ انگلستان انگریزی ہے"۔ اسی طرح ۱۹۳۰ء میں مزدور پارٹی کے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی حکومت نے بھی یہودیوں کے ادعاء کو مسترد کیا۔

نیز اپریل ۱۹۴۶ء میں برطانوی اور امریکی کمیٹی تحقیقات نے بھی اپنے ایقان کا اظہار کیا تھا کہ فلسطین میں کوئی یہودی سلطنت نہیں قائم کی جائے گی۔ چنانچہ کمیٹی کے الفاظ یہ ہیں:

"ہم اس امر کو ضروری خیال کرتے ہیں کہ فلسطین میں یہودی' عربوں پر غالب نہ ہوں اور نہ عرب یہودیوں پر غالب ہوں اور فلسطین میں نہ یہودی مملکت ہو اور نہ عرب مملکت۔ فلسطین میں مآل

کار ایک ایسی مملکت ہو جو مسلمانوں' یہودیوں اور عیسائیوں کے حقوق اور مفادات کے مساوی طور پر نگہبان ہو...... ہم نہایت پُر زور طریقہ سے اعلان کرتے ہیں کہ فلسطین ایک مقدس سرزمین ہے جو عیسائیوں' یہودیوں اور مسلمانوں کے نزدیک برابر محترم ہے۔ اور چونکہ یہ ایک مقدس ملک ہے' اس لئے فلسطین ایسا ملک نہیں ہو سکتا جس پر ایک نسل یا ایک مذہب اپنے تنہا دعوے کو منصفانہ خیال کرے...... واقعہ یہ ہے کہ ایک مقدس سرزمین ہے اور وہ دوسرے ممالک سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتی ہے' اور وہ انسانی برادری کے تصورات اور اعمال کیلئے مختص ہے' نہ کہ تنگ نظر قومیت کیلئے''۔

(The Age of Conflict. صفحہ ۸۷)

یہ وہ نقطۂ نظر ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ لارڈ مینن (Loard Moyne) برطانوی وزیر مملکت برائے مشرق وسطیٰ کو قاہرہ میں اسی کی پاداش میں ۱۹۴۴ء میں یہودی دہشت پسندوں نے قتل کیا۔ اور اسی طرح سینکڑوں برطانوی عہدہ داروں کو قتل کیا گیا۔ کیونکہ وہ ۱۹۴۴ء کے برطانوی حکومت کے قرطاس ابیض کے اس فیصلہ کے حامی تھے کہ:

''ملک معظم کی حکومت یقین رکھتی ہے کہ انتداب کے مصنفین (جس میں اعلان بالفور کو شامل کیا گیا ہے) یہ ارادہ نہیں رکھتے تھے کہ فلسطین کو ملک کی عرب آبادی کی مرضی کے خلاف ایک یہودی سلطنت میں تبدیل کر دیا جائے''۔ (The Age of Conflict. صفحہ ۲۵۴)

لیکن ۱۵- مئی ۱۹۴۸ء کو برطانوی انتداب کے ختم ہوتے ہی یہودی عارضی حکومت نے اسرائیلی سلطنت کے قیام کا اعلان کیا' جس کو فوراً ممالک متحدہ امریکہ نے اور اس کے

چند ہی دنوں بعد سویٹ یونین نے تسلیم کر لیا' اور اس طرح بین الاقوامی مواعید کے خلاف ورزی میں اسرائیلی مملکت کا قیام عمل میں آیا اور اس کی مقاومت کیلئے اردن' عراق' شام' مصر اور لبنان نے جو کوششیں کیں ان کو (ان ہتھیاروں کی مدد سے جو بڑی تعداد میں دوسری جنگ عظیم کے دوران میں یہودیوں نے جمع کیا تھا' یا جمہوری افواج کے ذخائر سے چُرایا تھا) یہودیوں نے ناکام بنا دیا' اس لڑائی کو بند کرانے کیلئے متحدہ اقوام نے سویڈن کے کونٹ برناڈ کو بھیجا۔ لیکن ان کو بھی ستمبر ۱۹۴۸ء میں یہودیوں نے قتل کر دیا اور

"اسرائیلی حکومت نے متحدہ اقوام کے جنگ بند کرنے کے احکام کو ٹھکرا دیا"۔ (The Arabs. صفحہ ۱۷۴)

اس کے بعد ۱۹۵۵ء تک وہ فلسطین کے مقبوضہ علاقہ پر قابض رہے اور فروری ۱۹۵۵ء میں اچانک مصر کے مقبوضہ علاقہ' غزہ پر بے رحمانہ حملہ کیا۔ اس کا نتیجہ طرفین کی تسبیح کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ ۱۹-اکتوبر ۱۹۵۶ء کو فرانس کی شہہ پر اسرائیل نے مصر کے خلاف حملہ کر دیا اور ادھر برطانوی اور فرانسیسی حکومتوں نے اسرائیل اور مصر کو جنگ بند کرنے کا الٹی میٹم دے کر مصر کے خلاف حملہ کر دیا۔ لیکن متحدہ اقوام کی مداخلت نیز معاہدۂ بغداد کے مسلم ارکان کے سخت طرزِ عمل کے باعث جنگ بند ہوئی اور برطانیہ و فرانس کو نہر سویز کے علاقہ اور اسرائیل کو "غازہ" کا علاقہ چھوڑنا پڑا۔

اس طرح تیس سال کے عرصہ میں فلسطین میں یہودی اپنی آبادی کو ایک لاکھ سے چودہ لاکھ تک بڑھانے اور مقامی عرب (دس لاکھ) آبادی کے منجملہ نو لاکھ کو ملک بدر کرنے میں بظاہر کامیاب ہو گئے لیکن کیا یہ اسرائیلی مملکت جو بین الاقوامی مواعید کی خلاف ورزی اور ظلم و زیادتی پر مبنی ہے باقی رہ سکے گی؟

# اسرائیل کا قیام مشکوک اور غیر یقینی ہے

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ گذشتہ دس سال میں دو مرتبہ اسرائیلی حکومت' عربوں کے ہاتھوں شکست سے محفوظ رہی ہے لیکن اس کی وجہ وہ نہیں ہے جو Middle East Crises, کے مصنف کے حسب ذیل خیال میں جھلکتی ہے:

''ایک معمہ یہ ہے کہ یہودی جن کے متعلق توقع تھی کہ وہ معاشی تنظیم میں نام پیدا کریں گے اور مشکوک سپاہی ثابت ہونگے وہ واقعہ کے طور پر اوّل درجہ کے سپاہی اور دوسرے درجہ کے کاروباری آدمی ثابت ہوئے''۔ (صفحہ ۵۵ Middle East Crises)

یہ نتیجہ ان کے اعلیٰ تر ہتھیار اور اس قیمتی حربی معلومات' مواقع جنگ اور اوقاتِ جنگ کے صحیح علم پر مبنی ہے جو انہیں مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے سیاسی اور ڈپلومیٹک حلقوں میں شریک ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے جس کی بناء پر وہ مناسب اور موزوں وقت پر ان اعلیٰ تر ہتھیاروں کی مدد سے حملہ کرتے ہیں جو ان کے سوا' کسی مشرقی ملک کو مہیا نہیں ہے۔ ان کی معاشی ناقابلیت بھی حقیقی نہیں' بلکہ اسی کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ یورپ اور امریکہ کی سرکاری اور غیر سرکاری امدادوں کو بے دریغ فوجی تیاریوں کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اس سے انہیں ایک اور فائدہ پہنچتا ہے کہ وہ اپنی معاشی مشکلات کا حوالہ دے کر اپنے دولت مند بھائیوں اور خیر خواہوں سے بے انتہا دولت بٹور سکتے ہیں۔ گذشتہ دس سال میں جس آسانی سے اور جس کثیر مقدار میں اسرائیل کے اس چھوٹے سے ملک اور یہودیوں کی چند لاکھ کی آبادی کو بیرونی مالی امداد ملی ہے اُس کا عشر عشیر بھی ہمسایہ عرب ممالک کو نہ مل سکا لیکن اس سارے جتن کے باوجود پھر بھی یہ سوال باقی ہے کہ کیا یہ غیر فطری اور بیرونی مملکتِ مشرق وسطیٰ میں باقی رہ سکے گی؟ ہم اس کا جواب خود دینے کے بجائے غیر مسلموں اور اسرائیل کے دوستوں

کی زبانی دیں گے۔

(۱) فرناواپنی کتاب Muslims on the March کے صفحہ ۲۹۱ پر لکھتا ہے:

''اسرائیل ایک چھوٹی سے مملکت ہے جس کی آبادی تقریباً پندرہ لاکھ ہے' عربوں اور مسلمانوں کے سمندر میں وہ ایک جزیرہ ہے مآل کار اسرائیل کا وجود اس کی اس صلاحیت پر مبنی ہے کہ وہ مشرق قریب کی مملکتوں کے نظام میں کس طرح اپنے آپ کو بٹھاتی ہے اور غیر معین طور پر مخالف ہمسایوں کی دنیا میں ایک جزیرہ کی طرح برقرار نہیں رہ سکتی''۔

(۲) Middle East Crisis. کے مصنفین لکھتے ہیں:

''اسرائیل نے تمام عربوں کو ایک مرتبہ اور مصریوں کو دو مرتبہ شکست دی ہے۔شاید وہ ایک اور مرتبہ بھی ایسا کر سکے۔لیکن کوئی مملکت باقی نہیں رہ سکتی اگر اس کے ہر پانچویں یا چھٹے سال اپنے سے زیادہ تعداد سے لڑنا پڑے' نتیجہ میں چار کروڑ بارہ لاکھ اسرائیلیوں پر غالب آ جائیں گے بشرطیکہ وہ پختہ عزم کر لیں' متحد ہو جائیں اور کسی قدر کم ناکارکردہوں''۔(صفحہ ۱۲۱۔ Middle East Crisis)

(۳) اڈورڈ عطیہ اپنی کتاب The Arabs کے صفحہ ۲۳۸ پر لکھتا ہے:

''وہ (عرب) خود اسرائیلیوں کی طرح جانتے ہیں کہ اسرائیل خوش حال اور زندہ نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کی رسائی عرب بازار تک نہ ہو۔اس رسائی کے بغیر وہ امریکی صیہونیوں پر علیٰ حالہ ایک بار ہو گی جو ابھی تک اس ملک اسرائیل کو زندہ رکھنے کیلئے امداد پر امداد دے رہے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ امریکی صیہونی کب تک اپنی امداد کے ذریعہ اسرائیل کو باقی رکھنے کا عزم رکھیں گے' ان کو توقع ہے کہ اگر وہ اپنے

بازاروں کو اسرائیل کے لئے بند کر دیں تو اسرائیل کو پست معیار زندگی پر مجبور کریں گے اور ترکِ وطن کی رفتار اُلٹی ہو جائے گی۔ یعنی یہودی ملک میں داخل ہونے کے بجائے ملک سے باہر چلے جائیں گے۔ جیسا کہ فی الواقع جرمنی میں نازیوں کے برسراقتدار آنے سے فوراً پہلے کے برسوں میں پیش آیا تھا۔ ان کو یاد ہے کہ بیت المقدس کی لاطینی حکومت ایک سو سال تک باقی رہنے کے بعد بھی ختم ہوگئی عربوں کے نزدیک اسرائیل بھی ایک اسی قسم کی مصنوعی وجود ہے۔ ایک ایسا ٹھونسا ہوا پودا ہے جس کا عرب دنیا میں کوئی مقام نہیں وہ ایک ایسا پتھر ہے جو عرب پہاڑ کی ڈھلانوں پر کشش ثقل کی قوت کے برخلاف آگے دھکیلا گیا ہے۔ صرف مشرق وسطیٰ کے عربوں کی تعداد پانچ کروڑ ہے اور اسرائیل پندرہ لاکھ اس کو اگر علیحدہ اور اس علاقہ کی مقامی جماعتوں سے باہر رکھا جائے تو وہ بالآخر عرب ممالک کی بڑھتی ہوئی دولت، قوت اور استحکام کے مقابلے میں دیرپا ثابت نہ ہوگی۔ وہ درآمد شدہ تنہ جس کی جڑیں نیویارک میں ہیں سُوکھ جائے گا، جو پتھر کشش ثقل کی قوتوں کی مزاحمت کر رہا ہے وہ زور سے وادی کی گہرائیوں میں گر پڑے گا''۔

## اسرائیلی مملکت کا قیام

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسرائیل کا قیام مغربی (عیسائی) اقوام کی ان دہری کوششوں کا حصہ ہے جن میں سے ایک کا منشا یہودی سرمائے کی منظم و موثر طاقت سے پیچھا چھڑانا اور دوسری کا منشاء حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ یہودیوں کی ظالمانہ اور شرمناک سلوک کا بدلہ لینے کیلئے ان کو مسلمان کے غیظ وغضب اور انتقام کے حوالے کرنا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت فراہم کرنا مشکل ہے، اس کے برخلاف ایک دوسرے گروہ کا یہ خیال ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اوّل کے غیر معمولی اور بحرانی حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مغرب کو فلسطین میں اولاً یہودی وطن اور بعدازاں قومی مملکت کے قیام پر راضی

کر کے یہودیوں نے عیسائیوں سے ان کے صدیوں کے مظالم کا بدلہ لے لیا ہے کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ اس طرح وہ ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کو عیسائیوں کے خلاف صف آراء کر دیں گے۔ اور اس طرح صلیب و ہلال کی تاریخی آویزش کو تازہ کر کے وہ عیسائیوں سے بدلہ بھی لیں گے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں غسانیوں کے طرزِ عمل کو یاد کرتے ہوئے یہ رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے کہ عیسائی دنیا تاریخ کے ایک نئے موڑ پر اپنے دوست نما دشمن کے چکمے میں آ کر پھر مسلمانوں سے اپنے تعلقات کو بگاڑنے پر مائل کر دی گئی ہے۔ بہر حال چاہے یہ خیال بھی غلط بھی کیوں نہ ہو اس سے انکار تو قطعاً ممکن نہیں کہ اسرائیل کا قیام بین الاقوامی سازشوں اور استعمار کی پیداوار ہے۔ اس لئے استعمار کے زوال کے ساتھ اس کی موت بھی یقینی ہے فلسطین میں اسرائیلی مملکت کے قائم نہ رہ سکنے کا دوسرا بڑا قرینہ متبدلہ بین الاقوامی صورتِ حال ہے۔ بیسویں صدی میں جو بین الاقوامی خلفشار پیدا ہوا اور جس کے نتیجہ میں دو بڑی عالمگیر جنگیں ہوئیں۔ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر یہودیوں نے فلسطین پر قبضہ کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس میں انہیں دو عوامل سے بڑی مدد ملی۔ پہلا عامل مغربی استعمار تھا لیکن اب وہ عامل باقی نہیں رہا ہے۔ مغرب' اب بڑی حد تک استعمار سے دست بردار ہو چکا ہے اور مشرق اور مسلمانوں سے تعاون کی نئی بنیادیں تلاش کر رہا ہے۔ اس لئے وہ دیر یا سویر اس ناانصافی کو برقرار رکھنے میں دلچسپی باقی نہیں رکھ سکتا۔ جو اس کیلئے نقشے اور ارادوں میں ایک بڑی رکاوٹ ہے اور جس کی وجہ سے ایک طرف مشرق وسطیٰ اور مشرقی ممالک میں اس کے جائز مفادات خطرے میں پڑ گئے ہیں' تو دوسری طرف اس کے نظریاتی دشمن کو مخالف پروپیگنڈا کرنے اور مشرق وسطیٰ کے اہم خطہ میں داخل ہونے کا موقع مل رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ نے صیہونی مملکت کے قیام کی مخالفت کی' ایمانداری کی بات یہ ہے کہ آخری مراحل میں برطانیہ کا ایجابی طور پر یہودی سلطنت کے قیام میں کوئی حصہ نہیں ہے اگرچہ

منفی طور پر وہ ذمہ دار ہے کہ اعلان بالفور کے مصنف اور انتدابی حکومت کی حیثیت سے اس نے یہودی سلطنت کے قیام کی ناانصافی کو روکنے میں اپنا فرض تندہی سے انجام نہیں دیا' قانون اور انصاف کے اس مسلمہ اصول سے کیسے انکار ممکن ہے کہ فعل (Commission) کی طرح ترکِ فعل (Ommission) بھی مساوی جرم ہے دوسرا بڑا عامل' نازی دور میں یہودیوں پر جرمنی میں مظالم کا سلسلہ ہے جس سے متاثر ہو کر فلسطین میں یہودیوں کے توطن کی ہمت افزائی کی گئی۔ حالانکہ یہودیوں کے عزائم ظاہر ہو چکے تھے کہ وہ خانماں برباد یہودیوں کیلئے صرف ٹھکانا نہیں چاہتے بلکہ اصل عرب آبادی کے جائز اور قدرتی حق کو غصب کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال یہودیوں کے ہمدردوں کی تائید میں اگر انتہائی فیاضانہ نقطۂ نظر اختیار کیا جائے تو ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نازی دور کی بے رحمانہ سفاکی کے علاج کی ایک نہایت ہی بھونڈی اور غیر دانش مندانہ سعی تھی جو پچھلے قرن کی ان غیر معمولی حالات میں سوچی گئی۔ جب کہ استعماری ذہنیت' قوتِ فیصلہ کو مفلوج بنائے ہوئے تھی کیونکہ دوسری جنگِ عظیم کے نتیجہ میں متعدد ممالک اور دنیا کے اہم حصوں میں جو بڑے اور اہم وپیچیدہ مسائل اور سوالات پیدا ہو گئے تھے' ان کے دباؤ اور ان کے کسی قابل عمل حل کی تلاش کی مشکلات میں فلسطین کے مسئلہ میں (بغیر اس کے نتائج اور عواقب پر غور کئے ہوئے) جلد بازانہ فیصلہ کر دیا گیا جس کا سب سے بڑا اور قطعی ثبوت یہ ہے کہ یہودی سلطنت کے تسلیم کرنے میں امریکہ اور روس نے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ دونوں کسی بڑے مسئلہ پر پچھلے دس سال میں کبھی متفق نہیں ہو سکے' بالشویک روس کی تائید قابل فہم ہے کیونکہ مسلمانوں اور اسلام سے متعلق اس کا نظریہ اور عمل واضح ہے لیکن امریکہ کی تائید اس کی پوری قومی تاریخ کے مخالف ہونے کے باعث قابل فہم نہیں۔ کیا یہودی سرمایہ کا امریکہ میں اثر یا یہودی رائے دہندوں کا امریکہ کی سیاسی جماعتوں کے انتخاب میں اہم عنصر ہونا امریکہ کو ان شاندار اصولوں سے

روگرداں کرسکتا ہے جو بیسویں صدی کی تاریخ انسانیت کا روشن باب ہے۔

امریکہ نہ صرف اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اپنی بے مثال سیاسی و معاشی برتری کے باوجود استعمار کا مریض نہیں رہا بلکہ اس حیثیت سے بھی مشہور ہے کہ بیسویں صدی میں دو مرتبہ اس نے ظلم و تعدی کے خلاف اپنی قوت' دولت اور اثر کو استعمال کر کے نوع انسانی کو تباہی سے بچایا ہے اس طرح اب بھی وہ دنیا میں امن اور خوش حالی کو برقرار رکھنے کیلئے اپنی عظیم طاقت اور عظیم تر سرمایہ کو بے دریغ خرچ کر رہا ہے۔ کیا وہ صرف چند لاکھ یہودیوں کی رضا مندی یا ان کی انتخابی رائے کی خاطر اپنے اس شاندار ریکارڈ کو برباد کر دے گا؟ کیا وہ اپنے پچھلے قابل تعریف رویہ کو یہودی سلطنت کی ناانصافی سے داغدار بنانے کو گوارا کرے گا۔ نیز مسلمانان عالم کی سچی دوستی کو قربان کر دے گا۔ اور کیا اس فیصلہ کے وقت وہ اس امر کو بھی نظر انداز کر دے گا کہ اس کے بہترین اور قابل اعتماد حلیف (پاکستان' ایران' عراق اور ترکی) بھی اسرائیل کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں' جن سے بہتر حلیف شاید مغرب میں بھی اس کو نہ مل سکیں گے۔

امریکہ کی تاریخی روایات' اس کی جمہوریت پرستی اور عاقبت بینی کی بنیاد پر کیا یہ توقع بے جا سمجھی جاسکتی ہے کہ بالآخر انصاف پسندی اور ضمیر کی آواز یہود نوازی پر غالب آئے گی۔ اور ظلم و ناانصافی کی پیداوار (اسرائیل) سے امریکہ اپنا ہاتھ دھولے گا؟ ان سوالات کا قطعی اور یقینی جواب تو مستقبل ہی دے گا لیکن کسی حد تک کتاب The Britanica Book of the year 1956 صفحہ ۲۴۹ کے حسب ذیل اقتباس سے' اس جواب کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

''ممالک متحدہ امریکہ سے تعلقات (اسرائیل کے) کسی حد تک سرد ہو گئے ہیں جو عرب مملکتوں سے اس کے بڑھتے ہوئے تعلقات کا نتیجہ ہے''۔

یہ ایک عُریاں حقیقت ہے کہ یہودی سلطنت کا وجود مشرق اور عالم اسلامی

میں کمیونزم کی سب سے بڑی فتح اور جمہوریت کی سب سے بڑی شکست پر منتج ہوگا' اور مستقبل میں ایک نئی دنیا کی تشکیل کے اس عظیم الشان تصور کو برباد کر دے گا جو سب کو عزیز ہے۔ اس نیک کام میں ایک عالمی قوت کی حیثیت سے مسلمان سب سے بڑے مددگار اور ساتھی ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ انسانیت کو غیر منقسم سمجھتے ہیں اور مساوات و جمہوریت کے ان سچے اور قیمتی اقدار کے حامی ہیں جو الہامی مذاہب (اسلام اور عیسائیت) کے سرچشمے سے سیراب ہیں۔ لیکن کیا یہودی مملکت باہمی تعاون کی اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ نہیں؟

ہمیں یقین ہے کہ موجودہ عہد کے سب سے بڑے مغربی مورخ اور دُور بین مفکر (ٹائن بی) کی وہ آواز صدا بہ صحرانہ ثابت ہوگی جو ٹوکیو (دارالخلافہ جاپان) میں بیرونی نامہ نگاروں کے کلب میں بلند ہوئی تھی:

> "اسرائیلی مملکت عربوں کے ساتھ ناانصافی پر قائم کی گئی ہے۔ جنگ زدہ یورپ کے پناہ گزینوں کو عرب دنیا میں ٹھونسا گیا۔ اور بعض عربوں کو اپنا گھربار چھوڑنے نیز کہیں اور پناہ تلاش کرنے پر مجبور کیا گیا۔ انہوں (ٹائن بی) نے یہ بھی کہا کہ مشرق وسطیٰ کی چپقلش کی جڑیں بہت گہری ہیں' ان کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے جب کہ مغربی طاقتوں نے عرب ممالک پر طاقت کے ذریعہ قبضہ کیا۔ عرب بڑی اور سخت ناانصافیوں کا شکار ہوئے ہیں' وہ ایسے جانباز لوگ ہیں جو ان ناانصافیوں کو دُور کرنے کیلئے کسی قسم کی مدد تلاش کر سکتے ہیں"۔
>
> (ڈان مورخہ ۲۷-نومبر ۱۹۵۶ء)

آج کی مشرق وسطیٰ کی صورتِ حال' اس پیشگوئی کا آغاز ہے نہ کہ انجام۔

# حوالہ جات


1. This age of conflict. Page-549.
2. Civilization on Lril. Page 221.
3. The Great Religions of the Modern World.
4. An Historian Approach to Religion by Aknald Timbe.
5. ختم نبوت اور قادیانیت مترجمہ میر حسن الدین' ناشر تصدق حسین تاج تاجر کتب' مالک احمدیہ چار مینار حیدر آباد دکن صفحہ ۹۸۔
6. مقدمہ کتاب ''دعوت اسلام'' مصنفہ سر تھامس آرنالڈ مترجمہ عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی۔ مطبوعہ مفید عام آگرہ۔
7. Sikh Religion Vol-2 by mox Artur macauliff. Oxford. The Clarendon Press 1909.
8. The Great Religions of the Modern World. P-282.
9. اخبار جنگ کراچی مورخہ یکم اپریل ۱۹۵۸ء
10. المسلمون ماہ جون ۱۹۵۷ء صفحات ۸۳۵-۸۳۶
11. The British in Asia by guywint
12. The Great Religions of the Modern World, P-210-211.
13. " Life" August 1959, P-56
14. The Civilization on trial, P-156.

.15 Muslims on the March

.16 European powers and South African by Noble V. Jackson (Ph.D) Longman's Grean and Co: London. P-42.

.17 Africa south of the sahara prepared by South African Institute International affairs. Oxford University Press, P-IX

.18 Inside Africa. by gunther.

.19 The Arabs. P-29.

.20 The Great Religions of the Modern World P-324.

.21 The Great Religions of the Modern World P-213.

.22 The Great Religions of the Modern World P-11

.23 Intorduction of Sikhism. by Sir Gokul Chand Narang. New Book Society, Lahore, P-34.

.24 Curren History. June 1957, P-323

.25 The Reconsturction of Religions through, by Sir Muhammad Iqbal. Oxford University Press. 1934.

.26 اخبار ڈان مورخہ ۴۔ جنوری ۱۹۵۸ء

.27 Curren History. June 1957. P-324

.28 The Origin of Muhammad Jurisprádence مقدمہ کتاب

.29 Unity and Variety in Muslim Civilization

.30 This age of confolict P-213.

31. طلوع اسلام کراچی اپریل مئی ۱۹۵۸ء (صفحہ ۵۶)
32. Civilization on trial, P-205.
33. Muslim on the march, P-180
34. The United States and the Middle East. P-322.
35. مقدمہ کتاب 2500 Years of Buddhism مرتبہ جنرل ایڈیٹر پروفیسر پی۔وی باپٹ شائع کردہ ناظم شعبہ مطبوعات وزارت معلومات ونشریات حکومت ہند ۲۴ مئی ۱۹۵۶ء
36. تاریخ ہند جلد اوّل صفحہ ۲۹ اور تمدن ہند صفحہ ۲۶۹
37. تمدن ہند صفحہ ۲۶۰
38. The 2500 years of Buddhism P-28.
39. دیکھئے باب سوم' سوانح حیات اور تعلیمات از سی' وی' جوشی صفحہ ۲۹ The 2500 years of Buddhism.
40. The Great Religions of the Modern World, P-106.
41. The Great Religions of the Modern World. P-90
42. The China Hand Book, P-29.
43. The Great Religions of Modern World, P-7.
44. India China, by Painkkar, P-48.
45. The Great Religions of Modern World, P-91.
46. The 2500 Years of Buddhism, P-471.
47. صفحہ ۵۵۹ جلد دوم Incyclopadia of Religions and Athics.
48. یہ مصنف کا خیال ہے جس کی اسلام کی حد تک کوئی بنیاد نہیں۔
49. Encyclopadia of Religions and Ethics, Vol-12, P-197.
50. The Great Religions of Modern World, P-24.

China Hand Book, P-27.

51. The Great Religions of Modern World, P-40.

52. The Living Religions of the Indian People, P-108 by Mecnicon, Student Christion Movement Press, 1934.

53. Modern Religions Movement in India, Maconiaan and Company Limited, 1924, P-336.

54. Encyclopaida of Religions and Ethics, Vol-II, P-50.

55. صفحہ ۱۵ رنجیت سنگھ مترجمہ مولوی نظیر حسین فاروقی شائع کردہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ ۱۹۲۳ء۔

56. The Religions Movement in India, P-337.

57. Encyclopadia of Religion and Ethics, Vol-II P-507.

58. Encyclopadia of Religions and Ethiscs, P-505.

59. سیر طباطبائی' الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۱۱۵)

60. Okuma, Vol-II PP-62-63, Fifty Yeras of New Japan, P-17

61. The Great Religions of the Modern World P-48.

62. صفحہ ۲۳' ۲۴ جاپان اور اس کا تعلیمی نظم و نسق' مصنف سید راس مسعود صاحب۔

63. The Rise of a Pagan state, P-137.

64. The Great Religions of the Modern World P-161.

65. Encyclopadia of Religions and Ethics, 581.

66. Jawahar Lal's speeches, 1949-1953, Page 116.

67. Islam in Ethopa, P-43

68. The Great Religions of the Modren World P-357.

.69 Inside Africa. P-435

.70 Inside Africa by Gunther.

.71 اصح السیر جلد اول صفحہ ۳۹۲ تالیف مولانا ابوالبرکات داناپوری مطبوعہ ستارۂ ہند کلکتہ ۱۹۳۲ء اور مجموعۃ الوثائق السیاسیہ مصنف ڈاکٹر محمد حمید اللہ مطبوعہ قاہرہ ۱۹۴۹ء۔

.72 رحمۃ للعالمین جلد دوم صفحہ ۳۴۷ مصنف قاضی محمد سلیمان صاحب بار سوم ۱۹۲۲ء مطبوعہ منیجر دفتر رحمۃ اللعالمین لاہور)

.73 دعوتِ اسلام مصنفہ آرنالڈ مترجمہ مولوی عنایت اللہ بی اے۔ دہلوی مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۸۹۸ء۔

.74 الفاروق صفحہ ۱۲۲۔۱۳۳ جلد دوم' عہد نبوی میں نظام حکمرانی ص ۲۸-۸۳۔

.75 سیاسی زندگی مصنفہ ڈاکٹر حمید اللہ ص ۲۸۲۔

.76 کتاب تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام مصنف مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ناشر ندوہ المصنفین ص ۱۴۷۔

.77 کتاب تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام مصنف مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ ناشر ندوہ المصنفین ص ۱۵۱۔

.78 الفاروق حصہ دوم صفحہ ۱۳۷۔

.79 الفاروق حصہ دوم صفحہ ۱۳۷۔

.80 الفاروق حصہ دوم مطبوعہ تاج کمپنی صفحہ ۴۸۔

.81 الفاروق حصہ دوم صفحہ ۴۴

.82 الفاروق حصہ دوم صفحہ ۴۵۔

.83 السیاستہ الاسلامیہ عہد النبوۃ۔ طابع و ناشر دارالفکر العربی صفحہ ۱۱۳۔

.84 سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۴۶۳

.85 اشاعتِ اسلام۔ ناشر مکتبہ برہان ۱۹۵۰ء صفحہ ۲۱۳۔

.86 سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۵۱۱۔ اشاعت اسلام صفحہ ۶۱۲۔

.87 Islam in Ethopia by T. Spencertremingham Geoffery Gumberlege Oxfored University Press 1952. P-46.

.88 The Arabs. P-44

.89 Islam in Ethopia . P-43

.90 Bridge to Islam. P-89-90

.91 The Swond of Islam by A-N. Wallaston C.I.F. Published at London John Murray 1905 P-148.

.92 الفاروق حصہ دوم صفحہ ۱۴۵۔

.93 A survey of Indian History by S. Panikar Reprinted 1957.

.94 The Great Religions of the Modern World P-1.

.95 Encyclopadia of Religion and Ethics, Vol-4 P-12.

.96 China Hand Book. P-26.

.97 The Great Religions of the Modern World P-2.

.98 China Hand Book. P-26.

.99 The Great Religion of the Modern World. P-19.

.100 Okuma Voly P-62-65. Fifty years of New Japan. P-17.

.101 Chines in the South East Asia. P-22.

.102 Chines in the South East Asia. P-22.

.103 The Historion's approach to Religion by Arold Toynbce P-67

.104 The Great Religions of the Modern World P-6.

.105 The Great Religions of Modern World P-11.

.106 The Great Religions of the Modern World. P-20

.107 The Great Religions of the Modern World. P-44.

.108 برطانوی ہند میں ہندو قانون' طبع دوم' مطبوعہ ترقی پبلشی لمیٹڈ۔

.109 (بنرجی صفحہ ۱۶)

.110 صفحہ ۳۴ تصحیح شدہ ایڈیشن (The British in Asia) مطبوعہ ۱۹۵۴ء

.111 کتاب مذکور صفحہ طبع اوّل

.112 The Cultureal heritage of India, Published by Sri Rana Krishna Central Committee. Vol-II, P-423.

.113 The Cultureal heritage of India, Published by Sri Rana Krishna Central Committee. Vol-II, P-423.

.114 The British in Asia, P-20.

.115 The Discovery of India, P-71.

.116 The Discovery of India, P-145.

.117 کتاب ہندوستان و چین India & China ص ۱۴۱ از سردار پانیکر۔ مطبوعہ (Asia Publishing House) اپریل ۱۹۵۷ء۔

.118 The Discovery of India, P-407.

.119 The Discovery of India, P-50.

.120 The Great Religions of the Modern World.

.121 The Great Religions of the Modren World, P-225, 227.

.122 The Great Religions of the Modren World, P-225, 227.

.123 The Great Religions of the Modern World. P-234.

.87 Islam in Ethopia by T. Spencertremingham Geoffery Gumberlege Oxfored University Press 1952. P-46.

.88 The Arabs. P-44

.89 Islam in Ethopia , P-43

.90 Bridge to Islam. P-89-90

.91 The Swond of Islam by A-N. Wallaston C.I.F. Published at London John Murray 1905 P-148.

.92 الفاروق حصہ دوم صفحہ ۱۳۵۔

.93 A survey of Indian History by S. Panikar Reprinted 1957.

.94 The Great Religions of the Modern World P-1.

.95 Encyclopadia of Religion and Ethics, Vol-4 P,-12.

.96 China Hand Book. P-26.

.97 The Great Religions of the Modern World P-2.

.98 China Hand Book. P-26.

.99 The Great Religion of the Modern World. P-19.

.100 Okuma Voly P-62-65. Fifty years of New Japan. P-17.

.101 Chines in the South East Asia. P-22.

.102 Chines in the South East Asia. P-22.

.103 The Historion's approach to Religion by Arold Toynbee P-67

.104 The Great Religions of the Modern World P-6.

.105 The Great Religions of Modern World P-11.

.106 The Great Religions of the Modern World. P-20

.107 The Great Religions of the Modern World. P-44.

.108 برطانوی ہند میں ہندو قانون' طبع دوم' مطبوعہ تری پتھی لمیٹڈ۔

.109 (بنرجی صفحہ ۱۶)

.110 صفحہ ۳۴ تصحیح شدہ ایڈیشن(The British in Asia) مطبوعہ ۱۹۵۴ء

.111 کتاب مذکور صفحہ طبع اوّل

.112 The Cultureal heritage of India, Published by Sri Rana Krishna Central Committee. Vol-II, P-423.

.113 The Cultureal heritage of India, Published by Sri Rana Krishna Central Committee. Vol-II, P-423.

.114 The British in Asia, P-20.

.115 The Discovery of India, P-71.

.116 The Discovery of India, P-145.

.117 کتاب ہندوستان و چین India & China ص ۴۱ از سردار پانیکر۔ مطبوعہ (Asia Publishing House) اپریل ۱۹۵۷ء۔

.118 The Discovery of India, P-407.

.119 The Discovery of India, P-50.

.120 The Great Religions of the Modern World.

.121 The Great Religions of the Modren World, P-225, 227.

.122 The Great Religions of the Modren World, P-225, 227.

.123 The Great Religions of the Modern World. P-234.

# مکی دار الکتب کی یادگار مطبوعات

| کتاب | مصنف | قیمت |
|---|---|---|
| قرآنی شعور انقلاب | مولانا عبید اللہ سندھیؒ | 250 |
| عروج و زوال کا الٰہی نظام | مولانا محمد تقی امینی | 120 |
| اسلام کا سیاسی نظام | مولانا محمد اسحٰق سندیلویؒ | 200 |
| حجۃ اللہ البالغہ اردو | امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ | 380 |
| شاہ ولی اللہ کا فلسفہ عمرانیات و معاشیات | شیخ بشیر احمد بی۔اے | 60 |
| ایشیاء کا عظیم انقلابی لیڈر | مولانا سلمان منصور پوری | 12 |
| پاک و ہند کے علماء حق | ڈاکٹر احمد حسین کمال | 12 |
| خیر کثیر اردو | امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ | 100 |
| خطبات خلافت | پروفیسر محمود الٰہی | 80 |
| سوانح شاہ عبد الرحیم [illegible] ئے پوری | مفتی عبد الخالق آزاد | 300 |
| قرآن شناسی | پروفیسر محمد طاہر مصطفیٰ | 50 |
| اصلاح احوال کا آخری حل | پروفیسر محمد طاہر مصطفیٰ | 110 |
| تفسیر الفرقان فی معارف القرآن | خواجہ عبد الحیٔ فاروقی | 600 |
| تاریخ اندلس | مولانا ریاست علی ندوی | 200 |
| مذاہب عالم | احمد عبد اللہ | 160 |

32۔ میکلیگن روڈ [illegible]
چوک [illegible]
# مکی دار الکتب
Tel.72[illegible]38